رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

اسلامک پبلی کیشنز

رسولِ اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

اسلامک پبلی کیشنز

نام کتاب	:	رسولِ اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی
ترتیب وتدوین	:	ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ
مطبع	:	
اشاعت اول	:	جنوری2026ء
صفحات	:	600
قیمت	:	اے این پریس، لاہور

اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر آمدنی غزالی ایجوکیشن فائونڈیشن میں تعلیم حاصل کرنے والے ضرورت مند طالب علموں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے خرچ کی جاتی ہے۔ یہ کتاب ای بک (E-book) کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔آپ اسے ڈائون لوڈ(Download) کر سکتے ہیں۔ کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس بات کی آپ کو مکمل اجازت ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹس پر موجود ہے۔ اگر ڈائون لوڈ کرنے میں کوئی دقت ہو، توآپ ہمیں ای میل بھیج کر بھی منگوا سکتے ہیں۔

https://taawunotaraqqi.com

www.archive.org www.scribd.com

اِسلامک پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان

فون:2-042-35252501 وٹس ایپ:0321-4942120

موبائل:0322-4673731 ویب سائٹ:www.islamicpublication.pk

ای میل:islamicpak@gmail.com

انتساب

اُن نیک اور پاک طینت اہلِ علم اور قابلِ احترام ہستیوں کے نام، جنھوں نے احادیث کو جمع کرنے، پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تعلیمات کو محفوظ کرنے، ترتیب دینے اور آگے پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ایک مشکل اور پیچیدہ کام کو یقینی بنایا تاکہ یہ تعلیمات صدیوں تک مسلمانوں کے عقیدے و عمل میں رہنمائی کرتی رہیں۔

ان پاک باز شخصیات نے صداقت کے سخت معیارات قائم کیے اور اسلامی تعلیمات کے فروغ میں اپنا حصہ ڈال کر، اسلام کے اصولوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی مضبوط بنیاد رکھی۔ ان کی یہ کاوش آج بھی دنیا بھر کے لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں کو متاثر کرتی ہے، اور ہم جیسے لوگ انھی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے دینِ اسلام کی جو خدمت کی، اس کی کوئی نظیر ملنا مشکل ہے۔

بقول حضرت امیر خسروؒ:

مردِ صاحب نظر از کویِ تو آسان نرود

ہر کہ را جان بود، از خدمتِ جانان نرود

کوئی بھی صاحبِ نظر تیرے کوچے سے آسانی سے نہیں جاسکتا، جس کے پاس جان ہو، وہ محبوب کی خدمت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ترتیب

سپاس و تحسین

رسولِ اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری جیسے نہایت اہم اور علمی موضوع پر مقالہ تحریر کرنا میرے لیے ایک طویل اور علمی سفر کے مترادف تھا، جو دس برس سے زائد عرصے پر محیط رہا۔ اس عرصے کے دوران متعدد اصحابِ علم و فضل، اساتذہ، رفقاء اور اہلِ خیر نے کسی نہ کسی شکل میں میری رہنمائی، معاونت اور حوصلہ افزائی فرمائی، جن کا میں دلی شکر گزار ہوں۔

اس موضوع کی افادیت اور عصری معنویت کے پیشِ نظر میں نے اس تحقیقی مقالے کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ یہ علمی سرمایہ وسیع تر حلقۂ قارئین تک پہنچ سکے۔ آج یہ مقالہ ایک باقاعدہ کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

سب سے پہلے، میں اپنے محترم مربی، ڈاکٹر سعداللہ صاحب کا شکر گزار ہوں، جن کی قیمتی رہنمائی اور بصیرت افروز مشوروں نے اس کتاب کو موجودہ شکل میں ڈھالنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کی مہارت، صبر اور حوصلہ افزائی میرے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہی۔

اس کتاب کو جو ابتدا میں ایک تحقیقی مقالے کی صورت میں مرتب کی گئی تھی، میں نے مختلف ادوار میں متعدد اہلِ علم و دانش تک پہنچایا تاکہ ان کی علمی رائے اور تنقیدی بصیرت سے استفادہ کیا جا سکے۔ ان اصحابِ علم نے نہ صرف میرے کام کو علمی و فکری اعتبار سے سراہا بلکہ اصلاح و بہتری کے لیے نہایت قیمتی مشورے اور تجاویز بھی عنایت فرمائیں۔ ان بزرگوں کی علمی تنقید اور رہنمائی میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔

ان معزز اہلِ علم میں ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل، سید وقاص انجم جعفری، (پروفیسر مولانا) محمد یوسف خان عفی عنہ، حافظ محمد ادریس، مفتی شاہد عبید عفی عنہ، مفتی غلام حسن قادری، ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، پروفیسر ڈاکٹر حماد لکھوی، پروفیسر ڈاکٹر محمد جنید ندوی، پروفیسر واسع اختر (بھارت)، پروفیسر ڈاکٹر فصیح اللہ (کابل)، ڈاکٹر مولانا محمد غیاث، اور جناب فخر الدین فخرؔ (بھارت) شامل ہیں۔

میں نے ان اہلِ علم کی اجازت سے ان کے تبصرے اور آراء کو کتاب کا حصہ بنایا ہے تاکہ قارئین بھی ان کے فکری و تنقیدی نکات سے مستفید ہو سکیں۔ ان تمام بزرگوں اور احبابِ علم کا میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے وقت، علم اور فہم و ادراک سے اس ناچیز کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اس علمی کاوش کو نکھار بخشا۔ ان کی آراء کی روشنی میں کتاب کے مضامین کو بہتر صورت میں پیش کیا جا سکا۔

میں بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان تمام اہلِ علم کو اس علمی تعاون کا بہترین اجر عطا فرمائے اور ان کی خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین۔

اس کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کے لیے میں جناب عبدالمحسن شاہین، عزیزم اویس ضیاء، جناب شعیب حسن، اور محترم خضر چودھری کا بے حد مشکور ہوں، جنھوں نے مواد کی درستی اور علمی گہرائی کو یقینی بنانے میں بھرپور محنت کی۔ ان سب کی لگن اور عزم نے اس منصوبے کو حقیقت میں بدلنے میں مدد دی۔

میرے اہلِ خانہ اور دوستوں کی غیر متزلزل حمایت اور حوصلہ افزائی میرے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ مشکل لمحات میں ان کے یقین اور حوصلہ افزا الفاظ نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا، جس کے لیے میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ یہاں میں دو نہایت قابلِ قدر علمی اداروں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جن کی معاونت سے میں یہ کتاب مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔

پہلا ادارہ موسوعۃ القرآن والحدیث ہے، جس نے ایک انتہائی مفید اور مستند ویب

سائٹ تشکیل دی ہے، جس سے میں نے بھرپور علمی استفادہ کیا۔ موسوعۃ القرآن والحدیث ایک جامع علمی ذخیرہ ہے جو قرآن اور حدیث کے حوالے سے تحقیقی و علمی مواد پر مشتمل ہے۔ یہ موسوعہ اسلامی علوم کے بنیادی اور مقدس متون کو ایک منظم اور جدید انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہے، تاکہ علماء، طلبہ، محققین اور عام قارئین کو قرآن و حدیث کے مستند ترین مواد تک آسان رسائی حاصل ہو۔ اس اہم علمی منصوبے کی نگرانی شیخ ناصر الدین البانی اور مولانا زبیر علی زئی نے کی، جو اپنے دور کے نامور محدثین تھے اور احادیث کی تحقیق، تخریج اور درستی کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام افراد کو بہترین اجر عطا فرمائے جنھوں نے اس عظیم علمی خدمت میں اپنا کردار ادا کیا۔

دوسرا ادارہ ای قرآن لائبریری https://equranlibrary.com ہے، جس کا قیام عثمان پرویز(Usman Pervez)نے عمل میں لایا۔اگرچہ ان کے متعلق زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں، تاہم اس ویب سائٹ سے میں نے بے حد فائدہ اٹھایا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اس مقالے کی تحقیق میں مصنوعی ذہانت (AI) سے بھی مدد لی، بالخصوص ChatGPTاور DeepSeek جیسے پلیٹ فارمز کا استعمال کیا۔ مزید برآں، متعدد دیگر ویب سائٹس سے بھی قرآن و سنت سے متعلق نہایت مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

اس کے علاوہ، میں نے مکتبہ دارالسلام لاہور کے شائع کردہ سیرت انسائیکلوپیڈیا سے بھی نہایت اہم اور مستند معلومات حاصل کیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان علمی اداروں پر اپنا خصوصی فضل و کرم فرمائے اور انھیں مزید ترقی عطا کرے۔ آمین۔

اس کے علاوہ میں نےIslam 360سے بھی استفادہ کیا جو نہایت ہی مفید ایپ ہے۔

آخر میں، میں اپنے معزز قارئین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کی جستجو اور علم کی محبت ہی وہ قوت ہے جو مجھے لکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ کتاب بہت سے افراد کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھی۔ میں ان سب کا دل کی گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں۔ بقول فردوسی؛

به شکرانه یزدان که در هر زمان
بود شکر گزاری سرودِ جهاں

(خدا کا شکر ہے کہ ہر زمانے میں شکر گزاری ہی دنیا کا نغمہ رہی ہے۔)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

لاہور

***

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التحيات لله والصلوات والطيبات السلام عليك أيها النبي
ورحمة الله وبركاته السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين
أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبده ورسوله

(سنن ترمذی، باب النکاح، حدیث نمبر 1105)

تمام زبانی، بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اے نبی: سلامتی ہو آپ پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد، اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی ایک خوب صورت رباعی

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عُذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفٰے پنہاں بگیر

اے اللہ میں تیرا منگتا ہوں، تو دو عالم کو عطا کرنے والا ہے۔

روزِ محشر میرا عذر قبول فرمانا۔

اگر میرے نامہ اعمال کا حساب ناگزیر بھی ہے تو پھر اے میرے مولیٰ اسے میرے آقا محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا۔

تقریظات

عریضہ ودعا

اس مقالے کو لکھتے ہوئے درج ذیل حدیث ہمہ وقت میری نظر کے سامنے رہی (سنن ترمذی، حدیث نمبر ۲۹۵۱)

(مرفوع) حدثنا سفيان بن وكيع، حدثنا سويد بن عمرو الكلبي، حدثنا ابو عوانة، عن عبد الاعلى، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: " اتقوا الحديث عني إلا ما علمتم، فمن كذب علي متعمدا فليتبوا مقعده من النار، ومن قال في القرآن برايه فليتبوا مقعده من النار ". قال ابو عيسى: هذا حديث حسن.

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میری طرف سے کوئی بات اس وقت تک نہ بیان کرو جب تک کہ تم (اچھی طرح) جان نہ لو کیونکہ جس نے جان بوجھ کر جھوٹی بات میری طرف منسوب کی تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے اور جس نے قرآن میں اپنی عقل ورائے سے کچھ کہا وہ بھی اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے“۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نہ صرف مسلمانوں کے لیے، بلکہ پوری بنی نوع انسان کی تاریخ کے لیے بھی گہرے اور اہم معانی رکھتی ہے، جسے مختلف پہلوؤں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ میں نے دانستہ طور پر ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس مقالے میں کوئی ایسی بات یا لفظ استعمال نہ ہو جو آخری نبی، حضرت محمد مصطفی ﷺ سے منسوب نہ ہو۔ اگر نادانستہ طور پر ایسی کوئی بات ہو گئی ہو تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے معاف فرمائے۔

اگر آپ بھی ایسی کوئی بات یا لفظ دیکھیں تو براہِ کرم مطلع فرمائیں، اس پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے ایسے کسی بھی لفظ کے استعمال سے محفوظ رکھے جو آخری نبی، حضرت محمد ﷺ سے منسوب نہ ہو۔ نیز، وہ کریم مجھے آپ ﷺ سے سچی محبت، مکمل اطاعت اور اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

۲۸ مارچ ۲۰۲۵ء

۲۷ رمضان، ۱۴۴۶ ہجری، بروز جمعۃ الوداع

لاہور

***

لَّقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ۔

(سورۃ الاحزاب ۳۳: ۲۱) بے شک تم سب کی رہنمائی کے لیے اللہ کے رسول ﷺ (کی زندگی) میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے حد درجہ حساس، احتیاط طلب اور نازک معاملات میں اللہ کے رسول اور معلم انسانیت حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے اپنی خداداد سیاسی فہم و بصیرت اور نور نبوت سے کس طرح کے دور اندیشانہ اقدامات کیے، اپنی کمال، لاجواب اور کامیاب ترین خارجہ پالیسی اور مثالی سفارت کاری سے کس طرح ایک چھوٹے سے شہر پر مشتمل ریاست ''ریاست مدینہ'' کی حدود کو پھیلا کر دس لاکھ مربع میل تک بڑھادیا۔ کس طرح ارد گرد کے دشمن قبائل کی دشمنی کو دوستی میں بدل دیا۔

راقم کی معلومات اور مطالعے کے مطابق اس سے قبل سیرت طیبہ کے اس منفرد پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور سیرت کی بڑی بڑی کتابوں میں اس پہلو پر سرسری نظر ڈالنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ جبکہ فاضل مصنف برادر مخلص ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ نے ماشاءاللہ اوراق سیرت میں اسی گمشدہ پہلو کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور بڑی ورق گردانی اور خاصی محنت سے سیرت طیبہ کے مستند مآخذ سے نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری پر خاصا مواد جمع کر کے بڑی نایاب معلومات فراہم کی ہیں۔ جزاھم اللہ خیرا۔

فاضل مصنف نے زیر بحث موضوع میں ایک نیا یا اجتہادی نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے کہ سارے سیرت نگار اسلامی ریاست کی بنیاد نبی رحمت ﷺ کی مکہ مکرمہ سے یثرب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کو قرار دیتے ہیں جبکہ فاضل مصنف کے خیال میں حضور اکرم ﷺ کے اعلان نبوت کے ساتھ ہی اسلامی ریاست کی

بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ان کے خیال میں اس ریاست کی جغرافیائی حدود یا علاقہ دار تھا چنانچہ ان کا استدلال دیکھیے:

یہ تمام عوامل ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ مکہ میں گویا دو ریاستیں وجود میں آچکی تھیں: ایک باطل نظریے پر قائم قریشِ مکہ کی قیادت، اور دوسری نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں ایک نیا ابھرتا ہوا نظریہ، جو آخر کار پوری دنیا میں پھیلنے والا تھا۔

کتاب کے آخر میں چھ سات صفحات پر مشتمل نبی اکرم ﷺ کی مذکورہ تفصیلی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا خلاصہ ایک ٹیبل کی شکل میں دیا گیا ہے تاکہ جو آدمی بوجوہ اس ایمان افروز کتاب کا مطالعہ نہ کر سکتا ہو اور وہ اگر صرف اس ٹیبل کو دیکھ کر بھی کافی حد تک نبیٔ رحمت ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری کے خدوخال سمجھ سکتا ہے۔

کتاب کا اسلوبِ تحریر رواں، سادہ، عام فہم، دلکش "جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" کا مصداق اور سب سے بڑھ کر عجز وانکساری اور محبت نبوی کے جذبات سے لبریز ہے۔ پوری کتاب میں جہاں بھی نبی اکرم ﷺ کا اسم گرامی یا اسم ضمیر "آپ" آیا ہے ہر جگہ بڑے اہتمام سے پورا درود شریف لکھا گیا ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ کریم فاضل مصنف کی اس خلوص و محبت بھری علمی کاوش کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول فرمائے۔ مسلمان حکمرانوں کے لیے اسے مشعل راہ اور صاحب کتاب کے لیے توشہ آخرت بنائے۔آمین بجاہ نبیہ الامین ﷺ

ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ

سابق مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد! أَعُوذُ بِاللهِ مِن الشَّيطٰنِ الرَّجِيمِ۔ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳: ۲۱)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ حفظہ اللہ نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ایک کارآمد موضوع کو خوب تفصیل سے اپنی اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔ جس میں نبی ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے بارے میں سیرت طیبہ میں سے اہم پہلو ذکر کیے جو آج بین الاقوامی سطح پر امت مسلمہ کے لیے رہنما اصول ہیں۔

نبی ﷺ نے سب سے پہلی اسلامی ریاست مدینہ کو خارجہ پالیسی اور بہترین سفارت کاری کے ذریعے ایک مضبوط اور مقبول ریاست بنایا۔ یہ سفارت کاری اور خارجہ پالیسی انسانی حقوق کی ادائیگی اور باہمی احترام پر مبنی تھی۔ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے ہمیشہ جنگ سے پہلے امن کی خارجہ پالیسی اور اتحاد کے لیے سفارت کاری ہوتی رہی۔ لیکن ہر غزوہ کے بعد بھی نبی ﷺ نے خارجہ پالیسی اور سفارتی حکمت عملی میں ہمیشہ دوراندیشی کا مظاہرہ فرمایا۔ چاہے وہ صلح حدیبیہ ہو یا میثاق مدینہ خصوصاً فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی حکمت عملی اور خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ہی اسلامی تعلیمات کی اشاعت کا سبب بنا۔ بین الاقوامی وفود کی آمد ان کا استقبال و اکرام اور ان کے ساتھ نبی صلی ﷺ نے بہترین سفارتکاری کا رویہ اختیار فرمایا۔

خاتم النبیین ﷺ کی بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے بہت سے گوشے اس کتاب میں سامنے آئے ہیں۔

اللہ رب العزت اس کتاب کے ذریعے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے ہمیں بھی ان خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے طریقوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللھم وفقنا لما تحب و ترضی و اجعل اخر تنا خیرا من الاولی

پروفیسر مولانا محمد یوسف عفی عنہ
شیخ التفسیر والحدیث و ناظم تعلیمات،
جامعہ اشرفیہ، لاہور

***

دریچۂ دل

محترم ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کی کتاب رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی (سیرت طیبہ کا ایک حسین پہلو، انسانیت کی رہنمائی کے لیے ایک روشن باب) کا مسودہ چند دن پہلے موصول ہوا تھا۔ صحت کی کمزوری اور ادارے کے بے شمار رکے ہوئے کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے بہت کم وقت ملتا ہے کہ کسی اور جانب توجہ کر سکوں۔ دو تین دن مختلف اوقات میں آپ کی کتاب کا مسودہ دیکھا تو دل خوش ہو گیا کہ آپ نے اس اہم موضوع پر بڑی محنت سے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ پھر چلا مسافر کی کئی ضخیم جلدیں لکھنے اور چھاپنے والا قلم کار اب کس وادی میں جا اترا ہے۔ آپ نے خود کتاب کے شروع میں لکھا ہے: ''اس مقالے کو لکھنا ایک طویل سفر کی مانند تھا، جو دس سال سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس سفر میں بے شمار افراد نے میرا ساتھ دیا۔'' واقعتاً یہ میدان بہت محنت اور اس کے ساتھ انتہائی احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ آپ کے اس مسودے کو دیکھتے ہوئے خود مجھے اپنا سفر بار بار یاد آتا رہا جب میں نے رسول رحمت ﷺ کی سیرت پر لکھنا شروع کیا۔ سات جلدوں میں یہ کام کئی سالوں میں مکمل ہوا۔ رسولِ رحمت ﷺ تلواروں کے سائے میں مدنی دور کے حالات پر پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مکی دور جو پہلے لکھنا چاہیے تھا بوجوہ بعد میں لکھا جا سکا وہ رسولِ رحمت ﷺ مکہ کی وادیوں میں کے عنوان سے دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

آپ نے تحقیق و تحریر کو اپنی اس کتاب کے مرتب کرنے میں جس طرح ملحوظ رکھا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ آپ نے تمام واقعات کو قرآن و سنت اور سیرت و تاریخ کے مستند حوالوں سے سینہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ آنحضور ﷺ کی زندگی کا یہ پہلو کہ خارجہ پالیسی اور سفارت کاری میں آپ نے کیا ہدایات دیں، بہت اہم موضوع ہے۔ اس موضوع پر آپ نے اسوہ نبوی کو بہترین انداز میں مرتب کر کے امت اور پوری انسانیت کی رہنمائی فرمائی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ان واقعات کو بہت سلیقے کے ساتھ مرتب کر دیا ہے۔ بیچ میں سیرت کے دیگر پہلو، معاشرتی و معاشی معاملات سے لے کر حربی و جہادی ابواب پر بھی مستند واقعات نے کتاب کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔ یہ کتاب آپ کے لیے ایک اعزاز ہے کہ آپ نے سیرت طیبہ کے ایک پہلو پر قلمی جہاد کا حق ادا کیا ہے۔

کتاب کی پروف ریڈنگ پر پھر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ بعض جگہوں پر تصحیح کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ ''مسافر'' کی یہ کتاب اس کے دیگر سفر ناموں سے زیادہ قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کریم ہم سب کو رسولِ رحمتؐ کے نقشِ پا پر چلنے کی سعادت عطا فرمائے۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ، کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ، صلوا علیہ وآلہٖ

حافظ محمد ادریس

سابق نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان
وسابق ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی، منصورہ لاہور

***

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله واصحابه اجمعين۔

زیرِ نظر کتاب رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی ایک نہایت اہم اور بابرکت موضوع ہے جس پر مصنف داد کے لائق ہیں، مصنف نے سیرت طیبہ کے نسبتاً کم بیان ہونے والے ایک پہلو کو بڑے حسن ترتیب اور فاضلانہ انداز میں پیش کیا ہے اور بہت عمدگی سے یہ واضح کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سفارت کاری محض وقتی تدبیر نہ تھی، بلکہ ایک باضابطہ الٰہی حکمت پر مبنی ایک مسلسل منصوبہ بندی تھی، جس کا مقصد اقوام عالم کے درمیان امن، حق کی دعوت اور عدل وانصاف کا قیام تھا۔

کتاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں خارجہ تعلقات کے اصول، نبی کریم ﷺ کے مختلف سفارتی خطوط اور معاہدات، غیر مسلم قبائل اور بادشاہوں کے ساتھ معاملات، جنگ و صلح کی حکمتیں وغیرہ کو سلیقے سے جمع کیا گیا ہے۔

مصنف کا انداز دلنشین، تحقیقی اور حوالوں سے مزین ہے جو قارئین کو سیرت کے اس پہلو سے متعلق ایک جامع اور مستند تصویر فراہم کرتا ہے۔

خصوصی طور پر قابل تعریف بات یہ ہے کہ مصنف نے موجودہ دور کی بین الاقوامی سفارتی اصولوں کا بھی اجمالی موازنہ کیا ہے اور دکھایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سفارت کاری آج کے ماڈرن سفارتی رویوں سے کئی درجے بلند، اصولی اور باوقار تھی۔

اللہ تعالی مصنف کی اس عظیم خدمت دین کو قبول فرمائے، اس کتاب کو طلبہ واہل علم کے لیے نافع بنائے، اور مصنف کے لیے ذریعہ اجر وسعادت بنائے۔ آمین۔

وصلى الله علىٰ سيدنا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين۔

مفتی شاہد عبید عفی عنہ (دارالافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور)

سیرت النبی ﷺ کا موضوع اُن بنیادی موضوعات میں سے ہے جن میں متاخر زمانوں میں سب سے زیادہ لکھا گیا ہے یا جن میں سب سے زیادہ تحقیقات ہوئی ہیں۔آپ اس کا اندازہ یوں کریں کہ عربی اور انگریزی جیسی عالمی زبانوں کے ماسوا اردو، جس کا درجہ متذکرہ زبانوں کے کہیں بعد آتا ہے، میں سے صرف پچھلے 200 سالوں میں سیرت و متعلقات کی کتابیات کی تعداد 10 ہزار سے زائد ہے اور ان میں 70 فی صد کے لگ بھگ ذخیرہ آخری 50 سالوں کا ہے۔ دنیا کی بقیہ زبانوں میں تخلیق ہونے والا سیرتی ادب اگر شامل کیا جائے تو وللآخرة خير لك من الاولىٰ کے مصداقِ صحیح اور ورفعنا لك ذكرك کے مظہر کامل کی شانیں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ کھل کر جلوہ فرما ہوں۔

ع بول ہے بالا تیرا ذکر ہے اونچا تیرا

رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری سیرت کا وہ گوشہ ہے جس پر بہ نسبت عام سیرت کے خاصا کم لکھا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سیرت کے خصوصی مطالعات میں سے ہے اور اس کے لیے آفاقی ذہن، جہاں دیدہ بصیرت، وسعت نظری کے ساتھ ساتھ دورِ نبوی کے علاوہ ماضی وحال کے سیاسی، عسکری، اقتصادی، سماجی اور مذہبی حالات و واقعات پر گہری نظر ہونا ضروری ہے اور اس میں کماحقہ کامیابی کے لیے قلم کار کا وسیع المطالعہ و وسیع المشاہدہ ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

ہمارے ممدوح ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب نے اپنے موضوع پر جس خلوص نیت اور محبت و عقیدت سے داد تحقیق دی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعے کے دوران ہوتا ہے کہ قاری کا خود کو کتاب کی گرفت سے آزاد کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔

من جملہ دیگر خصوصیات کے یہ امر بھی قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے کہ مؤلف نے اپنے موضوع پر متاخر سیرت نگاروں کی تحقیقات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اوراس میں قاری کے لیے تشفی کا سامان ہوتا ہے کہ اسے حاصل مطالعہ مل جائے جواسے دیگر کتابوں سے بے نیاز کردے۔اللھم زدوبارك علیه۔

میری فعال دینی شخصیات اور متحرک سیاسی ومذہبی تحریکات اور فلاحی تنظیمات کے کارکنان ووابستگان اورداعیان ومبلغین کے لیے تجویز ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ لازمی کریں، کیوں کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس سے تبلیغ دین، سیاست الٰہیہ، فلاح انسانیت، تہذیب معاشرت اور تمدنی حکمت ان سب پہلوؤں پر ہمہ گیر رہنمائی ملے گی اورآج کی جدید دنیا میں تعصبات، فرقہ واریت، نفرت، رجعت پسندی کے ساتھ آزاد خیالی، اباحیت پسندی، مغرب زدگی، لادینیت کے چیلنجز سے نمٹنے کی نبوی حکمت عملی اور مؤثر تدابیر جاننے اور سمجھنے کا موقع ملے گا جن کی بدولت افرادی قوت اور سادہ لوح مسلمانوں کی سچی عقیدتوں کا درست سمت میں سفر شروع ہوگا جس سے امت اور انسانیت کے لیےان گنت مفید خدمات متوقع ہیں۔بتوفیق اللہ تعالیٰ!

مفتی غلام حسن قادری

***

ڈاکٹر محمد مشتاق مانگٹ صاحب نے دس سال تک مسلسل جستجو اور تحقیق کے بعد اس موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔آپ پیشے کے لحاظ سے انجینئر اور کاروباری ہیں۔اور پاکستان کی سب سے بڑی این جی او ''الخدمت'' کے نائب صدر بھی ہیں اور سیروافی الارض کے حکم کے تحت آدھی دنیا دیکھ چکے ہیں۔اچھے قلمکار ہیں اور ان کے درجن بھر سفر نامے منظر عام پر آچکے ہیں۔یہ ان کے حسن ذوق اور محبت کا حاصل ہے۔ان کے عشق کی سمت اور ہے وہ یہ کہ گذشتہ ایک دہائی سے وہ سیرت پاک ﷺ کے ایسے پہلوپر تحقیق کررہے تھے۔اس لحاظ سے موضوع میں قدرے جدت ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اوروں سے ہٹ کر جدید ذرائع ابلاغ استفادہ کرتے موضوع سے انصاف کے تقاضے پورے کیے ہیں۔یہ مقالہ مصنف مرستند کے خیالات اور تاثرات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ دیدہ ریزی سے تحقیق کے نتیجے میں مستند ذرائع کے تاحاصل کاایک جامع مرقع ہے۔

ڈاکٹر مانگٹ نے اسے بڑی سوچ بچار اور غور و فکر سے ترتیب دیا ہے۔موضوع سے انصاف کے تقاضے پورا کرنے کو بحث کا آغاز قبل اسلام عرب کے تمدن، معیشت اور سیاسی حالات کے جائزے، بعثت نبوی ﷺ سے قبل عرب کی حکومتی ساخت، ساسانی عہدِ ایران کے سیاسی و سماجی تجزیے، قدیم عرب کے قبائل اور قبائلی نظام کے تعارف سے کیا۔مصنف کو نفسیات سے گہری دلچسپی رہی ہے اس لیے یہاں بھی انھوں نے عرب معاشرہ اور اس کی نفسیاتی ساخت کے عنوان سے معاشرے کا تجزیہ کیا ہے(یہ ایک منفرد انداز ہے)۔اس کے بعد ریاست مدینہ کے قیام اور گردو پیش کے قبائل سے معاہدات کاذکر کیا ہے۔

اس مقالے میں محض عہد پیغمبر کی سفارت کاری کو زیر بحث نہیں لایا گیا بلکہ

عصر حاضر کی رائج الوقت سفارت کاری کے اصول و ضوابط کا ذکر کیا ہے اور حوالہ جات اور دلائل سے وضاحت کی ہے کہ کس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال قبل کے تمام اصول جنھیں آج عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے انھیں متعارف کرایا اور انھی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر کامیاب سفارت کاری کے ذریعے محض دس سال کے مختصر عرصے میں، ایک ایسی قوم کو، جس کی کوئی سیاسی یا معاشی شناخت نہ تھی، دنیا کے بہترین حکمرانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہی حصہ مقالے کا قلب ہے اور یہی مقصود و مطلوب کہ ان اصولوں کو آج بھی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے لیے زادِ راہ بنایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر مانگٹ صاحب کے مقالے کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کی تکمیل کے پس منظر میں اس حوالے کی جستجو، تحقیق اور مطالعے میں دس سالہ کا صبر آزما عرصہ شامل ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے روائتی انداز سے ہٹ کر جدید ذرائع ابلاغ سے کام لیے۔ مستند ویب سائٹس، قرآن صریری کی ویب سائٹ، آج کے دور کی مصنوعی ذہانت کے دو اہم مآخذات chat GPT اور Deep Seek اور دارالاسلام کے سیرت انسائیکلوپیڈیا سے استفادہ کیا ہے اور محنت شاقہ سے اخذ معلومات کی بنا پر یہ کہا ہے کہ یہ مقالہ محض خیالات اور تاثرات کا مجموعہ نہیں بلکہ انتہائی مستند اور معتبر ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کا ایک جامع مرقع ہے اور بلاشبہ ہے۔

زیر نظر مقالہ پونے دو سو عنوانات کے تحت موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اور آخر میں زمانی ترتیب اور اختصار کے ساتھ عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال، خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اقدامات اور اس کے نتائج دیے گئے ہیں۔ مقالہ جہاں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عام قاری کے لیے بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے وہاں اپنے کسی بھی ملک خصوصاً پاکستان کے خارجہ امور سے متعلق افسران کے تربیتی نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی

نبی کریم ﷺ پیغمبر انسانیت، قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ آخری منشور انسانیت، اور اسلام پوری انسانیت کے لیے امن و سلامتی، عدل و انصاف، رحمدلی و خدا ترسی، ترقی و خوشحالی، اور معاشرتی مساوات کے آفاقی اصولوں پر مشتمل آخری پیغام الٰہی ہے۔ جو شرق و غرب اور عرب و عجم کو اندھیروں سے اجالوں کی طرف لا سکتا ہے۔ اسلام فرد سے اجتماعیت، گھر سے پارلیمنٹ اور بازار سے اقتدار تک کا دین ہے۔ اسی طرح مسلمان قوم نہیں امت ہیں، امت ہی نہیں امت واحدہ۔ امت وسط اور خیر امت ہیں جو فریضہ شہادت حق ادا کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرنے والی امت ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں آج کا جدید دور ریاستوں، ریاستی اداروں، عالمی اداروں، گلوبلائزیشن اور دنیا کی طنابوں کو ڈھیلا کرنے اور فاصلوں کو قربتوں میں بدلنے والا دور ہے۔ اسی طرح دنیا، عالمی جنگوں، اسلحے کی بھیانک اور خطرناک دوڑ کے نتائج دیکھنے اور بائیولوجیکل اور ایٹمی ہتھیاروں سے چھڑنے والی جنگ کی تباہی کی شدت وحدت اور ہلاکت خیزی کو جاننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اگر دنیا کو ہلاکت خیزیوں اور تباہ کاریوں سے کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ ڈائیلاگ، مذاکرات، سفارت کاری اور ڈپلومیسی ہے۔ اور یہ پیغام دنیا کو سیرت مصطفی ﷺ سے ہی مل سکتا ہے۔ یہی بات ہمارے نوجوان عزیز اور معروف دانشور اور اسکالر ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ نے محسوس کی اور دور حاضر کے اس عظیم تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی گراں قدر تصنیف منظر عام پر لائے ہیں۔

محترم ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ نے اپنی بہترین اور قابل قدر تصنیف کے ذریعے اسلامی سیاست کے اسی پہلو کو ہی آگے بڑھایا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی، سفارت کاری، حکمت و تدبر اور عملی کامیابی کا خلاصہ اس چارٹر میں سمو دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ۔

1- امن کو جنگ پر ترجیح دی ہے۔

2- مہمان نوازی اور حسن سلوک کا رویہ اختیار فرمایا ہے۔

3- معاہدوں کی پاسداری کی ہے۔

4- سچائی اور دیانتداری کا شعار اپنایا ہے۔

5- انصاف کی بالادستی فرمائی ہے۔

6- ہمیشہ آزادی کا اصول برقرار رکھا ہے۔

7- اتحاد اور وقارِ انسانیت کے اصول کو مدنظر رکھا ہے۔

8- جنگ سے حتی الامکان بچاؤ کے طریقے اپنائے ہیں۔

9- رحم دلی اور معافی آپ ﷺ کا شعار رہا ہے۔

10- صبر یا انتقام میں سے آپ نے ہمیشہ صبر کا پہلو ترجیح میں رکھا ہے۔

11- جنگ میں بھی ایک وقار پیش نظر رہا ہے۔

12- آپؐ کے معاہدات علاقائی سلامتی کی ضمانت تھے۔

13- آپؐ نے وسیع تناظر میں معاہدے فرمائے۔

14- کسی بڑے مقصد کی خاطر کچھ چیزوں کو نظر انداز کر دیا۔

15- دشمنی کے باوجود تجارت کا سلسلہ بھی برقرار رکھا۔

محترم ڈاکٹر مشتاق احمد مانگٹ کی کتاب دورِ حاضرہ میں ملکی و بین الاقوامی حالات کے تناظر میں یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ کریم انھیں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے اور اسے قبول فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہِ الکریم۔ اما بعد!

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ کی کتاب رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی پڑھنے کا موقع میسر آیا۔ اس کتاب میں خارجہ پالیسی کا مروجہ تصور مراد نہیں لیا گیا بلکہ اس کے دائرے کو وسیع کیا گیا ہے۔ اس میں مکی دور میں اہل اسلام اور اہل کفر کے مابین تعلقات کو بھی نبھایا گیا ہے اور ہجرت حبشہ، سفر طائف، بیعت عقبہ وغیرہ کے واقعات کو بھی نبوی خارجہ پالیسی کے تناظر میں سمجھایا گیا ہے۔ اسی طرح مدنی دور کے تمام کلیدی مراحل سے خارجہ پالیسی کے اصول و قواعد اخذ کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق مانگٹ نے ذکر کیا کہ ریاست نبوی مدینہ سے پہلے مکی دور ہی میں نظریاتی شکل میں قائم ہو گئی تھی۔ جس میں صرف ''آزاد خطّے'' کی کمی تھی، باقی ریاستی عناصر کسی نہ کسی سطح پر موجود تھے۔ یہ فہم اگرچہ مروجّہ اصطلاحات سے بعید ہے، لیکن نبوی کارنامہ مذہبی و تہذیبی، سماجی و سیاسی اور عالمی سطح پر انتہائی مختصر مدت میں اتنا کامل، وسیع اور دقیق ہے کہ اِسے مروجّہ علوم و فنون اور اصطلاحات میں نہیں ماپا جا سکتا۔ فداہ ابی و امی! ایک نبی کا کام انقلاب، سیاست اور حکومت سے کہیں بڑھ کر عظیم الشان، گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔

ہماری رائے کے مطابق کتاب میں مصنّف کا فہم و استدلال اور نتائج قوی ہیں۔ البتہ بعض اہل علم کے نزدیک نبوی کارنامے، اسلامی تصورات اور اسلامی تاریخ کے مہتم بالشان واقعات کو جدید دور کی مغربی اصطلاحات سے تعبیر کرنا محل نظر ہے۔ جیسے میثاق مدینہ کو معاہدہ عمرانی (Social Contract)، نبوی دور میں جزیرۃ العرب میں ہونے والی دینی تبدیلی کو انقلاب (Revolution) اور حجۃ الوداع کے خطبے کو انسانی حقوق (Human Rights) کے چارٹر کے مشابہ قرار دینا درست نہیں۔ اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ پڑھ لینا چاہیے۔

آخر میں مصنف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جنھوں نے نہایت عرق ریزی سے ایک اہم موضوع پر مبسوط کتاب تالیف کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ (آمین)

پروفیسر ڈاکٹر حماد لکھوی
پنجاب یونیورسٹی لاہور

***

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین!

عصر حاضر میں جب بین الاقوامی تعلقات، عالمی سیاست اور سفارت کاری جیسے موضوعات پر ہر طرف سے بحث و تمحیص جاری ہے، ایسے میں سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں اِن پہلوؤں کا عالمانہ جائزہ لینا وقت کی اہم ترین علمی و فکری ضرورت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ جیسے کہنہ مشق محقق و فاضل نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خارجہ پالیسی کے موضوع پر قلم اُٹھا کر ایک گراں قدر علمی خدمت انجام دی ہے۔

یہ کتاب محض تاریخی واقعات کا تذکرہ نہیں بلکہ سیرتِ نبوی کے اُن پہلوؤں کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ ہے جو جدید بین الاقوامی تعلقات، سفارت کاری، معاہدات، جنگ و امن، اور بین الاقوامی روابط کے اصولوں کے ساتھ تقابلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے مصادر و مراجع سے استناد کرتے ہوئے نہایت متوازن، مدلل اور تحقیقی اسلوب اختیار کیا ہے جو اُن کے وسیع مطالعے، عمیق فہم اور فکری پختگی کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد مانگٹ کی یہ کاوش نہ صرف طلبہ واساتذہ بلکہ محققین، اہلِ دانش اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین کے لیے بھی مَشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے نہایت بالغ نظری، اعلیٰ حکمت عملی اور عالمی امن کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو خارجہ پالیسی اِختیار کی، وہ آج بھی دنیا کے لیے نمونہ ہے۔

میں اس علمی و تحقیقی خدمت پر مصنف کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اس کتاب کو امت مسلمہ کے لیے نافع بنائے اور ڈاکٹر مانگٹ صاحب کے علم و عمل میں مزید برکت عطا فرمائے۔ آمین !

پروفیسر ڈاکٹر محمد جنید ندوی
پی ایچ ڈی، یُونیورسٹی آف ویلز، یُوکے۔
فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ سوشل سائنسز،
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

***

ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ نے جن کی دیدہ وری اور تاریخ شناسی جگ ظاہر ہے، سیرت کی بین الاقوامی سیاست، سفارت کاری اور خارجہ تعلقات جیسے اہم مگر نسبتاً کم توجہ یافتہ موضوع پر رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی کے عنوان سے زیرِ نظر کتاب کو تصنیف کیا۔

ڈاکٹر مانگٹ نے اس کتاب میں نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی کو محض تاریخی واقعات کے طور پر پیش کرنے کے بجائے ایک منظم، فکری اور اصولی تجزیے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ڈاکٹر مانگٹ کا اسلوب تحقیقی و تجزیاتی ہے، اور وہ ہر واقعے کے پس منظر، اس کے اسباب اور نتائج پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہیں۔ مصنف نے سیرت کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے، جس میں ہر مرحلے کی سفارتی حکمتِ عملی کو الگ شناخت دی گئی ہے۔ مکی دور میں دعوتی اور غیر تصادمی حکمتِ عملی، ہجرتِ حبشہ کو ابتدائی بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں، اور مدنی دور میں معاہدات، سفارت کاروں کا انتخاب، خطوط کی روانگی، اور بیرونی ریاستوں کے ساتھ تعلقات کی بنیاد کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔

کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سیرتِ رسول ﷺ کو جدید بین الاقوامی تعلقات (International Relations) کے نظریاتی فریم ورک کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہجرتِ حبشہ کو ایک "سفارتی اقدام"، صلح حدیبیہ کو "اسٹریٹجک معاہدہ"، اور نجاشی و مقوقس سے تعلقات کو "ریاستی دوستانہ تعلقات" کے مظاہر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ صرف مذہبی پیشوا نہیں تھے بلکہ ایک مدبر، سفارت کار اور بین الاقوامی قائد بھی تھے۔

کتاب میں حوالہ جات کا استعمال مستند سیرت اور تاریخی ماخذ کی روشنی میں کیا گیا ہے، جو اس کی علمی گہرائی اور تحقیقی وقعت کو بڑھاتا ہے۔ مصنف نے ابنِ ہشام، طبری، ابنِ سعد اور دیگر قدیم مصادر کے ساتھ ساتھ جدید مصنفین جیسے ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا

مودودی اور ڈاکٹر محمود غازی کی آراء کو بھی شامل کیا ہے، جس سے قاری کو تاریخی تسلسل اور جدید تناظر دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔

عصرِ حاضر کے تناظر میں، جب مسلم دنیا سفارتی تنہائی، سیاسی انتشار اور بین الاقوامی دباؤ کا شکار ہے، یہ کتاب ایک فکری رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی کے اصولوں کو اختیار کیا جائے، جیسے عدل، صلح، حسنِ سلوک، سفارتی تحمل اور مقصدی حکمت، تو آج بھی مسلم دنیا عالمی منظر نامے پر باوقار کردار ادا کر سکتی ہے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی سیرتِ طیبہ کے موضوع پر ایک اجتہادی، بامعنی اور علمی معیار کی حامل کتاب ہے۔ یہ نہ صرف محققین اور طلبہ کے لیے ایک قیمتی حوالہ ہے بلکہ عمومی قارئین کے لیے بھی فکری ارتقا کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد مانگٹ کی یہ کاوش اردو سیرت نگاری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، جو دیر تک یاد رکھا جائے گا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس کتاب کو علمی حلقوں میں غیر معمولی طور پر پذیرائی حاصل ہو گی۔

پروفیسر واسع اختر

Prof. Emeritus
(Islamic Studies),
Jamia Millia Islamia, New Delhi.
Vice President,
Anjuman Taraqqi Urdu
(Hind)Urdu Ghar, DD Marg, New Delhi.

الحمد رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا وحبیبنا محمد وعلی الہ

وصحبہ أجمعین

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

اور جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو، اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ۔(سورۃ الحشر ۵۹-۷)

سیرت النبی ﷺ پر لکھنے، اس کو پڑھنے، اس سے رہنمائی حاصل کرنے اور اس سے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی اہمیت ہر زمانے میں قائم ہے۔ اسی سلسلے میں محترم و مکرم جناب ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب نے رسول کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی کے عنوان سے نہایت ہی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

اس عنوان یا اس عنوان سے ملے جلے عناوین پر کیوں قلم اٹھانا ضروری ہے؟

اس لیے کہ بالعموم مسلمانوں نے سیرت نبوی ﷺ کو صرف ظاہری حسن، معجزات اور چند ایک عبادات و فضائل تک محدود کر دیا ہے، اور اس بہترین سنت پر جس کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تھے بہت، کم ہی اہتمام کیا گیا۔ وہ کار نبوت جس کو قرآن کریم نے تین الگ الگ سورتوں میں بیان فرمایا ہے۔(ھو الذی أرسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ)

اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین بر حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام دیگر ادیان پر غالب کر دے۔(سورۃ التوبہ ۳۳، سورۃ الفتح ۲۸، سورۃ الصف ۹) ہم اس سنت کو بھول گئے ہیں۔

فاضل مصنف جناب ڈاکٹر مشتاق مانگٹ صاحب نے ایک محقق، محب رسول ﷺ، اور ایک داعی کی حیثیت سے سیرت رسول اکرم ﷺ کی روشنی میں خارجہ پالیسی اور سفارت کاری پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھ کر اور اس خلا کو کافی حد تک

پر کر کے اردو دان طبقے پر احسان کیا ہے۔

کتاب میں خاص طور میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ (بصیرت پر مبنی صلح) عالمی حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط (بین الاقوامی سفارت کاری) سفیروں کو بھیجنا اور سفیروں کا استقبال، قابل ذکر ہیں۔ آج کے دور میں اس کی ضرورت ہے کہ مسلمان حکمران سیرت رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی کی روشنی میں بین الاقوامی سطح پر دعوت و اصلاح کے لیے حکمت عملی بنائیں۔ امت مسلمہ کے مفادات کا تحفظ کریں، عالمی سطح پر مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کریں۔ امن و امان کے مسائل، معاہدات اور سفارت کاری کو سیرت النبی ﷺ کے پرتو میں تشکیل دیں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ رب العالمین اس جہد کو شرف قبولیت عطا فرمائے، اس کو مصنف، ان کے والدین اور ان کے تمام اعزا اور اقارب کے لیے دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کا وسیلہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین!

پروفیسر ڈاکٹر فصیح اللہ

سلام یونیورسٹی کابل افغانستان

***

سیرت نبیؐ پر یہ ایک جامع اور بہترین مقالہ ہے۔اس کو دیکھتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے یہ کام لیا ہے۔میں ایک عرصے سے سیرت کے واقعات سے استدلال اور معاصر مسائل میں رہنمائی لینے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔فتح اللہ گولن کی سیرت پر ایک کتاب ہے اس میں بھی یہی استدلالی انداز اختیار کیا گیا ہے البتہ تحقیقی معیار اُس میں مفقود ہے۔

اس مقالے کے اندر بہت زیادہ خوبیاں ہیں۔ان میں سے چند غیر معمولی خوبیوں کا ذکر جو میں مناسب سمجھتا ہوں وہ درج ذیل ہے۔

1۔اس میں نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔

2۔عموماً مصنفین سیرت کے موضوع پر لکھتے وقت فضائل پر زیادہ زور دیتے ہیں۔اس مقالے میں زندگی سے متعلق عملی جہات اور پہلوؤں کے بیان پر توجہ دی گئی ہے۔فضائل بھی ضمناً شامل کیے گئے ہیں۔

3۔سیرت کے ہر واقعے میں انسانوں کے لیے کیا رہنمائی ہے؟اس پہلو کو بہت شاندار طریقے سے نمایاں کیا گیا ہے۔

4۔واقعات سیرت سے اجتہاد کرنے کا ایک بہترین طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔یقیناً یہ سیرت سے اجتہاد کا اردو تفسیری ادب میں ایک خوب صورت انداز اور اضافہ ہے۔

5۔اہم امور اور نکات کو پوائنٹس کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

6۔اس کتاب کو فقہ السیرۃ کے کتابوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔اس لیے کہ اس میں فقہی اسلوب اور رنگ بھی موجود ہے۔

7۔مقالے میں مستند روایات شامل کرنے کے دعوے کے ساتھ اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

8۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سیرت کے بیان میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔مبالغہ آرائی سے اجتناب کیا گیا ہے۔لہذا آپ ﷺ کا ایک شاندار منصب اور مقام قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

9۔اسی طرح یہ مقالہ تحقیق کے جدید معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔

مجموعی طور پر بہت شاندار اور بہترین کام ہے۔تبصرے میں بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔بس وقت کی تنگی کی وجہ سے اس پر اکتفا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مولانا محمد غیاث
مدیر مرکز رحمۃ للعالمین للبنات، واہ، بین دیر پائین
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

***

سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ اور سیرت نگاری ہر دور میں اہل ایمان اور دیگر ادیان کے محققین و مصنفین کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ہر زبان میں نبی کریم ﷺ کی سیرت، شمائل، خصائص، دلائل پر لاتعداد کتب لکھیں گئیں اور اب تک لکھی جارہی ہیں۔ اردو زبان میں بھی ادب سیرت کی کئی جہات پر بڑا قیمتی سرمایہ موجود ہے، سرسید اور علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہم سے لے کر مولف کتاب ہذا ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب تک سیرت نگاروں کی ایک کہکشاں ہے جس کا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کا تعارف درج ذیل ہیں۔

۱۔ یہ کتاب سیرت رسول ﷺ پر موضوعاتی انداز سے مرتب کی گئی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری پر تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ موضوعاتی منہج سیرت نگاری کی عکاس ہے۔

۳۔ مصنف نے قرآن مجید، احادیث نبویہ، کتب سیرت، کتب تاریخ، کتب تفسیر اور معاصر سیرت نگاروں سے اخذ واستفادہ کیا ہے۔

۴۔ بنیادی مصادر سے اخذ واستفاد کرتے ہوئے عربی متون کا ترجمہ دیا ہے۔

۵۔ کتاب کے مرکزی موضوع سے متعلق، سیرت کے واقعات بیان کرتے ہوئے ہر واقعے کے بعد اس کے اہم نکات کی نشاندہی کی ہے۔

۶۔ مصنف نے جن کتب اور مصادر سے اخذ و استفادہ کیا ہے اس کا فٹ نوٹ میں حوالہ دیا ہے۔

۷۔ مصنف نے مکی عہد نبوت کو خارجہ پالیسی و سفارت کاری کے لیے اساسی و نظریاتی عہد قرار دیا ہے، دعوت نبوی اور اس کے مراحل و منہاج پر تفصیلی بحث کرتے

ہوئے اس سے خارجہ پالیسی و سفارت کاری کے رہنما اصول اخذ کیے ہیں۔

۸۔ ریاست مدینہ میں خارجہ پالیسی و سفارت کاری کے ان اصولوں کا اطلاق کیا گیا، جس کو مصنف نے تحقیقی و استنباطی منہج میں تفصیل سے نکات کی صورت میں بیان کیا ہے۔

۹۔ زبان و بیان، تحقیق و تجزیہ اور اسلوب نگارش کے پہلو سے بھی یہ ایک معیاری تحقیق و تصنیف ہے۔

۱۰۔ یہ مسودہ قابل اشاعت ہے۔

ڈاکٹر محمد سجاد
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبہ مطالعات بین المذاہب
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

***

کسی دانا نے کہا تھا کہ جو غواص گہرا غوطہ نہ لگا سکے وہ نایاب مچھلی نہیں پکڑ سکتا۔ کسی با معنی بات تک پہنچنے کے لیے یہی جہد اور ایسی ہی ریاضت درکار ہے۔ لیکن یہ تو رہی ایک بات، اگلی بات یہ ہے کہ پانیوں کی بھی کئی قسمیں اور جہتیں ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو دریا کا تیراک ہو وہ سمندر میں بھی سرخرو ٹھہرے اور چوڑی ندیوں میں سفر کرنے والا جھلیں بھی اسی آسانی سے سر کر جائے۔ بات تو مشکل سی لگتی ہے لیکن آپ ہمارے دوست ڈاکٹر مشتاق احمد مانگٹ سے متعارف نہیں ہیں۔ انھیں خدا نے ایسا جاندار اور متحرک ذہن دیا ہے کہ جس میدان میں قدم رکھتے ہیں، کوئی نایاب یاقوت ڈھونڈ لاتے ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے رسول اکرم کی وسیع سیاسی زندگی کے بھی ایک مخصوص پہلو یعنی خارجہ معاملات کو سامنے رکھا ہے اور میری رائے میں اپنے موضوع کے ساتھ کماحقہ انصاف کیا ہے۔ اسلام کی حقانیت بھی دراصل اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس کے اصول آفاقی (Universal) ہیں۔ یوں تو جناب ابراہیم سے لے کر جناب عیسیٰ تک تمام انبیا نے بھی انھی اصولوں کی تبلیغ کی ہے لیکن عہد رسالت ﷺ تک یہ اصول اس قدر پختہ ہو چکے تھے کہ اب تا قیامت انسانیت کے لیے یہی رہنما ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی کتاب میں ان اصولوں کو عہد حاضر کے حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا قلمِ رسا رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے کچھ ایسے گوشے بھی سامنے لانے میں کامیاب رہتا ہے جو عام طور پر ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ مثلاً اعلان نبوت سے قبل کے سیاسی و تجارتی حالات عام طور پر زیر بحث نہیں آتے جبکہ رسول اللہ ﷺ کی دعوتی حکمت عملی کو سمجھنے کے لیے ان کا

مطالعہ از حد ضروری ہے۔انھیں سامنے رکھتے ہوئے ہی ہم اپنے زمانے کے حالات کے مطابق بہتر فیصلہ لے سکتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر یہ کتاب اس عظیم انقلابی تحریک کی ایک Hollistic تصویر پیش کرتی ہے جس میں پس منظر اور پیش منظر دونوں آ گئے ہیں۔ چنانچہ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب سیرت کے طالب علموں اور ہمارے اہل الرائے کے لیے رہنما ثابت ہو گی اور ہماری سیاسی و عملی زندگی پر بھی اس کے مثبت اثرات نظر آئیں گے۔ایک محقق کا کام تو ڈاکٹر صاحب نے بخوبی کر دیا ہے، اب اس سے فیض مند ہونا ہماری اور آپ کی ہمت و توفیق پر منحصر ہے۔

سید وقاص انجم جعفری

***

ہمارے محترم اور پیارے دوست ڈاکٹر محمد مشتاق مانگٹ، ٹیکسٹائل انجنئیر نگ اور صنعتکاری کے میدان میں کامیابی سمیٹتے،قریہ قریہ کُوچہ بہ کُوچہ سیاحت کے میدان میں نکل کھڑے ہوئے اور اپنی آنکھوں دیکھی وہ ساری راہیں یادگار بنا کے ہمارے سامنے مجسم کرکے رکھ دیں۔وہ ہر دم نئی راہوں کے متلاشی رہتے ہیں اور اب ان کا رہوار قلم سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پاکیزہ موضوع کی طرف مائل ہوگیا اور ان کی حیات طیبہ کا ایک ایسا گوشہ ہمارے سامنے وا کردیا جس کی طرف کسی کا دھیان پہلے بہت کم گیا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے،اس منفرد گوشے کا سب سے خوب صورت رخ ھمارے سامنے پیش کیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچ اور عمل کے ایسے پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے جس کا تعلق آج کی جدید دنیا میں سفارت کاری، بین الاقوامی تعلقات اور داخلہ وخارجہ امور سے جڑا ہوا ہے۔

سیرت رسول صل اللہ علیہ وسلم پر صدیوں سے لکھا جارہا ہے اور تاقیامت لکھا جاتا رہے گا،وہ **وَرَفَعنا لَكَ ذِكرَك** کے اعزاز سے سرفراز کیے گئے ان کے ذکر کا آوازہ بلند سے بلند مرتبہ پائے گا کہ یہ ہمارے رب کا ایک اٹل وعدہ ہے جسے اس نے اپنے کلامِ پاک کا حصہ بنادیاہے۔ہرلکھنے والے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی عائلی، معاشرتی، معاشی سیاسی، نبوی غرضیکہ ،ان کی زندگی کے ہر پہلو پہ لکھا اور خوب لکھا ہے۔دراصل اس طرح سیرت نگاروں نے اپنا نام اور عقیدت بھرا کام ان کے قدموں پہ نچھاور کیا اور اب ڈاکٹر محمد مشتاق مانگٹ اپنی تمام تر عاجزی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر وعمل سے ایسے بیش قیمت جواہر اپنے دامن میں سمیٹ لائے ہیں، جو ساری انسانیت کا اثاثہ قرار پاتے ہیں۔یہ ایسا کام ہے جو یقیناً آج کی جدید دنیا اور

منظم ریاستوں کے خارجہ تعلقات کی درست نہج پر استواری اور صلح و آشتی کی اثر آفرینی کا سبب بن سکتا ہے۔

سیرت طیبہ کا یہ رخ اقوام عالم میں اعلیٰ اخلاقی اقدار اور بامقصد پالیسی سازی کی بہترین بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کا عرق ریزی سے کیا یہ تحریری کام افراد، جماعتوں اور ریاستوں کے مابین گفتگو، مکالمے، تعلقات اور معاہدوں کے ایسے رہنما اصول فراہم کرتا ہے جو جذبات وعقیدت کے مرحلے سے گزر کر عمل کی حقیقی دنیا میں بے حد کارگر و کارآمد ثابت ہو گا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک بڑا مشکل موضوع تھا، سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد مشتاق مانگٹ نے نہ صرف یہ مشکل کام کر دکھایا ہے بلکہ انھوں نے ایک نئی راہ پہ چل کے بڑی مہارت سے اسے ہمارے سامنے کشادہ کر دیا ہے۔ نبیٔ اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا ہالۂ نُور ہیں جس سے ساری انسانیت اکتساب فیض کر سکتی ہے اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ان کی فکری رہنمائی ہمیں آج بھی، ہر وقت مل سکتی ہے اور وہ جو ان سے محبت واخلاص کے رشتے میں منسلک ہیں ان کو تو یہ متاعِ بے بہا وافر میسر ہے۔

اللہ ڈاکٹر صاحب کی اس مساعی کو اپنی بارگاہ میں نہ صرف قبول کرے بلکہ ان کی اس کوشش کو ایسی کامیابی عطا کرے کہ اس کتاب میں بیان کیے گئے شاندار اصولوں کی وجہ سے ساری دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے اور قوموں پر جنگ و جدل کے چھائے بادل ہمیشہ کے لیے چھٹ جائیں اور دنیا عدل وانصاف کی کشادہ شاہراہ پر گامزن ہو جائے۔

عبدالمحسن شاہین

***

سیرتِ پاک پر بے انتہا، بے شمار تصانیف موجود ہیں۔ لوگوں نے اپنے اپنے اندازاور موضوعات، عناوین پر خامہ پر سائی کی ہے۔ مگر محترم ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب نے ایک ایسے عنوان /موضوع پر قلم اٹھایا ہے کہ اس سے قبل کسی نے اس موضوع پر نہیں لکھا ان کی کتاب رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی ایک اچھوتی، بے مثل اور لاجواب کتاب ہے۔ حالانکہ موضوع خشک اور مذہبی ہے مگر ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان، پیرایہ ٔاسلوب ایسا ہے کہ پڑھتے وقت بوریت کا احساس تک نہیں ہوتا، ان کے لکھنے انداز کا نہایت دل نشین، شگفتہ و سلیس اور مؤثر ہے۔ ان کی تحریر کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریر /کتاب پڑھنا شروع کر دیں تو پھر ختم کیے بغیر چین نہیں آتا۔ میں نے ان کی کئی کتابیں مثلاً پھر چلا مسافر (بھارت کے چار سفر) حصہ اول، دوم، سوم، چہارم اور پھر چلا مسافر (خیبر پختون خوا) وغیرہ پڑھی ہیں۔ لطف آگیا اور تاریخی معلومات میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ ایسا لگا کہ میں بھی ان کے ساتھ سفر میں ہوں۔ یہ آپ کے لکھنے کا کمال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم کو رواں دواں رکھے۔ (آمین)

مبارک باد کے مستحق ہیں ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب کہ انھوں نے اس اچھوتے اور دلچسپ موضوع پر قلم اٹھایا اور موضوع کا حق ادا کر دیا۔ ان کا اندازِ بیان پیارا، سادہ اور سلیس اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ ثبوت کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انھیں انتہائی سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاجرین کو بے سر و سامانی کی حالت میں پناہ ملی اور انصارِ مدینہ نے بھرپور مدد کی لیکن مدینہ جیسے محدود وسائل والے شہر میں ایک بڑی تعداد کی کفالت ایک چیلنج تھا۔ یہ بات مشرکینِ مکہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان معاشی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اس دوران قریش کے تجارتی قافلے مدینہ کے قریب سے گزرتے ہوئے شام آتے جاتے

تھے۔ آپ نے ان قافلوں کی نگرانی اور تعاقب کی حکمتِ عملی اپنائی۔ جس سے کفارِ مکہ کو یہ پیغام ملا کہ اب مسلمان ایسی جگہ آباد ہو چکے ہیں، جو قریش کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے۔

یہ دراصل نفسیاتی برتری حاصل کرنے کی ایک بہترین حکمتِ عملی تھی جس کے ذریعے قریش کو دفاعی پوزیشن میں لایا گیا اور ان کے تجارتی راستوں پر دباؤ ڈالا گیا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی کی غیر معمولی مہارت کا مظہر تھا۔ جس نے اسلام کے مستقبل کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔''

یہ کتاب ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور بہت ہی دلنشیں انداز میں تصنیف کی گئی ہے۔ ہر مسلمان کو یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہیے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کے لیے یہی دعا ہے کہ

؎ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

فخر الدین فخرؔ

مدیر سہ ماہی مشیر عصر

صدر ملی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بجنور، یوپی (انڈیا)

***

مقدمہ

میرے دل میں ایک عرصے سے یہ خواہش موجود تھی کہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آخری رسول اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور آپ ﷺ کے دیگر قبائل اور اقوام سے ہونے والے بامعنی اور نتیجہ خیز مذاکرات اور معاہدات کے بارے میں کچھ ایسا تحریر کروں جو نبی پاک حضرت محمد مصطفےاصلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے شایانِ شان ہو (میرے خیال میں اس کی خواہش اور کوشش تو کی جاسکتی ہے، مگر اس کا حق ادا ہو، وہ ممکن نہیں) اور وہ میرے لیے صدقہ جاریہ بھی ہو۔

مجھے آپ ﷺ کی سیرت پر لکھی جانے والی کئی قابلِ قدر مختلف کتابیں پڑھنے کے بعد معلوم ہوا، کہ اکثر فاضل سیرت نگاروں نے آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور دیگر قبائل اور اقوام سے ہونے والے مذاکرات اور معاہدات کے بارے میں اپنی کتب میں کچھ نہ کچھ ضرور تحریر کیا ہے۔ مگر میں کوئی ایسی کتاب نہ ڈھونڈ پایا، جو خاص طور پر اسی موضوع پر لکھی گئی ہو (ہو سکتا ہے کہ کہیں موجود ہو، مگر میرے علم میں نہیں آئی)۔ یہ دیکھ کر میں نے ارادہ کیا کہ اس موضوع پر الگ سے ایک کتاب لکھی جائے، جس میں آپ ﷺ کی زندگی کے اس مبارک پہلو کو خصوصی طور پر اجاگر کیا جائے۔ اس کا مقصد ثواب کے حصول کے ساتھ ساتھ آج کے دور کے سیاستدانوں اور سیاسی مفکرین کے سامنے اس بات کو وضاحت سے بیان کرنا بھی تھا، کہ آپ ﷺ نے کس طرح اپنی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو ترتیب دے کر اپنی دعوت کو دور دور تک پہنچایا اور اپنے قرب وجوار میں آباد قبائل اور قائم ریاستوں سے بہترین اور خوشگوار تعلقات قائم کیے، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے نہایت مختصر عرصے میں

ایک مستحکم اسلامی اور فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی۔

اس مقالے کو لکھتے وقت میں نے جو کچھ بھی جانا، اس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج بھی ہم آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اصولوں (ماڈل) کو اپنا لیں تو دنیا میں عرصہ دراز سے جاری انتہائی خطرناک تنازعات کا ایک مستقل اور پائیدار حل نکل سکتا ہے۔ میرا اس بات پر کلی طور پر یقین ہے۔

اسلامی تاریخ میں یہ موضوع ہمیشہ سے ایک اہم حیثیت رکھتا رہا ہے۔ اس عنوان کے تحت امن و جنگ کے حالات میں نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خارجہ پالیسی کے نمایاں پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے دورِ حاضر میں بین الاقوامی تعلقات کے رائج اصولوں کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے، تاکہ نبی اکرم ﷺ کی حکمتِ عملی اور سفارت کاری کی عصری معنویت کو اجاگر کیا جا سکے۔ یہ کتاب اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ کس طرح آپ ﷺ پوری انسانیت کے لیے بے پایاں رحمت ثابت ہوئے۔

نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ معظمہ میں گزارے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ مدینہ منورہ میں آپ ﷺ نے ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی، اور یوں مدینہ کو پہلی اسلامی ریاست کے صدر مقام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ہجرت کے بعد پہلے پانچ سالوں میں مشرکینِ مکہ نے تین مرتبہ مدینہ منورہ پر حملہ کیا (ایک مرتبہ وہ بدر تک پہنچے، اور دو مرتبہ مدینہ منورہ تک)، جس کے نتیجے میں تین بڑی جنگیں ہوئیں: جنگِ بدر، جنگِ اُحد، اور جنگِ خندق۔ اس کے علاوہ بھی کئی مواقع پر جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔ یہ ایک طرح سے جنگ و جدل کا دور تھا۔ اسی دوران، آپ ﷺ نے مدینہ منورہ اور اس کے ارد گرد آباد قبائل سے تعلقات استوار کیے۔ تاہم، عرب میں جاری جنگی حالات کے

پیشِ نظر، اس عرصے میں آپ ﷺ نے عرب سے باہر موجود دیگر ممالک سے کوئی سفارتی رابطہ نہیں کیا۔ سن چھ ہجری میں صلحِ حدیبیہ کا معاہدہ طے پایا، جس کے تحت مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے نے نبی کریم ﷺ کو یہ موقع فراہم کیا کہ آپ ﷺ اسلام کے پیغام کو دیگر اقوام اور ریاستوں تک پہنچا سکیں۔

ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے، میں نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو پانچ منفرد ادوار میں تقسیم کر رہا ہوں۔

1. نبوت کے پہلے تین سال جب آپ ﷺ نے دعوت کا کام شروع کیا اور اپنے انتہائی قریبی افراد کو اسلام کی دعوت دی۔

2. نبوت کے تیسرے سال سے تیرہویں سال تک (ہجرت سے پہلے تک) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے عام لوگوں کو دعوت دینا شروع کی۔

3. مکہ سے ہجرتِ کے بعد یعنی مدنی دور کے پہلے پانچ سال (پہلی سے پانچویں ہجری تک)

4. صلہ حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ معظمہ سے پہلے (چھٹی ہجری سے اٹھویں ہجری تک)

5. فتح مکہ معظمہ کے بعد سے آپ ﷺ کے وصال مبارک تک (اٹھویں ہجری سے دسویں ہجری تک)

ان پانچوں ادوار میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے کئی مبارک اور خوب صورت مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مختلف حالات میں کس طرح کی خارجہ پالیسی اور سفارتی حکمتِ عملی اختیار کی جانی چاہیے۔ میں نے آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری پر لکھنے کے لیے تحقیقی مقالے کا انداز اختیار کیا ہے۔ تحقیقی مقالے کے لیے ایک یا ایک سے زائد سوالات ترتیب دینا ضروری ہوتا ہے، تاکہ تحقیق ایک منظم اور مربوط انداز میں آگے بڑھ

سکے۔(سوالات کی فہرست کتاب کے آخر میں موجود ہے)

میں نے اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں اور رسائل کے انتخاب میں اس بات کو مد نظر رکھا ہے کہ ان کے بارے میں عمومی رائے کیا ہے اور موجودہ دور کے سیرت نگاروں نے انھیں کس نظر سے دیکھا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ انھی کتابوں سے استفادہ کیا جائے، جنھیں دورِ حاضر کے جید علما نے بھی قابلِ بھروسہ تسلیم کیا ہے۔ میں اس کام میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

یہ کتاب ایک سنجیدہ علمی و تحقیقی کاوش ہے، جس میں موضوع کی نزاکت اور گہرائی کے پیش نظر، علمی اختلاف، فہم کی متنوع جہات، یا غیر ارادی لغزشوں کا امکان بہرحال موجود ہے۔ تاہم، دانستہ طور پر کسی بھی مقدس ہستی یا شعائرِ دین کے بارے میں گستاخی یا بے ادبی کا تصور نہ صرف بعید از فہم ہے بلکہ مکمل طور پر مسترد شدہ ہے۔

میں ہر اس غیر ارادی کوتاہی یا اظہارِ خیال پر جو کسی بھی طور پر گستاخی کے زمرے میں آ سکتا ہو، اللہ ربّ العزت کے حضور عاجزانہ معافی کا طلبگار ہوں۔ دانستہ گستاخی کا تصور ہی میرے عقیدے، علمی اخلاق اور طرزِ فکر سے متصادم ہے۔

میں اپنے رب کی رحمت سے ہمیشہ پرامید رہا ہوں، اور اسی سے امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنی شانِ کریمی سے میری لغزشوں کو معاف فرمائے گا۔ یقیناً وہی بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

میں نے اس مقالے کے لیے سید مودودیؒ کے قرآنی ترجمے سے استفادہ کیا ہے، البتہ قرآن مجید کی تفسیر کے لیے میں نے دیگر تفاسیر سے بھی مدد لی ہے اور سب کے حوالے دینے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ احادیث کے متن اور ان کے اردو ترجمے کے لیے میں نے موسۃ القرآن والحدیث سے مدد لی ہے، جسے عصرِ حاضر کے دو جلیل القدر محدثین، جناب ناصر الدین البانی اور حافظ زبیر علی زئی کی

نگرانی میں مرتب کیا گیا ہے۔[1]

ایک دفعہ پھر یہ بات واضح کر رہا ہوں کہ یہ کتاب اس لیے لکھی گئی ہے تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ آپ ﷺ نے کس انداز سے حالات کا جائزہ لے کر ان کا سامنا کیا، اور ہجرت کے بعد صرف دس سال میں مکہ معظمہ (جہاں سے آپ ﷺ کو رات کی تاریکی میں نکلنا پڑا) میں ایک ایسے فاتح کے طور پر واپس تشریف لائے، جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ مکی دور میں، جب آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر ظلم و ستم ڈھایا گیا، اور پھر مدنی دور میں آپ ﷺ پر جنگیں مسلط کی گئیں، ان تمام ادوار میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کیسی رہی؟ میرے لیے یہ حکمت کے وہ موتی ہیں جو آج کی دنیا کے لیے بھی اتنے ہی مفید ہیں جتنے اُس وقت تھے۔

آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل تھا جہاں سماجی ہم آہنگی، احساس، برابری اور رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر تقوے کی بنیاد پر افراد کے ساتھ برتاؤ کیا جائے اور باہمی اخوت و اتحاد کو فروغ ملے۔ آپ ﷺ ایسا معاشرہ چاہتے تھے جہاں کمزوروں کا خیال رکھا جائے اور ہر فرد کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری نہ صرف ریاست بلکہ اہلِ ثروت پر بھی ہو۔

ان نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد دینِ اسلام کی سربلندی پر رکھی، نہ کہ اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنے عزیز و اقارب یا اپنے دوستوں کے کسی ذاتی مفاد کی خاطر۔ یہی نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری کا سب سے اہم ترین پہلو ہے۔

[1] https://islamicurdubooks.com

میں نے ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے کوالٹیٹیو ریسرچ (Qualitative Research)(جسے معیاری تحقیق بھی کہا جاتا ہے)کے مروجہ اصولوں کو مدِ نظر رکھا۔ کوالٹیٹیو ریسرچ کا تعلق انسانی تجربات کے معیار اور ان کی نوعیت سے ہوتا ہے۔اس طرزِ تحقیق میں "کتنے" جیسے سوالات کے بجائے "کیا، کیسے اور کیوں" جیسے سوالات کے جوابات تلاش کیے جاتے ہیں۔[2] یہ تحقیق روزمرہ زندگی اور افراد کے رویوں سے متعلق ہوتی ہے، جسے مخصوص سوالات کی مدد سے جانچا جاتا ہے۔

اس کتاب کا عنوان ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی'' اہم جز ہے۔ کتاب میں وضاحت کی خاطر خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ یہ کتاب لکھنے کے دوران مجھے بارہا احساس ہوا کہ اس موضوع پر بہت کچھ مزید لکھا جا سکتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ تحقیق کئی سالوں پر محیط رہی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی بات کو بار بار دہرانا پڑا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کی شان بے حد بلند و بالا ہے، اور میں چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے اِس پہلو کو جتنا بہتر ہو سکے، اجاگر کروں۔ لیکن بہر حال، ایک مقام پر آکر قلم کو روکنا ہی پڑتا ہے۔ اسی لیے بقول مرزا غالب:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے۔

یہ بھی مرزا غالب ہی نے کہا ہے؛ ؎

---

2 Alizon K. Draper , Workshop on ‘Developing qualitative research method skills: analysing and applying your ’results The principles and application of qualitative research Proceedings of the Nutrition Society (2004), 63, 641– 646 DOI:10.1079/PNS2004397

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اور بقول ناصر کاظمی:

تھکی ہے فکرِ رسا اور مدح باقی ہے
قلم ہے آبلہ پا اور مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا اور مدح باقی ہے
"ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے"

میں نے اپنی پوری کوشش کی ہے کہ مقالے میں کوئی ایسی بات شامل نہ ہو جسے علمائے کرام نے مشکوک قرار دیا ہو، ضعیف کہا ہو، یا اسے بیان کرنے سے منع کیا ہو۔ اس کے باوجود، اگر آپ کو کوئی ایسی بات نظر آئے تو براہِ کرم مجھے مطلع کریں۔ میں ہمیشہ اپنی اصلاح کے لیے تیار رہتا ہوں۔

میرا ایمان ہے کہ میں اس قابل نہیں کہ آپ ﷺ کی مبارک زندگی پر کوئی تجزیہ پیش کر سکوں، یا یہ بیان کر سکوں کہ آپ ﷺ نے کسی بھی موقع پر کیا فیصلہ کیوں اور کیسے کیا۔ میں خود کو اس مقام پر نہیں سمجھتا کہ آپ ﷺ کی حکمتِ عملی کی گہرائی کو مکمل طور پر بیان کر سکوں۔ البتہ، میں نے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے چند حکمت و بصیرت سے بھرپور موتی چننے کی ایک عاجزانہ کوشش ضرور کی ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ میری اس کوشش کو قبول فرمائے اور اسے میرے لیے باعثِ نجات بنائے۔ اسی کے ساتھ، میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب امتِ مسلمہ سمیت پوری انسانیت کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔ آمین، ثم آمین۔

میں نے یہ تمام محنت صرف اپنی آخرت سنوارنے کی نیت سے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو قبول فرمائے، جو میں نے اللہ کے آخری نبی، حضرت محمد

مصطفیٰ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے ایک اہم پہلو کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے کی ہے۔

اصل بات تو یہ ہے؛

وَاللّٰهُ اَعلَمُ بِالصَّواب

وہی تو سب کچھ جانتا ہے۔

آپ حضرات سے بھی ایک دفعہ پھر یہ درخواست ہے کہ اگر آپ کوئی بات قابلِ اصلاح پائیں تو مجھے ضرور مطلع کریں۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيقُ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

لاہور

***

اسوۂ حسنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس سے پہلے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری پر بات کروں، میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا ایک مختصر ذکرِ خیر کرنا چاہوں گا۔ نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا تعارف ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دے گا کہ عرب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کا کیا مقام تھا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا، تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو دیگر قبائل اور قریبی ممالک تک پہنچانے کی جو کوششیں کیں، ان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندانی پس منظر نے کس طرح ایک اہم اور عمدہ کردار ادا کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جنھوں نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلے کا عرب کے ساتھ ساتھ کئی قریبی علاقوں میں بھی بے حد اثر ورسوخ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کے لیے میں نے سیرت انسائیکلو پیڈیا (جسے دارالسلام ریسرچ سینٹر نے سات جلدوں میں شائع کیا ہے) سے بھی مدد لی ہے۔[3]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب، ابتدائی زندگی اور خاندانی پس منظر

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ آپؐ کی ولادتِ باسعادت چھٹی صدی عیسوی کی آٹھویں دہائی، یعنی

[3] سیرت انسائیکلو پیڈیا مکتبہ دارالسلام جلد اول

۵۷۱ء میں ہوئی، اور ۶۳۲ء میں مدینہ منورہ میں وصال فرمایا۔ آپ ﷺ بنی ہاشم کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کے والد محترم، حضرت عبداللہ، آپؐ کی پیدائش سے قبل ہی وفات پا چکے تھے۔ آپؐ کے ننھیال یثرب (مدینہ) میں تھے۔ آپؐ کے دادا، حضرت عبدالمطلب نے آپؐ کی حفاظت اور پرورش کا ذمہ لیا، لیکن جب آپؐ آٹھ برس کے ہوئے، تو وہ بھی وفات پا گئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب نے آپ ﷺ کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ جب آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا، تو قریش کی طرف سے آپ ﷺ پر شدید مظالم کیے گئے، اس دوران حضرت ابو طالب نے آپ ﷺ کا دل و جان سے مکمل ساتھ دیا۔ انھوں نے آپؐ کو ہر طرح کی مدد فراہم کی اور ہر مشکل گھڑی میں آپؐ کا بہترین اور مضبوط سہارا بنے رہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی پہچان یہ ہے کہ آپ ﷺ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اسی لیے آپ ﷺ کو قریشی اور ہاشمی بھی کہا جاتا ہے۔ قریش کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ یاد رہے کہ جزیرۃ العرب میں آباد اکثر قبائل، جن میں قریش پیش پیش تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والے تھے۔ آپ ﷺ کا خاندان ابراہیمی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ قریش نے بت پرستی بھی شروع کر رکھی تھی۔ جزیرۃ العرب میں ہر قبیلے کے اپنے اپنے مخصوص بت تھے، جو کعبہ میں رکھے ہوئے تھے، جہاں وہ حج کرنے بھی آتے تھے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ قریش جہاں خدا پر یقین رکھتے تھے، وہیں وہ بتوں پر بھی یقین رکھتے تھے، اور اسی بنا پر انھیں مشرک کہا جاتا تھا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا ہی انکار کرتے تھے، اور انھیں کافر کہا جاتا تھا۔ (قرآن مجید میں دونوں کا ذکر ملتا ہے۔)

منفرد مقام رکھتے تھے۔ مکہ میں آپ ﷺ صادق اور امین کے نام سے مشہور تھے۔ مشرکینِ مکہ آپ ﷺ کو تنازعات کی صورت میں منصف بھی مانتے تھے۔ نبوت سے پہلے آپ ﷺ نے کئی تجارتی سفر بھی کیے، اور یہ سفر بھی قریش کے قبیلوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی عرصے میں آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی بھی کی۔

بعثتِ نبوی اور قریش کا ردِ عمل

جب آپ ﷺ کی عمر چالیس برس ہوئی تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو نبوت کا پیغام ملا۔ پہلی وحی کے موقع پر حضرت جبرائیلؑ آپ ﷺ کے سامنے حاضر ہوئے اور کہا: "اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔" (سورۃ العلق)۔ آپ ﷺ نے یہ ساری بات اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کو بتائی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کا ذکر چند قریبی لوگوں سے بھی کیا، اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد آپ ﷺ پر اگلے ۲۳ سالوں تک حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی رہی۔

جب آپ ﷺ نے اپنی دعوت قریش کے سامنے پیش کی تو قریش کے بہت سے رہنماؤں نے آپ ﷺ کی تعلیمات کی سخت مخالفت کی۔ مشرکینِ مکہ آپؐ کی دعوت کو اپنے ہاں رائج روایتی عقائد اور سماجی نظام کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی دعوت کی وجہ سے وہ اپنی حیثیت، اثر و رسوخ، اور مالی فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ دوسری طرف ایک قابل ذکر تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جنھوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو دل و جان سے قبول کیا اور زندگی بھر آپ ﷺ کا ساتھ دیا۔

آپ ﷺ نے مکہ معظمہ میں تیرہ سال گزارے۔ اس دوران مشرکینِ مکہ

آپ ﷺ نے مکہ معظمہ میں تیرہ سال گزارے۔ اس دوران مشرکینِ مکہ کے ظلم و ستم کے سبب آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت بھی دی۔

ہجرتِ مدینہ

جب قریش کے مظالم حد سے بڑھ گئے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے قتل (نعوذ باللہ) کے منصوبے بھی بنائے جانے لگے تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مکہ معظمہ سے موجودہ مدینہ منورہ کی طرف جو اس وقت یثرب کہلاتا تھا، ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس سے پہلے آپ ﷺ کا یثرب کے لوگوں سے رابطہ بھی ہو چکا تھا۔ بعد ازاں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم سے، آپ ﷺ نے بھی یثرب کی طرف ہجرت فرمائی۔ یہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، اور مسلمانوں میں اسی سال سے ہجری سن کا آغاز ہوتا ہے۔

جب آپ ﷺ یثرب تشریف لے گئے تو شہر کا نام یثرب سے بدل کر "مدینة النبی" یعنی نبی کا شہر رکھا گیا، اور اب اسے مدینہ منورہ کہا جاتا ہے۔ ہجرت کی ایک وجہ تو قریش کے مظالم تھے، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں ایک بڑی تعداد میں لوگ آپ ﷺ کے پیغام کو قبول کر رہے تھے۔ یہ ہجرت نہ صرف حفاظت کے لیے تھی بلکہ ایک ایسی ریاست کی بنیاد قائم کرنے کے لیے بھی تھی جہاں سے اسلام پر امن طریقے سے پھیل سکتا تھا اور ایک سماجی، مذہبی، حق و انصاف پر مبنی، اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بندگی پر قائم معاشرہ ترقی کر سکتا تھا۔

آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کا اہلِ مدینہ نے پر تپاک استقبال کیا۔ آپ ﷺ کی مدینہ آمد کے کچھ ہی عرصے بعد ایک ریاست کی بنیاد رکھی گئی،

جس میں مدینہ منورہ اور اس کے ارد گرد بسنے والے اکثر قبائل کی رضامندی بھی شامل تھی۔ اس طرح آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو مدینہ منورہ میں ایک ریاست کے شہری بن کر رہنے کا موقع ملا۔ کامیاب ہجرتِ مدینہ آپ ﷺ کا ایک عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس ہجرت کے نتیجے میں نہ صرف آپ ﷺ اور دیگر مسلمانوں کو ظلم و ستم سے نجات ملی، بلکہ اسلام کو پھلنے پھولنے کے لیے ایک سازگار ماحول بھی ملا۔ آج تک ہجرتِ مدینہ مصیبت کے وقت قربانی، ایمان، اور عزم کی علامت کے طور پر یاد رکھی جاتی ہے۔

یہ سب دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی ہجرت نے نہ صرف اسلام کی بقا کو یقینی بنایا، بلکہ آنے والے وقتوں میں جزیرۃ العرب (اس علاقے کے کئی اور نام بھی ہیں، جیسے جزیرہ نما عرب وغیرہ) اور اس سے باہر ایک اہم سماجی، سیاسی، اور مذہبی طاقت کے طور پر اس کے قیام اور توسیع میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

آپ ﷺ ۶۲۲ء سے ۶۳۲ء تک مدینہ منورہ میں رہے۔ اسی شہر میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی اور یہیں پر آپ ﷺ کا روضہ مبارک ہے۔ آپ ﷺ کا روضہ مبارک مسجد نبوی، جسے آپ ﷺ نے مدینہ آمد کے بعد تعمیر کروایا تھا، سے متصل ایک حجرے میں ہے، جسے حجرہ یا روضہ کہا جاتا ہے، اور بعد میں اس پر سبز گنبد کا اضافہ کیا گیا۔

آپ ﷺ کی مدینہ منورہ آمد

آپ ﷺ نے مدینہ منورہ آمد کے فوراً بعد ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے ایک باضابطہ آئینی دستاویز مرتب کی۔ یہ یثرب میں آباد قبائل اور مختلف مذہبی گروہوں (مسلمانوں، مشرکین، مسیحیوں اور یہودیوں) کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ اس ریاست

کی سربراہی آپ ﷺ کے پاس تھی۔

اس معاہدے کی رو سے:

1. تنازعات میں ثالثی کے لیے اسلامی اصولوں پر مبنی قوانین بنائے گئے۔
2. مدینہ کی متنوع آبادی کے درمیان انصاف اور مساوات کو یقینی بنایا گیا۔
3. تمام مذہبی گروہوں کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھا گیا۔
4. یہ ایک دفاعی معاہدہ بھی تھا (جس کی تفصیل آگے آئے گی)۔

جب آپ ﷺ مدینہ منورہ میں امن و سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے، تو یہ بات قریشِ مکہ کو قبول نہ تھی۔ چنانچہ، پہلے پانچ سالوں میں تین بڑی جنگیں ہوئیں: غزوہ بدر، غزوہ اُحد، غزوہ خندق۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے مشرکینِ مکہ کی طرف سے پیدا کیے گئے بیرونی خطرات کے خلاف کامیابی سے مدینہ کا بھرپور دفاع کیا۔ ایک بار جب آپ ﷺ عمرے کے لیے مکہ معظمہ پہنچے تو قریش نے آپ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس کے نتیجے میں ''صلح حدیبیہ'' نامی ایک امن معاہدہ طے پایا، جس کی ایک اہم شرط دس سال کے لیے جنگ بندی تھی۔ جب قریش کی طرف سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا تو آپ ﷺ نے نئے سرے سے اپنی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو ترتیب دیا۔ نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ترتیب دی گئی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی بدولت مدینہ منورہ اور اس کے آس پاس کے متعدد قبائل اور برادریوں نے اسلام قبول کیا۔ اس حکمتِ عملی نے جزیرۃ العرب میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ میں اہم کردار ادا کیا۔

ریاست مدینہ کی تشکیل

اسی عرصے میں، آپ ﷺ نے ایمان، اخلاقیات، قانون اور سماجی طرزِ

عمل کے مختلف پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی تربیت اور ان کی اخلاقی و روحانی اصلاح کی، جس کے نتیجے میں ایک بہترین اسلامی معاشرہ وجود میں آیا۔ آپ ﷺ کی رہنمائی میں سماجی اور اقتصادی اصلاحات نافذ کی گئیں، جن کا بنیادی مقصد عدل، خیرات اور عام آدمی کی خدمت کو فروغ دینا تھا۔ آپ ﷺ نے ایمانداری، دیانت اور کاروباری معاملات میں شفافیت پر زور دیا۔ آپ ﷺ نے کمزوروں اور ناداروں کی دیکھ بھال اور ان کے حقوق کے تحفظ کو اولین ترجیح دی۔

پھر وہ تاریخی لمحہ بھی آیا جب آپ ﷺ نے مکہ معظمہ فتح کیا اور قریش کی طاقت کا خاتمہ ہوا۔ اس فتح کے بعد جزیرۃ العرب کے ایک بڑے حصے پر آپ ﷺ کا حکم نافذ ہو گیا۔ تاریخ میں پہلی بار جزیرۃ العرب کا مرکزی حصہ کسی ایک حکمران کے تحت آیا۔ یہ پہلی ایسی اسلامی ریاست تھی، جس نے بعد میں دنیا کے ایک بڑے حصے کو فتح کیا۔

آپ ﷺ نے دس ہجری میں اپنے ہزاروں صحابہؓ کے ساتھ پُرامن طریقے سے حج ادا کیا، جسے حجۃ الوداع یا الوداعی حج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں رہ کر نہ صرف اسلام کو ایک جامع طرزِ زندگی کے طور پر قائم کیا، بلکہ ایک مدبر، قانون ساز اور روحانی رہنما کے طور پر بھی اپنا اہم کردار ادا کیا۔

آپ ﷺ کی دی گئی تعلیمات اور احکامات آج تک اسلامی عقائد، طرزِ عمل اور حکمرانی کے اصولوں کی تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کر رہے ہیں، اور ان میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے بہترین رہنما اصول موجود ہیں۔ آپ ﷺ کا وصال بھی مدینہ منورہ میں ہی ہوا، اور یہیں پر آپ ﷺ کا روضہ مبارک بھی موجود ہے۔

آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر گزشتہ چودہ سو سال سے لکھا جا رہا ہے۔ میرے

لیے سب سے مشکل کام یہی تھا کہ کس طرح آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں صرف چند صفحات میں اظہار کیا جائے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بے حد مختصر ہے۔ یہ سب کچھ محض اس لیے تحریر کیا گیا ہے تاکہ ہم آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔

***

قبل از اسلام عرب: تمدن، معیشت اور سیاسی حالات

آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آپ ﷺ کی بعثت کے وقت عرب اور اس کے ارد گرد موجود ممالک کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حالات کا بغور جائزہ لیں۔ ان معروضی حالات کو سمجھے بغیر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو مکمل طور پر سمجھنا مشکل ہوگا۔ قبل از اسلام سے مراد نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت سے پہلے کا زمانہ ہے، یعنی اسے چھٹی صدی عیسوی سے پہلے کا دور کہا جاسکتا ہے۔

اسلام کی آمد سے قبل جزیرۃ العرب، (جس میں موجودہ سعودی عرب، یمن، عمان اور دیگر خلیجی ممالک شامل ہیں) میں زیادہ تر خانہ بدوش قبائل آباد تھے، جو عرب کہلاتے تھے۔ یہ قبائل جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں صدیوں سے آباد تھے اور ان میں قبائلی نظام رائج تھا، جبکہ کوئی مرکزی حکومت موجود نہیں تھی۔ اس دور میں بھی عرب دور دراز علاقوں تک جن میں افریقہ، مشرق بعید اور ہندوستان بھی شامل تھے، تجارت کے لیے سفر کرتے تھے، لیکن اس وقت کی دو بڑی عالمی طاقتوں، (ایران اور روم) کے مقابلے میں وہ بہت کمزور تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے جزیرۃ العرب سے باہر کسی بڑی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

وہی عرب، جو کبھی صرف تجارت کے لیے جزیرۃ العرب سے باہر جاتے تھے، اسلام کی آمد کے بعد صرف دو سو سال کے اندر لبنان، شام، اردن، شمالی افریقہ، جنوبی اسپین، ایران، موجودہ افغانستان اور برصغیر (سندھ) تک بطورِ حاکم جا پہنچے۔ انھوں نے ایشیا، یورپ (اسپین) اور افریقہ کے کئی علاقوں میں اپنی طاقت کے بل بوتے پر مقامی لوگوں کو زیر کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ ایک وقت میں کمزور اور منتشر نظر آنے والی

قوم جب اسلام کی دولت سے سر فراز ہوئی تو اس نے دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کی۔ وہ جہاں بھی گئے، وہیں کے معاشرے کا حصہ بن گئے۔ ایک بڑی تعداد میں عرب برصغیر میں بھی آباد ہوئے۔

عرب دنیا کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

زرخیز ہلال—یہ ایک مخصوص جغرافیائی خطہ ہے جو جزیرۃ العرب پر مشتمل ہے۔

وادیِ نیل—اس میں مشرقی شمالی افریقہ کے ممالک شامل ہیں۔

خلیجی ریاستیں—جو خلیج فارس کے گرد واقع ہیں۔

مغربی شمالی افریقہ—اس میں مراکش، الجزائر، تیونس اور لیبیا جیسے ممالک شامل ہیں۔

عرب تاریخ کے ذرائع مختلف ہیں۔ کچھ معلومات مذہبی کتابوں سے لی گئی ہیں، جبکہ کچھ قدیم داستانوں اور مؤرخین کی تحریروں پر مبنی ہیں۔ کسی بھی تاریخی واقعے کے بارے میں مصدقہ طور پر کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے، اور یہ بات خاص طور پر عربوں کی تاریخ پر لاگو ہوتی ہے۔

عربوں کی تاریخ سے متعلق کئی امور اب بھی تحقیق اور بحث کا موضوع ہیں، اور بہت سی باتیں پوری طرح واضح نہیں ہیں۔ تاہم، ایک بات پر سب متفق ہیں کہ جزیرۃ العرب میں صدیوں سے کئی عرب قبائل آباد رہے، جو اپنے اپنے علاقوں کے حکمران تھے، لیکن یہاں کبھی کوئی مرکزی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ یہ بھی درست ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ کئی قبائل ناپید بھی ہو گئے۔

تاریخ میں تین مشہور قبائل کا ذکر اکثر ملتا ہے، لیکن ان کی تفصیلات بھی محدود ہیں۔ جزیرۃ العرب میں زیادہ تر عرب نسل کے لوگ آباد تھے، اور وہ عرب ہی کہلاتے تھے۔ عربوں کی اصل، ان کے جدِ امجد اور ان کی ہجرتوں پر کئی مؤرخین نے تفصیل سے لکھا ہے۔ چونکہ یہ میرے مقالے کا موضوع نہیں، اس لیے میں نے اس پر مختصر بات کی ہے۔

جزیرۃ العرب کا حدود اربعہ

جزیرۃ العرب اس علاقے کو کہتے ہیں جو خلیج فارس، خلیج عمان، خلیج عدن، بحیرۂ عرب اور بحیرۂ احمر کے درمیان واقع ہے۔اس طرح، یہ علاقہ تین اطراف سے پانی میں گھرا ہوا ہے اور ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ایشیا کو مشرقی ایشیا، جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، جنوب مغربی ایشیا اور شمالی ایشیا میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عام طور پر اختصار کی خاطر جزیرۃ العرب کے لیے "عرب" کی اصطلاح ہی استعمال کی جاتی ہے۔ جزیرۃ العرب کے علاوہ کئی افریقی ممالک بھی اب عرب لیگ (عرب دنیا) کا حصہ ہیں۔ جزیرہ (Peninsula) سے مراد ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جس کے کئی اطراف میں سمندر واقع ہو۔اس لحاظ سے، جزیرۃ العرب دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے، جس میں بحرین، عراق کا جنوبی حصہ ،اردن کا جنوبی حصہ ، کویت، عمان، قطر، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور یمن شامل ہیں۔

موجودہ دور میں عرب دنیا (Arab World) کی اصطلاح بھی رائج ہے، جس سے مراد وہ تمام ممالک ہیں جو عرب لیگ میں شامل ہیں، جن میں شام، عراق، لبنان اور شمالی افریقہ کے کئی ممالک شامل ہیں۔ جزیرۃ العرب کے شمال میں شام، عراق، لبنان اور فلسطین واقع ہیں۔ اس کی شمالی سرحد ترکی سے ملتی ہے، اس کے شمال مشرق میں ایران واقع ہے، اور شمال مغرب میں اس کی سرحد مصر سے ملتی ہے۔ جزیرۃ العرب دیکھنے میں ایک مستطیل کی طرح لگتا ہے۔اس کے جنوب میں بحیرۂ عرب واقع ہے، جس کے مغرب میں بحیرۂ احمر اور افریقی ممالک موجود ہیں۔اس مقالے میں جو اصطلاحات استعمال کی جائیں گی:

جزیرۃ العرب (جس میں سعودی عرب، یمن، خلیجی ریاستیں، عمان، قطر،

کویت، بحرین، عراق اور اردن کے جنوبی علاقے شامل ہیں)
عرب دنیا (وہ تمام ممالک جو عرب لیگ کے رکن ہیں)

عرب (عرب بطور قوم)

عرب دنیا میں بسنے والے لوگوں میں زبان، مذہب، ثقافت اور سیاسی ماحول کے خدوخال میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ جزیرۃ العرب کا رقبہ بتیس لاکھ مربع کلومیٹر سے زائد ہے (یہ رقبہ ہندوستان کے برابر اور پاکستان سے تقریباً ساڑھے تین گنا زیادہ ہے)۔ آج کل اس میں آباد لوگوں کی تعداد تقریباً دس کروڑ کے قریب ہے۔

عرب دنیا میں جزیرۃ العرب کے علاوہ بھی کئی ممالک شامل ہیں، جن میں شام، فلسطین، مصر، تنزانیہ، لیبیا، سوڈان، صومالیہ اور دیگر کئی ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک میں عربوں کے علاوہ بھی کئی دیگر نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں اکثر ممالک کی سرکاری زبان عربی ہے، لیکن ان کے معاشی اور معاشرتی حالات ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ عرب دنیا کو اَلْوَطَنُ الْعَرَبِیُّ بھی کہا جاتا ہے اور یہاں بسنے والے لوگوں کے لیے عرب قوم (Arab Nation) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔[4]

عرب اور مصر کے درمیان واقع صحرائے سینا بھی جزیرۃ العرب کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام کا آغاز بھی جزیرۃ العرب ہی سے ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام کی آمد کے بعد سے اب تک زیادہ تر عرب مسلمان ہی رہے ہیں۔ اس علاقے پر منگولوں کے حملے، ترکوں کا قبضہ، اور انگریزوں کی بالادستی بھی تاریخ کا ایک اہم باب

---

[4] https://www.britannica.com/place/Arabia-peninsula-Asia

صفی الرحمن مبارکپوریؒ رحیق المختوم ناشر: المکتبہ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور، 2010ء

ہے۔ جزیرۃ العرب ایک ایسا خطہ ہے جو زمینی اور سمندری راستوں سے آپس میں مربوط ہے، اور یہاں زبان، مذہب، ثقافت، تاریخ اور ورثے جیسے عوامل مشترک ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی میں آپ ﷺ کا واسطہ جزیرۃ العرب کے باہر کے ممالک سے بھی رہا، جیسے شام، یمن، مصر اور حبشہ وغیرہ۔ اس لیے آپ ﷺ کے دور سے پہلے اور آپ ﷺ کے دور میں ان تمام علاقوں کی معیشت، معاشرت، سیاسی نظام، مذاہب، اور تہذیب و تمدن کے بارے میں جاننا آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو سمجھنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہاں اس دور کے صرف چند اہم خطوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

قبل از اسلام عرب کی اقتصادی اور سماجی ساخت

آج جس علاقے میں مکہ، مدینہ، جدہ، تبوک اور طائف کے شہر واقع ہیں، اسے سعودی عرب کا مغربی صوبہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس خطے کے مغرب میں بحیرۂ احمر، شمال میں اردن، مشرق میں نجد اور جنوب میں عسیر کے علاقے پائے جاتے ہیں۔ حجاز، جزیرہ نما عرب کے شمالی اور مغربی علاقے پر مشتمل ہے، جس کی مغربی سرحد بحیرۂ احمر کے ساحل تک ہے۔ اس علاقے میں کئی پہاڑی سلسلے اور بہت سے بنجر صحرا پائے جاتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے ہی یہ علاقے ایک اہم مقام کے حامل تھے۔ اس کی ایک وجہ یہاں کعبہ کا موجود ہونا بھی ہے۔ اب مدینہ منورہ بھی اسی خطے کا حصہ ہے، جس کی وجہ سے دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک یہ علاقہ ایک خاص اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

جزیرۃ العرب میں بہت وسیع و عریض ریگستان اور گرم میدان بھی پائے جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں رہائش رکھنا بے حد مشکل ہے۔ اسی وجہ سے جزیرۃ العرب کا تقریباً ایک تہائی رقبہ بنجر ہے، جہاں بہت کم کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ قدیم دور میں اس علاقے

میں موجود کئی سر سبز جگہوں پر عرب قبائل اپنے اونٹوں اور مویشیوں کو چرانے کے لیے لے کر جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ صحرا میں انتہائی گرم اور خشک ہوا چلتی ہے۔البتہ، ساحلی علاقوں میں کہیں کہیں آبادی پائی جاتی ہے، لیکن وہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ان ویران جگہوں پر سونے اور چاندی کی کانیں اور قیمتی پتھر بھی پائے جاتے تھے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ قدیم زمانے سے ہی عرب اور غیر عرب دونوں کعبہ کے آس پاس کے علاقے میں احترام کی وجہ سے جنگ کو ناجائز سمجھتے تھے۔ حجاز کے چند اہم شہروں میں مکہ، مدینہ، جدہ اور طائف شامل ہیں۔اس علاقے میں دو اہم بندرگاہیں بھی پائی جاتی ہیں، جو بحیرۂ احمر کے کنارے واقع ہیں۔ جدہ کی بندرگاہ کو مکہ کے لوگ استعمال کرتے تھے، جبکہ دوسری بندرگاہ ینبوع تھی، جس کے ذریعے مدینہ کے لوگ بحری سفر کرتے تھے۔

آپ ﷺ کی پیدائش بھی حجاز میں ہوئی، اور آپ ﷺ کا مزارِ اقدس بھی اسی علاقے میں واقع ہے،اس لیے آپ ﷺ کے لیے ''حجازی'' کا لقب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی ایک کتاب کا عنوان بھی حجاز کے نام پر رکھا ہے؛ ارمغانِ حجاز یعنی حجاز کا تحفہ۔ علامہ اقبال کا یہ شعر بھی بے حد مقبول ہے، جس میں انھوں نے حجاز کا ذکر کیا ہے۔

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اسلام سے قبل عرب کے مختلف علاقے شاذ و نادر ہی کسی ایک مرکزی حکومت کا حصہ رہے ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس خطے کے لوگوں کا اسلام سے قبل بھی مشرقِ بعید، ہندوستان اور افریقہ جیسے دور دراز علاقوں سے تعلق کا ثبوت ملتا ہے۔ جزیرۃ العرب عمومی طور پر ایک وسیع سطحِ مرتفع کا منظر پیش کرتا ہے۔اس علاقے کی

بلند ترین چوٹی، صنعا شہر کے شمال مشرق میں واقع ہے، جسے حضرت شعیبؑ سے منسوب کیا جاتا ہے۔اس کی اونچائی بارہ ہزار فٹ ہے[5]۔

یہ سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جزیرۃ العرب قدیم تاریخ کا ایک ایسا علاقہ ہے، جہاں کئی تہذیبوں نے جنم لیا۔ یہ اہم تجارتی راستوں پر واقع تھا، جس کی وجہ سے مختلف تہذیبوں میں آپس میں تعلق بھی پروان چڑھا اور اس خطے میں ایک خاص تہذیب نے بھی جنم لیا۔مکہ معظمہ کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی ملتا ہے، جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے کعبہ کی تعمیر کی تھی۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرہ۲:۱۲۵)

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو اور ابراہیمؑ اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (البقرہ۲:۱۲۶)

اور یہ کہ ابراہیمؑ نے دعا کی: ''اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنا دے، اور اس کے باشندوں میں جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انھیں ہر قسم کے پھلوں

---

[5] *The Arab World: An IntroductionTo CulturalAppreciation*

کا رزق دے۔'' جواب میں اس کے رب نے فرمایا: ''اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دوں گا مگر آخر کار اُسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹوں گا، اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے۔''

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرہ۲:۱۲۷)

اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے: اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یہی وہ شہر ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو اپنی زوجہ حضرت ہاجرہؑ کے ساتھ چھوڑ کر فلسطین چلے گئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم سے کعبہ کی تعمیر کی، جہاں بعد میں آبادکاری کا آغاز ہوا۔ اسی شہر میں زمزم کا کنواں بھی واقع ہے، اور مکہ شہر کی آبادکاری میں اضافے کی ایک بڑی وجہ یہاں آبِ زمزم کا ہونا بھی ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ شہر دنیا بھر میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اسی مقدس شہر میں آپ ﷺ کی پیدائش ہوئی۔

اسی شہر کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ حکم بھی قرآن میں موجود ہے؛

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (المائدہ۵:۹۷)

اللہ نے مکان محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اِس کام میں معاون بنا دیا) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اُسے ہر چیز کا علم ہے۔

ان آیات سے اس شہر کی تاریخ کے بارے میں جاننے میں مدد بھی ملتی ہے اور اس کی عظمت اور کبریائی بابت بھی آگاہی ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے عظیم اور آخری پیغمبر کو بھی اسی شہر سے چنا۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور آپ ﷺ ، تینوں عظیم انبیا کی نسبت بھی اسی شہر سے ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا گھر بھی اسی شہر میں ہے۔ جس سے اس شہر کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

حجاز: جزیرۃ العرب کا ایک اہم حصہ

عرب کے دیگر خطوں کے برعکس حجاز پر کبھی بھی کسی نے فتح کرنے کی غرض سے حملہ نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں پر کچھ ایسا نہیں تھا جو کسی حملہ آور کے لیے باعث کشش ہوتا۔ اسی لیے اُس دور کی دو بڑی سلطنتوں (روم اور ایران) کی تہذیبوں کے کوئی آثار یہاں نہیں پائے جاتے۔ البتہ ایک واقعہ ضرور ملتا ہے جب یمن کے بادشاہ نے اپنے ہاتھیوں سمیت مکہ پر حملہ کیا تھا (اس کا مقصد کعبہ کو تباہ کرنا تھا۔ اس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ الفیل میں ملتا ہے)۔

حجاز ہی وہ خطہ ہے جہاں مکہ جیسا شہر موجود ہے، جس کی بنیاد اسلامی پیغمبروں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور اماں ہاجرہ نے رکھی تھی۔ پہلی اسلامی ریاست پر حکومت کرنے والے سب سے پہلے آپ ﷺ ہیں، ان کے بعد خلفائے راشدین ہیں۔ بعد میں بنو امیہ، بنو عباس نے بھی اس خطے پر حکومت کی۔ حضرت علیؓ نے اپنا صدر مقام مدینہ سے موجودہ عراق کے شہر کوفہ (جو مدینہ منورہ کے شمال مشرق میں کوئی چودہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے) منتقل کر لیا تھا۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی کے شروع تک عرب کے ایک بڑے حصے (جن میں حرمین شریفین بھی شامل ہیں) سلطنت

عثمانیہ کا حصہ بھی رہا ہے۔ یہ عرصہ چار سو سال پر محیط ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد بیسویں صدی میں نجد کے لوگوں نے ترکوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کیا اور موجودہ سعودی حکومت قائم کی گئی۔ جزیرۃ العرب کی تقسیم کئی اور لحاظ سے بھی ممکن ہے لیکن یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے اس کے چند اہم حصوں کا تعارف ہی پیش کیا گیا ہے۔

صحرائے عرب

نجد سعودی عرب کا وسطی اور مشرقی علاقہ ہے، جسے صحرائے عرب بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں آبادی بہت کم ہے، اور اسے 'دی عربین ڈیزرٹ' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی علاقے میں ریاض شہر واقع ہے، جسے سعودی خاندان نے اقتدار میں آنے کے بعد اپنا صدر مقام بنایا۔ یہ موجودہ سعودی خاندان کا آبائی علاقہ بھی ہے، اسی وجہ سے آلِ سعود کو نجدی بھی کہا جاتا ہے۔ ریاض ایک طرح سے نجد کے مرکزی حصے میں واقع ہے۔ عرب کا تیسرا حصہ جنوبی علاقہ کہلاتا ہے، جسے یمن بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جزیرۃ العرب کے جنوب مغربی علاقے میں واقع ہے[6]۔

یمن: ایک قدیم تہذیب و تمدن کا حامل امیر خطہ

زمانۂ قدیم سے ہی یمن کا علاقہ جزیرۃ العرب کا سب سے امیر علاقہ مانا جاتا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں یہ ایک شاندار تہذیب و تمدن کا حامل ملک تھا۔ یہاں نجد اور حجاز کے برعکس ایک مستحکم ریاست قائم تھی، جہاں کئی بادشاہوں نے طویل مدت تک حکومت کی۔

---

[6] Lecker, M. (2010). *Pre-Islamic Arabia*. In C. F. Robinson (Ed.), The New Cambridge *History of Islam* (pp. 153–170). chapter, Cambridge: Cambridge University Press (5)

اسلام کی آمد سے پہلے بھی یمن تجارت اور کاروبار کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہ بات بارہویں سے لے کر پانچویں صدی قبل مسیح کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں رومیوں نے بحرِ احمر کے ذریعے یمن پر کئی حملے کیے، جس کے نتیجے میں ایک طویل عرصے سے قائم ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ماضی کی ایک داستان بن کر رہ گئی[7]۔

یمن میں یہودی اور عیسائی آبادی

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں یمن کے بادشاہ نے یہودی مذہب اختیار کر لیا، جس کے بعد اس نے یمن کی عیسائی آبادی کا قتلِ عام کیا۔ جو عیسائی زندہ بچ گئے، انھوں نے بازنطینی شہنشاہ سے مدد طلب کی۔ اس پر رومی بادشاہ نے موجودہ ایتھوپیا میں موجود اپنے ایک حلیف ابرہہ کو ایک فوج دے کر یمن بھیجا۔ ابرہہ نے یہودیوں کا بے دردی سے قتلِ عام کیا اور یمن پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ یہی وہ ابرہہ ہے جس نے حجاز کے ایک اہم شہر، مکہ (جہاں خانۂ کعبہ واقع ہے) پر حملہ کیا، جس کی تفصیل قرآن مجید میں سورۃ الفیل میں بیان کی گئی ہے۔

اس دور میں قیصر و کسریٰ کی جنگیں بھی عروج پر تھیں۔ رومیوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے لیے شکست خوردہ یہودیوں نے فارس کے ساسانی خاندان سے مدد طلب کی۔ فارسیوں نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے یمن پر حملہ کیا اور اسے

---

[7] Fisher, Greg (ed.), *Arabs and Empires before Islam* (Oxford, 2015; online edn, Oxford Academic, 17 Sept. 2015),https://doi.org/10.1093/acprof:oso/9780199654529.001.0001, accessed 26 June 2024.

اپنے علاقوں میں شامل کر لیا۔ اسلام کی آمد کے بعد یمن کے آخری فارسی گورنر نے اسلام قبول کر لیا تھا[8]۔

جزیرۃ العرب پر رومیوں اور ایرانیوں دونوں نے حملے کیے۔ شمالی عرب پر رومی قابض تھے، جبکہ جنوب میں عرب اور ایران کے درمیان خلیجِ فارس واقع ہے، جسے عبور کر کے ایرانیوں نے بھی حملے کیے۔ دوسری طرف ایتھوپیا کی جانب سے بحیرِ احمر عبور کر کے عیسائیوں نے یمن پر حملے کیے۔ جیسے شام کا علاقہ رومیوں اور ایرانیوں کی جنگوں کا میدان بنا، ویسے ہی جزیرۃ العرب کے جنوبی علاقے بھی ان دو بڑی طاقتوں کا میدانِ جنگ بنے۔ البتہ، جزیرۃ العرب کے درمیانی حصے یعنی نجد اور حجاز پر براہِ راست کوئی بیرونی حملہ نہیں ہوا، سوائے ابرہہ کے واقعے کے۔

یمن کے علاقے میں سونا، چاندی اور دیگر قیمتی پتھروں کی بے شمار کانیں موجود ہیں۔ یہاں سے نکلنے والے عقیق دنیا بھر میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے یمن میں کئی ایسے مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں قدیم تہذیب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یمن میں موجود کئی دلکش اور بلند عمارتیں یمنی عوام کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یمن قدیم زمانے میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتا تھا اور اس کا شمار ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا تھا۔

بعثتِ نبوی سے قبل عرب کی حکومتی ساخت

علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے مطابق، اسلام سے پہلے عرب میں پانچ بڑی ریاستیں موجود تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے ہزار سال قبل، جنوب

---

[8] https://www.britannica.com/place/Yemen/History

مغربی عرب (یعنی یمن) ایک امیر علاقہ تھا۔ اسی علاقے میں ملکۂ سبا کا ذکر بھی ملتا ہے۔ قومِ ثمود کی بنائی ہوئی عمارات بھی اسی دور کی نشانی ہیں۔ اس دور میں یمن کی زرخیزی کی وجہ سے اسے ایک خوشحال علاقہ مانا جاتا تھا۔ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عرب کی تمام سلطنتیں زوال پذیر ہو چکی تھیں، البتہ یمن میں بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ شام کے علاقے میں غسانی قبائل حکومت کر رہے تھے اور یمن میں ابرہہ نامی بادشاہ حکمران تھا جس نے مکہ پر حملہ کیا تھا۔[9]

یہی وہ سال تھا جب آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔ اس وقت ابرہہ، یمن میں ایک طاقتور ریاست کا حکمران تھا اور اس کے پاس ایک بڑی فوج تھی۔ لہٰذا، یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اگرچہ عرب کے مرکز میں کوئی مرکزی حکومت موجود نہیں تھی، لیکن یمن کے علاقے میں ایک طاقتور ریاست ضرور موجود تھی، جس کا سربراہ ابرہہ تھا۔ یہ ریاست کب تک قائم رہی، یہ ایک الگ موضوع ہے۔

جزیرۃ العرب اور بازنطینی (مشرقی رومن) سلطنت

جزیرۃ العرب کے ارد گرد دو بڑی طاقتیں موجود تھیں، جنہیں عام طور پر اس وقت کے ان کے بادشاہوں کے ناموں کی نسبت سے "قیصر و کسریٰ" (یعنی رومی سلطنت اور فارس کی سلطنت) کہا جاتا تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ ان سلطنتوں کے جزیرۃ العرب کے شمالی علاقوں پر گہرے اثرات تھے۔ اسی اثر و رسوخ کی وجہ سے جزیرۃ العرب کے شمال میں بسنے والے غسانی قبائل نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ ان طاقتور

---

[9] سیرت النبی ﷺ تالیف علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، ناشر محمد سرور عاصم، سن اشاعت 2012، مکتبہ اسلامیہ لاہور

سلطنتوں کا ایک مختصر تعارف ہمیں نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو سمجھنے میں بے حد مدد فراہم کر سکتا ہے۔

رومی سلطنت، جسے "رومن ایمپائر" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کا آغاز قبل مسیح میں ہوا۔ یہ قدیم روم کی ایک عظیم الشان ریاست تھی۔

ایک وقت ایسا آیا جب اس سلطنت میں یورپ، شمالی افریقہ، اور مغربی ایشیا کے کئی علاقے شامل ہو گئے، اور یہ اپنے دور کی انتہائی طاقتور ریاستوں میں شمار ہونے لگی۔ پانچویں صدی عیسوی میں، اندرونی کمزوریوں اور اختلافات کے باعث اس کا مغربی حصہ زوال پذیر ہو گیا اور کئی چھوٹی مقامی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ تاہم، اس کا مشرقی حصہ، جس کا مرکز موجودہ استنبول تھا، قائم رہا۔ یہی حصہ بازنطینی سلطنت کہلایا، جسے مشرقی رومی سلطنت بھی کہا جاتا ہے[10]۔

بازنطین ایک قدیم تھریسیائی بستی کا نام تھا۔ ایک عرصے تک "مشرقی رومن سلطنت" (Eastern Roman Empire) کی اصطلاح استعمال ہوتی رہی، بعد میں اسے "بازنطینی سلطنت" کہا جانے لگا۔ یہ ریاست پندرھویں صدی کے وسط تک قائم رہی، بعد میں ترکوں نے اسے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کا ایک اہم حصہ بنالیا۔

یہ بھی ایک اہم تاریخی حقیقت ہے کہ یہی وہ سلطنت تھی جس نے آپ ﷺ کی زندگی میں شام کی سرحد پر جنگی کشیدگی پیدا کی تھی، جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے مدینہ سے تبوک تک کا سفر کیا۔ (اس واقعے کی تفصیل اگلے صفحات میں دی گئی ہے۔) تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے بازنطینی سلطنت کے کئی اہم علاقے، جن میں مصر بھی شامل تھا، آٹھویں صدی میں ہی فتح کر لیے۔ البتہ اس

[10] Gibbon, E. (2015). *The History of the Decline and Fall of the Roman Empire.* Volume 8. United States: Creative Media Partners, LLC.

سلطنت کا مرکز، استنبول، پندرہویں صدی میں ترکوں نے فتح کیا اور یوں کوئی پندرہ سو سال تک قائم رہنے والی اس عظیم ریاست کا خاتمہ ہو گیا[11]۔ آپ ﷺ نے اس وقت کے رومی بادشاہ، ہرقل (ہرکولیس)، کو بھی ایک خط لکھا تھا۔ اس کا ذکر اگلے صفحات میں کیا گیا ہے۔

رومی سلطنت کا ذکر ہمیں سورۃ الروم میں ملتا ہے۔ اس سورہ میں رومیوں (جو عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے) اور فارسیوں کی جنگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق رومیوں کو فتح حاصل ہونا تھی، اور مسلمان اس پر خوش تھے کیونکہ وہ اہلِ کتاب رومیوں کے حامی تھے۔ اس کے برعکس، مشرکین مکہ ایران کے حامی تھے، کیونکہ فارسی سلطنت مجوسیت (آتش پرستی) پر یقین رکھتی تھی، جو مشرکین کے عقائد سے زیادہ قریب سمجھی جاتی تھی۔

غُلِبَتِ الرُّومُ (الروم ۳۰:۲)

رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں۔

فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ (الروم ۳۰:۳)

اور اپنی اِس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے

فِي بِضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِن قَبْلُ وَمِن بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ (الروم ۳۰:۴)

اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور وہ دن وہ ہو گا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔

---

[11] Haldon, J. F. (1990). *Byzantium in the Seventh Century: The Transformation of a Culture*. United Kingdom: Cambridge University Press.

ساسانی عہد کا ایران: سیاسی و معاشرتی تجزیہ

ایران میں پہلی باقاعدہ ریاست کی بنیاد سائرسِ اعظم (Cyrus the Great) نے چھٹی صدی قبل مسیح میں رکھی۔ اس کی سلطنت میں ایران کے جنوبی علاقوں کے ساتھ ساتھ مغربی ایشیا، وسطی ایشیا، یورپ کے کچھ حصے اور کوہِ قاف کا علاقہ بھی شامل تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب بحیرہ روم اور آبنائے دانیال سے لے کر مشرق میں ہندوکش تک کا وسیع علاقہ اسی سلطنت کا حصہ تھا۔ یہ سلطنت اپنے دور کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی۔ سائرس عظیم کو یہودیوں کی آزادی کا سبب بننے والا حکمران بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے بابل فتح کرنے کے بعد یہودیوں کو غلامی سے آزاد کر دیا، جو اس وقت سلطنتِ بابل کے زیرِ تسلط تھے۔

یہ ایک طویل داستان ہے کہ ساسانی سلطنت کا قیام کیسے عمل میں آیا۔ تیسری صدی عیسوی میں اردشیر نے پارتھیوں کا تختہ الٹ کر اپنی نئی ریاست قائم کی، جو تاریخ میں ساسانی سلطنت کے نام سے جانی جاتی ہے۔ جب آپ ﷺ نے اپنی بعثت کا اعلان کیا، تب ساسانی سلطنت اپنے عروج پر تھی اور اس دور کی ایک بڑی اور طاقتور ریاست شمار کی جاتی تھی۔ اس کی سرحدیں مغرب میں رومی سلطنت، شمال میں جارجیا، جنوب میں جزیرہ نما عرب کے علاقے تک اور مشرق میں دریائے سندھ اور بالائی دجلہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دریائے فرات کی وادیاں بھی اسی سلطنت کا حصہ تھیں۔

ساسانی دور میں زرتشت مذہب کو ریاستی مذہب قرار دیا گیا، اور دوسرے عقائد کے پیروکاروں کو سخت مشکلات اور ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم، یہ دور ایرانی فنِ تعمیر کے عروج کا زمانہ بھی تھا۔ ساسانی حکمرانوں نے شاندار محلات، عظیم الشان عمارتیں،

اور منفرد طرزِ تعمیر کے نمونے تخلیق کیے، جو آج بھی ایرانی ثقافت میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں[12]۔

آپ ﷺ کے دور میں ساسانی سلطنت کا حکمران خسرو دوم تھا، جسے کسریٰ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ خسرو دوم ۵۹۰ء سے ۶۲۸ء تک ایران کا بادشاہ رہا اور ساسانی سلطنت کے طاقتور حکمرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ خسرو دوم کے طرزِ حکومت پر مورخین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے دور میں بازنطینی سلطنت کے ساتھ شدید جنگیں ہوئیں، جن میں اسے ایک بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی دوران آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت پر مبنی ایک خط ارسال کیا، جس کا ذکر تاریخی اور اسلامی حوالوں میں ملتا ہے (اس کا تفصیلی ذکر آگے کیا جائے گا)۔

یہ خط خسرو دوم کے لیے ایک غیر معمولی چیلنج تھا، کیونکہ ساسانی سلطنت اس وقت دنیا کی ایک بڑی طاقت تھی، اور ایک عرب نبی کی جانب سے بھیجا گیا پیغام اس کے لیے حیران کن تھا۔ تاہم، یہ خط اسلامی سفارت کاری اور عالمی اثر و رسوخ کی ایک اہم مثال بھی تھا۔

ساسانی سلطنت کا زوال خسرو دوم کی شکستوں اور داخلی انتشار کا نتیجہ تھا۔ خسرو دوم نے کئی بار رومیوں سے جنگ کی اور اپنی سلطنت میں قابلِ ذکر توسیع کی، لیکن اس کے آخری دور میں رومیوں کے ہاتھوں کئی بار شکست بھی کھانی پڑی۔ ان شکستوں کے بعد اس کے اپنے ہی لوگوں نے اسے قتل کر دیا، اور اس کے خاندان میں گہرے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد ایران میں سیاسی افراتفری کا ایک طویل دور دیکھنے کو ملا۔

[12] https://www.britannica.com/topic/Sasanian-dynasty

خسرو دوم کی موت کے کچھ ہی سال بعد، مسلمانوں نے ایران پر حملے شروع کر دیے۔یہ حملے ۶۳۳عیسوی میں حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے دوران شروع ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں قادسیہ اور نہاوند کی تاریخی جنگیں ہوئیں، جن میں مسلمانوں کو زبردست کامیابی ملی۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں یہ فتوحات اپنے عروج پر پہنچ گئیں اور ۶۵۱ عیسوی میں ساسانی سلطنت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔اس وقت ساسانی سلطنت کا آخری بادشاہ یزد گرد سوم تھا، جو مسلمانوں کے حملوں کے بعد فرار ہو گیا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔

اس طرح ایک عظیم سلطنت، جس کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا تھا، ساتویں صدی عیسوی میں مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ مسلمانوں کی فتوحات نے نہ صرف ایران بلکہ پورے خطے کا جغرافیہ اور تہذیب بدل کر رکھ دی[13]۔

عرب میں نظامِ سیاست

یہ جاننا کہ اسلام سے پہلے عرب کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، نظریاتی اور تہذیب و تمدن کی صورتِ حال کیسی تھی، اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ سب جانے بغیر ہم آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے بارے میں بہتر انداز سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

اسلام کی آمد کے بعد جزیرۃ العرب میں آباد خانہ بدوش قبائل نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو فتح کیا۔ اس سے پہلے بیرونی دنیا اہلِ عرب کو اونٹ، خیمے، خونریزی وغیرہ کی نسبت سے جانتی تھی۔ لیکن پھر وہ وقت آیا جب دنیا نے ان خانہ

---

[13] https://www.britannica.com/topic/Sasanian-dynasty

بدوشوں کو علم و ادب، معیشت، معاشرت اور سائنسی میدان میں نمایاں طور پر ترقی کرتے ہوئے دیکھا۔

اُس دور میں معاشرے میں قبیلے کے ایک فرد کی موت کو قبیلے پر ظلم سمجھا جاتا تھا، اور اس کا بدلہ لینا بھی قبیلے پر فرض ہوتا تھا۔ اس طرح ایک طویل جنگ کا آغاز ہو جاتا تھا، جو کئی دہائیوں تک جاری رہتی تھی۔ عام طور پر دوسرے قبیلے کے افراد کو دشمن کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر فرد کی شناخت اس کا قبیلہ ہی ہوتی تھی۔ قبائل کے درمیان جاری ان جنگوں نے جزیرۃ العرب میں خاندانی تعاون کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

جزیرۃ العرب میں سخت آب و ہوا اور وسائل کی کمی کی وجہ سے لوگ موسم کے مطابق ہجرت کرتے رہتے تھے۔ یہی خانہ بدوشوں کی ایک روایت تھی، جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر بھیڑ، بکریاں اور اونٹ پالتے تھے۔ جانوروں کی حفاظت خاندان کے ہر فرد کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی[14]۔

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی سے قبل عرب کبھی بھی ایک متحد قوم کے طور پر نہیں رہے۔ وہ مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے، اور ہر قبیلے کا اپنا سردار تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ہی زبان بولتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کے رہن سہن، تمدن اور روایات میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا۔ یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ اکثر قبیلوں کا اپنا ایک مخصوص بت ہوتا تھا، جسے وہ خدا کا مقرب سمجھتے تھے۔ ایک قبیلہ کسی دوسرے قبیلے کے خدا کو اپنا خدا نہیں مانتا تھا۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اہلِ عرب اکثر جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے، جس کی ایک مثال بکر اور تغلب کی چالیس سالہ جنگ ہے۔ ان جنگوں نے کئی قبیلوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اسی طرح اوس اور خزرج کے درمیان

---

[14] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، عبداللہ اکیڈمی، 2016

بھی ایک طویل جنگ ہوئی تھی۔ یہ عام بات تھی کہ جب بھی کسی قبیلے کا کوئی فرد قتل کر دیا جاتا، تو مقتول کے قبیلے کے لیے انتقام لینا لازم سمجھا جاتا تھا۔ انتقام صرف فرد سے نہیں، بلکہ پورے قبیلے سے لیا جاتا، اور یوں ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کا آغاز ہو جاتا۔

یہ تھا وہ معاشرہ جس میں آپ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ کسی بھی طرح کے تنازعات کو طے کرنے کے لیے کوئی طاقتور مرکزی حکومت موجود نہیں تھی، جس کی وجہ سے اکثر فیصلے میدانِ جنگ میں ہی کیے جاتے تھے[15]۔

اہلِ عرب کی اس کمزوری کی وجہ سے قریبی طاقتور ریاستیں اکثر ان پر حاوی رہتی تھیں۔ اس کی ایک مثال رومی اور فارسی سلطنتوں کا یمن، عمان اور بحرین کے زرخیز علاقوں تک اپنا دائرہ اختیار بڑھانا ہے۔ وہ لوگ عرب کے ان علاقوں پر قابض ہو گئے تھے۔ اہلِ عرب کی بدقسمتی یہ بھی تھی کہ کسی مرکزی طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان حملہ آوروں کا راستہ نہ روک سکے۔ اگرچہ اہلِ عرب کو اس کا دکھ ضرور تھا، لیکن وہ بے بس تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد عرب مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کیا۔

عرب میں یہودی اور عیسائی

رومیوں کے قبضے یا ان کے اثرات کی وجہ سے عرب کے شمالی اور جنوبی علاقوں میں عیسائیوں کی آبادکاری میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ یمن اور شام کے علاقے اس حوالے سے اہم گردانے جاتے ہیں، جہاں ایک بڑی تعداد میں عیسائی آباد تھے۔ یہ لوگ بنیادی طور پر عرب تھے، لیکن رومی سلطنت کے اثر و رسوخ کی وجہ سے انھوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا۔

---

[15] Webb, P. (2016). Greg Fisher (ed.): Arabs and Empires before Islam. xxviii, 580 pp. Oxford: Oxford University Press (14)

یہ بات بھی اہم ہے کہ ساتویں صدی سے قبل عرب میں اکثریت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والوں کی تھی، البتہ کئی شہروں میں یہودی بھی آباد تھے، جیسے مدینہ میں یہودی قبائل۔ جب رومیوں نے شام پر قبضہ کیا تو غسان اور بعض دوسرے عرب قبائل نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس طرح پہلی مرتبہ کئی عرب قبائل، جو شام کی سرحد پر آباد تھے، عیسائیت میں داخل ہوئے۔

اسی دوران، جب رومیوں نے دوسری صدی قبل مسیح میں یہودیوں کو شام اور فلسطین سے نکال دیا، تو یہاں کے یہودی مدینہ اور اس کے مضافات کی طرف ہجرت کر گئے۔ انھوں نے مدینہ، خیبر، یتما، فدک اور دیگر مقامات پر اپنے مضبوط قلعے بنا لیے۔ یہ خوشحال اور زیرک لوگ تھے، اس لیے جلد ہی انھوں نے دولت کے سہارے عربوں کو معاشی اور معاشرتی طور پر زیر کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ یہودی خود کو عربوں سے برتر سمجھتے تھے اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ خدا کے ''منتخب لوگ'' ہیں۔ ان کے طرزِ عمل میں غرور اور تکبر نمایاں تھا[16]۔

عرب: جہاں قبیلہ شناخت اور اقتدار کا محور تھا

جزیرہ نما عرب کے اکثر باسی خانہ بدوش بدو قبائل تھے۔ اسلام کی آمد سے قبل یہ لوگ اپنے علاقے کے حکمران تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جزیرۃ العرب میں کوئی مرکزی حکومت قائم نہیں تھی۔ لوگ خاندانوں کی شکل میں رہتے تھے اور کئی خاندان مل کر ایک قبیلہ بناتے تھے۔ باہمی تعاون ان کی زندگی کا بنیادی جز تھا۔ قبائل کے درمیان اختلافات عام بات تھی، لیکن کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلے کو فتح کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا تھا۔ ان کی معیشت اور طرزِ زندگی کا دار و مدار مویشیوں پر تھا۔

---

[16] Robert G. Hoyland, *Arabia and the Arabs : from the Bronze Age to the coming of Islam*. New York: Routledge, (2003 ISBN 0415195349 (15)

جانوروں سے حاصل ہونے والا گوشت، دودھ، پنیر، کھال، اون وغیرہ ان کی اصل کمائی تھی۔ وہ تجارتی قافلوں کے محافظ کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب قبائل دوسری صدی عیسوی کے آس پاس جنوبی شام کے صحراؤں اور جنوبی اردن سے ہجرت کر کے عرب میں آباد ہوئے۔ اسلام کی آمد کے بعد یہ لوگ وسطی عرب تک پھیل گئے۔ جزیرۃ العرب میں آباد لوگوں کے لیے عمومی طور پر "بیڈوین" کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، جس کا مطلب ہے: صحرا میں رہنے والے عرب، جو قبیلوں کی شکل میں بستے تھے۔

اسلام سے پہلے جزیرۃ العرب میں کون لوگ آباد تھے اور کن تہذیبوں نے یہاں جنم لیا، اس بارے میں کوئی مستند اور قابلِ اعتبار تحریری ذرائع موجود نہیں۔ البتہ آثارِ قدیمہ اور عرب کی مشہور زبانی روایات سے کسی حد تک مدد لے کر ایک عمومی تصویر ضرور بنائی جاسکتی ہے۔

عرب کے قدیم حکمران

قدیم عرب میں سب سے نمایاں تہذیبوں میں اہلِ ثمود شامل ہیں، جو تین ہزار سال قبل مسیح سے لے کر تیسری صدی عیسوی تک اس علاقے میں موجود رہے۔ ان کے بعد دلمون کا نام آتا ہے، جو چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں نظر آتے ہیں، اور ان کا دور چھٹی صدی عیسوی تک رہا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جزیرۃ العرب کے جنوبی حصے میں کئی اور عرب ریاستیں بھی موجود تھیں، جن میں سبائی سلطنت ایک اہم سلطنت سمجھی جاتی ہے۔ جزیرۃ العرب کے مشرقی ساحلی علاقوں پر تیسری صدی قبل مسیح میں ایرانی پارتھیوں کی حکمرانی تھی، اور ساسانیوں کا بھی ایک مخصوص علاقے پر قبضہ تھا۔

مصدقہ تاریخی شواہد کے مطابق، جزیرۃ العرب میں انسانی موجودگی کا پہلا ٹھوس ثبوت کم از کم پندرہ ہزار سال پرانا ہے۔ اس کی تائید مختلف آثارِ قدیمہ سے ہوتی ہے۔ سعودی عرب کی سرکاری رپورٹ کے مطابق، زمانۂ قدیم میں اس علاقے میں دو ایسے خطے تھے جہاں بڑی تعداد میں لوگ آباد تھے: دریائے نیل کا علاقہ اور میسوپوٹیمیا۔ جزیرۃ العرب ان دونوں عظیم تہذیبوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے ایک تجارتی سنگم کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جزیرۃ العرب کو تجارت کے مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے لوگوں نے میسوپوٹیمیا (آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق دریائے دجلہ اور دریائے فرات کی وادیوں کے درمیانی علاقے جس میں موجودہ عراق اور شام واقع ہے)، وادیٔ نیل اور بحیرۂ روم کے درمیان سامان کی نقل و حرکت کے لیے ایک پیچیدہ تجارتی نیٹ ورک تیار کیا۔ سعودی عرب کی سرکاری رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان تجارتی راستوں پر بڑے بڑے قافلے موجودہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے گزر کر عمان اور یمن تک جاتے تھے[17]۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں میسوپوٹیمیا، وادیٔ نیل اور مشرقی بحیرۂ روم کی ریاستوں کے باہمی تنازعات کے باعث اہلِ عرب بڑی حد تک بیرونی جنگوں اور حملوں سے محفوظ رہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ جزیرۃ العرب کے وسیع و عریض صحرا تھے، جو حملہ آوروں کی راہ میں ایک قدرتی رکاوٹ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بیرونی طاقتیں یہاں حملہ کرنے میں شدید خطرہ محسوس کرتی تھیں، اور یوں عرب کسی حد تک بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رہا[18]۔

---

[17] میسوپوٹیمیا یونانی لفظ ہے جس کا معنی ہے دو دریاؤں کے درمیان۔ ماہرین کے مطابق دریائے دجلہ اور دریائے فرات کی وادیوں (موجودہ عراق اور شام) میں واقع علاقے کا نام تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلی انسانی تہذیب کی ابتدا بھی اس خطے میں ہوئی۔

[18] https://www.saudiembassy.net/history

اسلام سے قبل جزیرۃ العرب میں آباد قبائل

علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (حصہ اوّل) میں تفصیل کے ساتھ قبل از اسلام عرب میں موجود قبائل کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عرب کی تاریخ جاننے کے لیے کچھ تصنیفات جو سلاطینِ حیرہ کے ہاں محفوظ تھیں، ابن ہشام نے ان سے استفادہ کیا اور ان کا تذکرہ اپنی کتاب التیجان میں بھی کیا۔ اس کے علاوہ عرب معاشرے میں زبانی روایات بھی تاریخ کا ایک موثر ماخذ سمجھی جاتی تھیں۔ عرب شاعری بھی عرب کی تاریخ جاننے میں کافی مدد فراہم کرتی ہے۔[19]

عرب کی تاریخ میرے مقالے کے موضوع سے کافی حد تک ہٹ کر ہے، اس لیے میں یہاں اس کا مختصر تذکرہ کروں گا۔

علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب اقوام اور قبائل کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

عربِ بائدہ: وہ قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عربِ عاربہ (بنو قحطان): وہ عرب جو جزیرۃ العرب کے اصل باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن یمن تھا۔

عربِ مستعربہ (بنو اسماعیل): وہ قبائل جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور حجاز میں آباد تھے۔ انھیں عدنانی قبائل بھی کہا جاتا تھا، اور یہ عرب کے اصلی باشندے سمجھے جاتے تھے۔

---

[19] سیرت النبی ﷺ تالیف علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، ناشر محمد سرور عاصم، سن اشاعت 2012، مکتبہ اسلامیہ لاہور

عرب میں قدیم مذاہب

عرب میں قبل از اسلام بھی کئی مذاہب موجود تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مشرکانہ عقائد رکھنے والے لوگ بھی پائے جاتے تھے (جیسے قریش)۔ جزیرہ نما عرب میں عیسائیت، یہودیت اور زرتشتی مذہب کے ماننے والے لوگ اپنے عقائد کی بنیاد پر ایک علیحدہ طرزِ زندگی گزار رہے تھے۔ اس علاقے میں عیسائیت عرب تاجروں کے ذریعے قائم ہوئی، جنھوں نے یروشلم میں عیسائی پادریوں سے تعلیم حاصل کی۔ جنوبی عرب کے کئی علاقے، خاص طور پر نجران، عیسائیت کا ایک اہم مرکز تھے[20]۔

اسی مضمون میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ عرب میں عیسائیت کا تعارف چوتھی صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ اس کی وجہ شہنشاہ تھیوڈوسیس کا وہ حکم تھا، جس کے مطابق عیسائیت کو پوری رومی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا تھا۔ سید مودودی کی کتاب سیرتِ سرورِ عالم میں اسلام سے قبل عرب معاشرے میں رائج مذہبی رجحانات اور عقائد پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ ان کے بقول، اسی دور میں یہودیوں کو زیر کرنے کی کوشش شروع ہوئی اور بڑے پیمانے پر ان پر ظلم و ستم بھی ڈھایا گیا، جس کی وجہ سے وہ دور دراز کے علاقوں میں چلے گئے، جن میں جزیرۃ العرب بھی شامل تھا۔

قرآن مجید میں یہودیوں، عیسائیوں کے ساتھ ساتھ صابئین اور مجوسیوں کا ذکر بھی میں ملتا ہے؛

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِــِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

[20] Demichelis,Marco.2021. *Arab Christian Confederations and Muhammad's Believers*

شَهِيْدٌ۔ (الحج ۲۲:۱۷)

جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابی، اور نصاریٰ، اور مجوس، اور جن لوگوں نے شرک کیا، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کردے گا، ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے۔

سیرت انسائیکلوپیڈیا میں بڑی تفصیل سے اسلام سے قبل عرب میں مذہبی رجحانات اور عقائد پر لکھا ہوا ملتا ہے۔ سیرت انسائیکلوپیڈیا کے مطابق، عرب کے عام باشندے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوت اور تبلیغ کے نتیجے میں دینِ ابراہیمی کے پیروکار بن گئے تھے۔ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے اور کسی بھی طرح کا شرک نہیں کرتے تھے۔

پھر ایک شخص نے شام سے ایک بت لاکر کعبہ کے اندر نصب کر دیا اور لوگوں کو اس کی پوجا کی دعوت دی۔ پہلے بت کا نام ''ہبل'' تھا۔ بعد میں بت پرستی کا رواج بڑھتا چلا گیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب کعبہ کو بھی بتوں سے بھر دیا گیا۔سیرت انسائیکلوپیڈیا میں ان بتوں کی تفصیلات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ عرب ان بتوں کا طواف بھی کرتے تھے اور ان کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوتے تھے۔ وہ بتوں کو قربانیاں بھی پیش کرتے تھے۔ اس بات کا ذکر قرآنِ پاک میں بھی ملتا ہے۔

سورۃ الانعام میں اس بات کا ذکر ملتا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (الانعام ۶:۱۲۱)

ترجمہ: اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں لیکن اگر تم نے اُن کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو

سورۃ الانعام میں یہ بھی کہا گیا ہے

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (الانعام ۶:۱۳۶)

اِن لوگوں نے اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے پھر جو حصہ ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ!

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب، جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوت پر اسلام سے روشناس ہوئے اور اللہ کی وحدانیت پر مکمل یقین رکھتے تھے، ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بت پرست ہو گئے اور مشرک بن گئے۔ اس کے بعد عرب میں یہودی بھی آباد ہوئے۔ سیرت انسائیکلو پیڈیا کے مطابق، ۷۲۲ قبل مسیح میں جب شمالی فلسطین کی یہودی ریاست اسرائیل کو تباہ کیا گیا، اور اس کے بعد بابل کے بادشاہ بخت نصر نے دوبارہ یروشلم کو برباد کر دیا، تو یہودیوں کی ایک بڑی جماعت فلسطین چھوڑ کر حجاز کے شمالی علاقوں میں آ بسی۔ انھوں نے یثرب، خیبر اور تیما میں اپنی بستیاں بسائیں اور قلعے بھی تعمیر کیے۔ یہی تارکینِ وطن یہودی یمن میں بھی یہودیت کے پھیلاؤ کا سبب بنے۔

ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں یہودیوں کے چار مشہور قبیلے موجود تھے: بنو نضیر، بنو مصطلق، بنو قریظہ اور بنو قینقاع۔ اسی دور میں یمن میں یہودیت کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ سیرت انسائیکلو پیڈیا میں عرب میں عیسائیوں کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب نجران پر حبشیوں کا تسلط ہوا تو وہاں عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی۔ نجران میں مکہ معظمہ کی طرز پر ایک کلیسا بھی بنایا گیا تھا، جسے اہلِ نجران "کعبہ" کہتے تھے۔ عرب کے مشرکین بھی اس کلیسا کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔ اس طرح یمن میں ایک طرف یہودی آباد تھے، تو دوسری طرف عیسائی بھی ایک بڑی تعداد میں رہتے تھے۔

عرب کے شمال میں رومی علاقوں کی ہمسائیگی کی وجہ سے یہاں عیسائیت کو فروغ ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ عرب میں مجوسی مذہب کے ماننے والے بھی موجود تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر فارس (یعنی ایران) کے قریبی علاقوں میں آباد تھے، جن میں عراق اور بحرین شامل ہیں، مگر ان کی تعداد کافی کم تھی۔ اسی طرح صابئین (ستارہ پرست قوم) کی عبادت گاہوں کے آثار بھی ملتے ہیں، جس کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک معقول تعداد میں یہاں موجود تھے۔ اس بارے میں الرحیق المختوم میں بھی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

قریشِ مکہ معظمہ اور دینِ ابراہیمی

اس کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ قریشِ مکہ، باوجود اس کے کہ وہ بہت سے بتوں کی پوجا کرتے تھے اور ان کے عقائد میں کئی تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں، پھر بھی انھوں نے دینِ ابراہیمی کو مکمل طور پر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بیت اللہ کی تعظیم بھی کرتے تھے، طواف بھی کرتے تھے، حج و عمرہ بھی ادا کرتے تھے اور حاجیوں کی میزبانی بھی کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ، انھوں نے بہت ساری بدعات بھی ایجاد کر رکھی تھیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، پاسبانِ

خانۂ خدا ہیں اور مکہ کے باشندے ہیں۔ جو مرتبہ ہمیں حاصل ہے، وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اسی بنیاد پر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو ہمارے حقوق ہیں، ویسے کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے انھیں اپنے اوپر فخر بھی تھا، اور وہ باقی سب لوگوں سے اپنے آپ کو کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ ان کی برتری کو دیگر عرب قبائل تسلیم بھی کرتے تھے۔

مکہ میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ وہ لوگ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ اپنے بچوں کو شہر سے باہر دیہات میں بھیجتے تھے تاکہ وہ صحیح عربی سیکھ سکیں[21]۔

قدیم عرب اور بین الاقوامی تجارت

عرب کے شمال میں شام اور اس سے ملحقہ علاقے موجود تھے، جب کہ اس کے جنوب میں یمن واقع تھا۔ دونوں ہی مرکزی عرب سے زیادہ خوشحال تھے اور ان علاقوں میں کئی ریاستیں بھی موجود تھیں۔ عرب، تجارت کی غرض سے، ان دونوں ہی علاقوں کی طرف سفر کرتے تھے۔ شمال کی طرف سفر موسمِ گرما میں ہوتا تھا اور جنوب کی طرف سفر موسمِ سرما میں۔

اس کے علاوہ، عرب تجارت کی غرض سے کئی دیگر ممالک میں بھی جاتے تھے، اس طرح ان کے کئی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ کیا عربوں کے یہ بین الاقوامی تعلقات، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے پھیلاؤ میں کوئی اہم کردار ادا کر سکے؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

[21] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، عبداللہ اکیڈمی، 2016

بعثت سے قبل، عرب تجارت کی غرض سے کن کن علاقوں میں جایا کرتے تھے ؟

قرآن میں سورت القریش میں قریشِ مکہ کی تجارت بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ(القریش۱۰۶:۲)

(یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس

اس کی تشریح کرتے ہوئے سید مودودیؒ فرماتے ہیں:

''گرمی اور جاڑے کے سفروں سے مراد یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں قریش کے تجارتی سفر شام و فلسطین کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ ٹھنڈے علاقے ہیں، اور جاڑے کے زمانے میں وہ جنوبی عرب کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ گرم علاقے ہیں'' (تفہیم القرآن سورۃ القریش کی تشریح)۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ۔ (العنکبوت۲۹:۶۵)

جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس سے دُعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ انھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

اس آیت سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ، جنھیں مخاطب کر کے یہ بات کہی جارہی تھی، وہ بحری سفر سے بھی آگاہ تھے۔ان کے بحری سفر صرف تجارت کی غرض سے ہوتے تھے۔اہلِ عرب، ایشیا اور افریقہ کے دور دراز ممالک تک تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔اس کا ایک مختصر تذکرہ کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب، دنیا کے ایک بڑے حصے سے واقف تھے۔اسی بنا پر جب آپ ﷺ نے

اپنے اصحابؓ، جو عرب تھے، کو اپنا پیغام دے کر دوسرے ممالک میں بھیجا، تو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ عربوں کی اسی عالمی واقفیت نے، آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری میں کس قدر اہم کردار ادا کیا، اس کا تذکرہ اگلے صفحات میں کیا جائے گا۔

تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ عربوں نے عرب سے باہر کسی قوم سے جنگ کی ہو۔ اسی وجہ سے، اس وقت کی دونوں بڑی طاقتوں (روم اور فارس) سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ دونوں ہی سے تجارت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ، ان کا افریقہ میں بھی آنا جانا تھا۔

اہلِ عرب: عرب سے باہر

پی کے جین نے عربوں کی دیگر ممالک میں آمد و رفت کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے۔[22]

THE ROLE OF THE ARAB TRADERS IN WESTERN INDIA DURING EARLY MEDIEVAL PERIOD

وہ اپنے مضمون میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ کئی ممالک کی معیشت کی ترقی میں عرب تاجروں نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ اسی وجہ سے، بہت سے ممالک میں وہ نقل مکانی کر کے مستقل طور پر رہنے بھی لگے، جس کے نتیجے میں ان علاقوں میں انھوں نے اپنی ریاستیں بھی قائم کیں۔

---

[22] Jain, V. K. (1978). THE ROLE OF THE ARAB TRADERS IN WESTERN INDIA DURING EARLY MEDIEVAL PERIOD. Proceedings of the Indian History Congress, 39, 285–295. http://www.jstor.org/stable/44139363

پی کے جین مزید لکھتے ہیں:

اسلام سے پہلے بھی مشرق بعید کے ممالک، جنوبی ایشیا، اور مشرق وسطیٰ کے بے شمار ممالک میں عربوں کا آنا جانا تھا، جن میں خاص طور پر ایران، ہندوستان، انڈونیشیا، اور سری لنکا قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، مشرقی چین کا وہ علاقہ جو سمندر کے قریب واقع ہے، وہاں بھی عربوں کے اسفار کے نشانات ملتے ہیں۔ اس طرح، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ممالک کی معاشی ترقی میں عربوں نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

جین مزید لکھتے ہیں کہ:

ان علاقوں میں عربی میں لکھی ہوئی بہت ساری عبارتیں بھی ملی ہیں، جو تیرہویں صدی میں دریافت ہوئیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں، یعنی چین کی مشرقی سرحد کے قریب سمندر کنارے واقع شہروں میں، عربوں کے جہاز آتے تھے۔ ان کے مطابق، اس دور میں سمندری سفر خشکی کے مقابلے میں آسان تھا، جس کی وجہ سے کئی مقامات پر سمندروں کے کنارے قبل از اسلام کے دور کے عربوں کی آمد ورفت کے آثار ملتے ہیں۔

اسی طرح، کیرالا (ہندوستان کے جنوب مغرب میں واقع ایک صوبہ، جسے کیرلا بھی لکھا جاتا ہے) میں ایک مسجد کا ذکر بھی ملتا ہے، جو چیرامان مسجد کے نام سے جانی

جاتی ہے۔اس مسجد کے بارے میں کیرالا کی سرکاری ویب سائٹ پر تفصیل سے لکھا گیا ہے،اوراس کی کئی تصاویر بھی موجود ہیں[23]۔

سرکاری طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد آپ ﷺ کے دور میں ہی تعمیر ہو گئی تھی۔اس وقت،یعنی اسلام سے پہلے بھی عرب یہاں آیا کرتے تھے۔اور بعد میں،جب عرب مسلمان ہوئے اور یہاں آئے،تو یہاں کے بادشاہ نے اسلام میں دلچسپی لی۔یہاں کے بادشاہ نے عرب مسلمانوں کو اپنی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی۔کیرالا ٹورزم کے مطابق،اس مسجد کی تعمیر ۶۲۹ء میں ہوئی تھی اور یہ آج تک آباد ہے۔

عربوں کے ہاں حبشی غلاموں کی تجارت بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ افریقہ تک بھی جاتے تھے۔اس کے علاوہ،جب آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا،تو اس وقت مشرکینِ مکہ بھی حبشہ میں موجود تھے،جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عرب افریقہ تک بھی جاتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ (النحل۱۶:۴۱)

جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے،کاش وہ جان لیں۔

اس آیت کی تفسیر سید مودودی نے کچھ اس طرح بیان کی ہے؛

یہ اشارہ ان مہاجرین کی طرف ہے جو کفار کے ناقابلِ برداشت مظالم سے تنگ آکر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔منکرینِ آخرت کے

[23] https://www.muzirisheritage.org/cheraman-juma-masjid.php

اعتراض کا جواب دینے کے بعد، اچانک مہاجرینِ حبشہ کا ذکر چھیڑنے میں
ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ اس کا مقصد کفارِ مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ
"ظالمو! یہ جفاکاریاں کرنے کے بعد تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ کبھی تم سے
باز پُرس نہ ہوگی اور مظلوموں کی دادرسی کا وقت کبھی نہیں آئے گا؟

یہاں اس واقعے کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جس قوم میں آپ ﷺ کی پیدائش ہوئی اور جہاں آپ ﷺ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا، وہ ایک وسیع دنیا میں جانی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اسلام کی دعوت کو عرب سے باہر پہنچانے میں بے حد مدد ملی۔

حالیہ دنوں میں جنوبی ہندوستان کے عیسائیوں اور عربوں کے درمیان نسبی تعلق کی تلاش کے لیے ایک تحقیقی منصوبہ شروع کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد جنوبی ہندوستان کے علاقے کیرلا میں بسنے والے عیسائیوں کے ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے ان کے آباؤاجداد کے بارے میں جاننا ہے۔[24]

ہندوستان کے شہر حیدرآباد میں یمنی عربوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے، جو کئی صدیوں قبل یہاں آکر بسے تھے۔ وہ کب سے یہاں آباد ہیں، اس بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں، تاہم یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ان کے آباؤاجداد کا تعلق یمن سے تھا۔[25]

اب تک کی گئی بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سمندر کنارے آباد عرب،

[24] https://www.nasrani.net/2007/02/18/familytree-syrian-christians-dna-project/
[25] https://english.alarabiya.net/features/2018/12/13/Hadhramis-and-a-slice-of-Yemen-in-India-s-Hyderabad

بحری سفر کے ماہر تھے اور مشرق و مغرب میں دور تک سفر کرتے تھے۔ ان کی یہی مہارت بعد میں اسلام کی ترویج کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوئی۔ تاریخی حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط تک شمالی افریقہ میں اسلام کی دعوت پہنچ چکی تھی۔ بعدازاں، اٹھویں صدی کے آغاز میں ہی عربوں نے اسپین پر قبضہ کر لیا تھا اور دریائے سندھ تک ان کی فوجیں پہنچ چکی تھیں۔ اس طرح صرف ایک صدی کے اندر مسلمان تین براعظموں—ایشیا، افریقہ، اور یورپ—تک پہنچ چکے تھے[26]۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ عرب، جہاں آپ ﷺ کی بعثت ہوئی، پہلے ہی دنیا کے مختلف حصوں سے واقف تھے، جس کی وجہ سے انھیں ان علاقوں کو فتح کرنے میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

***

[26] Department of the Arts of Africa, Oceania, and the Americas. "*Trade and the Spread of Islam in Africa.*" In Heilbrunn Timeline of Art History. New York: The Metropolitan Museum of Art, 2000. http://www.metmuseum.org/toah/hd/tsis/hd_tsis.htm (October 2001)

عرب معاشرہ اور اس کی نفسیاتی ساخت

عرب کی قدیم اور جدید تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ عربوں کو ہمیشہ مختلف چیلنجز کا سامنا رہا ہے، جن میں غیر ملکی حملے، نوآبادیاتی تسلط، اور سماجی عدم استحکام شامل ہیں۔ وہ ہر دور میں ثابت قدم رہے اور جبر کے خلاف ڈٹ کر مزاحمت کرتے رہے، جو ان کی ہمت اور بہادری کو ظاہر کرتا ہے۔ عرب ثقافت میں اپنے اسلاف کی کہانیاں بے حد شوق سے بیان کی جاتی ہیں، جن میں ہمت، مقابلہ، بدلہ، اور عزت و وقار کی ہر قیمت پر حفاظت سرِ فہرست ہوتی ہے۔ ان کا ادب، شاعری، اور لوک داستانیں بھی انھی موضوعات سے بھرپور ہیں۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے عرب افراد اور گروہ سماجی انصاف، مساوات، اور انسانی حقوق کے لیے لڑتے رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے دیگر قبائل کے ساتھ کس طرح معاملات طے کیے، ان کی حکمت عملی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس دور کے عرب معاشرے پر نظر ڈالی جائے۔ ان کے طرزِ زندگی، تہذیب و تمدن، اور رسم و رواج کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی حکمت عملی مرتب کی، جو عرب سماج کی خصوصیات سے ہم آہنگ تھی۔

کتاب کے اس حصے میں اسی موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

قبیلہ اور اس کا احترام: اہلِ عرب کی ایک نمایاں خوبی

نسل کی بنیاد پر قائم قبیلے کا حجم چند سو افراد سے لے کر ہزاروں تک ہو سکتا تھا، اور عام طور پر ان کے نام ان کے آباؤ اجداد کے کسی مشہور اور اہم شخصیت کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ ایک ہی قبیلے کے لوگ ان اصولوں کی پابندی کرتے تھے، جو قبیلے نے طے کیے ہوتے تھے۔ قبائل آگے مزید کئی شاخوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ قدیم دور میں اہلِ عرب کے لیے خاندان یا قبیلہ سب سے اہم سماجی ادارہ تھا۔ قبیلے کی تشکیل عام طور پر نسل و نسب کی بنیاد پر ہوتی تھی، تاہم بعض اوقات یہ علاقائی وابستگی کے تحت بھی وجود میں آ جاتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت نسل و نسب کو ہی دی جاتی تھی۔ ایک بڑے قبیلے کے اندر کئی ذیلی قبیلے بھی موجود ہوتے تھے، جیسے قریش قبیلہ، جس کی مختلف شاخیں تھیں۔ قبیلے کے ساتھ وفاداری کو انتہائی اہم سمجھا جاتا تھا۔ روزمرہ کے معاملات ہوں یا دوسرے قبائل کے ساتھ تعلقات، ہر صورت میں قبیلے کے مفاد کو اولین حیثیت دی جاتی تھی۔ ایک ہی جگہ تین یا اس سے زیادہ نسلوں کا اکٹھے رہنا عام بات تھی۔

عرب عموماً اپنے قریبی رشتہ داروں، جیسے بہن بھائیوں اور دیگر عزیزوں کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ قبیلے سے وفاداری نبھانے کے لیے اپنی ذاتی ضروریات اور خواہشات کو پسِ پشت ڈال دیتے تھے۔ اس کی ایک بڑی مثال جنگِ بدر میں دیکھی جا سکتی ہے، جہاں قریشِ مکہ کے کئی افراد اپنے ہی والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف تلوار لے کر میدانِ جنگ میں آئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور ان کے بیٹے کی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے کی مثال اسی قبیلہ پرستی کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ اہلِ عرب کا عمومی رویہ تھا کہ وہ جہاں تک ممکن ہوتا، اپنے ذاتی مفادات کو قبیلے کے اجتماعی مفادات پر قربان کر دیتے تھے۔ قبیلے کی عزت و وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ہر فرد کو ہمیشہ محتاط رویہ اختیار کرنا پڑتا تھا، کیونکہ کسی بھی

فرد کی انفرادی غلطی کا اثر پورے قبیلے پر پڑتا تھا۔ اس میں مالی و سماجی حیثیت کا نقصان، ملک بدری اور دیگر سنگین نتائج شامل ہو سکتے تھے۔

شعبِ ابی طالب کا واقعہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ جب نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو قریشِ مکہ نے آپؐ کا شدید معاشرتی بائیکاٹ کیا، جس کی پاداش میں آپؐ کے قبیلے، بنو ہاشم، کو کئی سال تک معاشرے سے الگ تھلگ رہنا پڑا۔ یہ سب کچھ ہاشم خاندان کے تمام افراد نے صبر واستقامت کے ساتھ برداشت کیا، کیونکہ عرب معاشرتی روایات کے مطابق قبیلے کے ایک فرد کا عمل پورے قبیلے کا عمل سمجھا جاتا تھا اور سزا بھی پورے قبیلے کو دی جاتی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرب معاشرے میں فرد کی نسبت قبیلے کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ قبیلے کے معاملات اس کے سرکردہ افراد کے ذریعے طے پاتے تھے، اور قبیلے کے سردار کا فیصلہ ہی حتمی اور متفقہ فیصلہ سمجھا جاتا تھا[27]۔

عرب معاشرے میں بڑی عمر کے افراد کا احترام

عرب معاشرے میں ہمیشہ سے بزرگوں کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا رہا ہے، اور یہ روایت آج بھی قائم ہے۔ قبیلے میں کسی فرد کی حیثیت کا تعین اکثر اس کی عمر کے مطابق کیا جاتا تھا۔ بچوں کو بچپن ہی سے والدین کی اطاعت کا درس دیا جاتا، جو ان کی ابتدائی تربیت کا اہم حصہ ہوتا تھا۔ اس اصول کی خلاف ورزی کو نہایت سنگین تصور کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، عرب خاندان میں حتمی ذمہ داری بزرگ مرد پر عائد ہوتی تھی، اور وہی قبیلے کی رہنمائی کرتا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد سب سے بڑا بیٹا خاندان کا سربراہ اور بزرگ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ عرب معاشرے

---

[27] Sania Hamady, *Temperament and Character of the Arab*,Twayne Publishers, 1960Original from the University of Michigan

میں آباؤاجداد کی یاد کو زندہ رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔اس کا ایک نمایاں طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنے والد اور اجداد کے نام شامل کرتے تھے۔ خاندانی وراثت بھی عام طور پر مردوں کے ذریعے ہی آگے بڑھتی تھی، اور ہر عرب کا ایک ذاتی نام ہوتا تھا، جبکہ دوسرا نام عموماً اس کے والد سے منسوب ہوتا تھا[28]۔

اہلِ عرب کے نزدیک قبیلہ ان کی سماجی شناخت کا سب سے مضبوط مرکز تھا۔ لوگ فخر محسوس کرتے کہ ان کا قبیلے سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ عام طور پر، مشکل وقت میں سب سے پہلے اپنے خاندان اور قبیلے سے مدد طلب کرنا ایک معمول کا حصہ تھا اور یہ تعلق ان کے لیے ایک بڑا حوصلہ فراہم کرتا تھا۔ عربوں کے لیے خاندان اور قبیلہ زندگی بھر ایک بنیادی اور کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ قبیلے سے محبت اور وابستگی نہ صرف سماجی بلکہ اقتصادی اور سیاسی ترقی کے لیے بھی بے حد اہم سمجھی جاتی تھی۔ کئی مواقع پر قبیلے کی عصبیت(tribal loyalty) کسی بھی دوسری قسم کی وابستگی سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ عرب قبائل کی خصوصیات ان کی تاریخ، ثقافت اور سماجی ڈھانچے سے گہرے طور پر جڑی ہوئی ہیں۔ جدیدیت اور عالمگیریت کے باوجود، کئی قبائل آج بھی اپنی روایات اور اقدار کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور اپنی عرب شناخت کی حفاظت کر رہے ہیں، جو ان کی قابلِ تحسین خصوصیت ہے۔

بہادری اور بڑا خاندان

قبائلی معاشرے میں کسی بھی فرد کی طاقت اور حیثیت کا دارومدار اس کے قبیلے کی افرادی قوت پر ہوتا تھا۔ وہی عرب زیادہ عزت دار سمجھا جاتا تھا جس کی کثیر اولاد، خاص طور پر بیٹے، ہوتے۔ بیٹوں کے ذریعے ہی نسب آگے بڑھتا تھا۔اسی طرح، مختلف

---

[28] MACKINTOSH-SMITH, T. (2019). *Arabs: A 3,000-Year History of Peoples, Tribes and Empires*. Yale University Press (30)

مواقع پر اپنے خاندان کی حفاظت کرتے ہوئے بہادری کا مظاہرہ کرنا بھی ایک اہم وصف سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ آج کے دور میں زیادہ تر عرب شہری علاقوں میں آباد ہو چکے ہیں، لیکن یہ روایت اب بھی اہم سمجھی جاتی ہے۔ تاہم، نئی نسل عمومی طور پر زیادہ اولاد کے حق میں نہیں ہے۔

قدیم عرب روایات کے مطابق، خاندان کی تمام تر ذمہ داری بزرگ مرد کے کندھوں پر ہوتی تھی۔ قبیلے کے تمام افراد کو اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ تاہم، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بزرگ فیصلہ کرنے سے پہلے قبیلے کے سرکردہ افراد سے مشورہ کرتے اور اتفاقِ رائے کی بنیاد پر فیصلہ سازی کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ایک قابلِ ذکر بات ہے کہ عرب معاشرے میں بزرگ خواتین کی رائے کو بھی مردوں کے برابر اہمیت دی جاتی تھی، خاص طور پر شادی بیاہ جیسے گھریلو اور سماجی معاملات میں۔ بچوں اور ان کے بچوں کی شادیوں کے فیصلے اکثر بزرگ خواتین ہی کیا کرتی تھیں۔

بچوں کو اس وقت تک اپنے والدین کی مکمل اطاعت کرنی ہوتی تھی جب تک وہ بالغ نہ ہو جائیں۔ کسی نوعمر کی نافرمانی یا بغاوت کو سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، ہر فرد پر لازم تھا کہ وہ اپنے بوڑھے والدین کی دیکھ بھال کرے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھے، کیونکہ یہ معاشرتی اور اخلاقی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔

عزت اور غیرت

عزت اور غیرت اہلِ عرب کے لیے ہمیشہ سے بنیادی اقدار رہی ہیں، جن کی حفاظت کو وہ انتہائی اہم سمجھتے تھے اور اس کے لیے اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے۔ آج بھی یہ اوصاف ان کی روزمرہ زندگی میں نمایاں ہیں، اور وہ عام گفتگو، دوستانہ محافل، اور باہمی تعلقات میں ان کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ جب بھی

کوئی تنازعہ یا معاملہ درپیش ہو، اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کا دفاع کرنا مرد و عورت ہر ایک پر فرض سمجھا جاتا ہے۔ اہلِ عرب کا ماننا ہے کہ اگر ایک بار عزت اور غیرت پر کوئی حرف آجائے تو زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر حال میں ان اقدار کا تحفظ یقینی بناتے ہیں۔

عرب قبائلی ثقافت میں باہمی احترام کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ یہ احترام باہمی تعلقات، سماجی درجہ بندی اور برادری کے استحکام سے جڑا ہوا ہے۔ عرب معاشرے میں عزت، وفاداری، مہمان نوازی اور ثقافتی روایات جیسے اصول ماضی میں بھی نہایت اہم سمجھے جاتے تھے اور آج بھی انھیں خصوصی مقام حاصل ہے۔ قبائل کے اندر ہم آہنگی برقرار رکھنے اور برادری کے مضبوط تعلقات کو فروغ دینے کے لیے احترام کا شعور اور اس پر عمل بے حد ضروری سمجھا جاتا ہے۔

خاندانی نسب کا خیال

عربوں کے ہاں اپنے نسب کی حفاظت ہمیشہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں نہ صرف اس کا بے حد احترام کرتے ہیں بلکہ اس پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور آج بھی اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شادی کے معاملے میں خاص طور پر اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ شخص جس کے والدین دونوں کسی معزز اور معروف نسب سے تعلق رکھتے ہوں، اسے معاشرے میں نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ نسب، عرب ثقافت کی اساس ہے، جو باہمی ہمدردی، اجتماعی شناخت اور نسلی تسلسل کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ خاندان سے وابستہ گہری اقدار نہ صرف انفرادی رویوں پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ وسیع تر معاشرتی اصولوں کو بھی تشکیل دیتی ہیں۔ اس

حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہوتا ہے کہ جدیدیت اور عالمی سماجی تبدیلیوں کے باوجود، عرب معاشرے میں خاندان اب بھی ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی ثقافتی جڑوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔

عرب مہمان نوازی

عرب معاشرے میں مہمان نوازی ایک ایسا وصف ہے جس کے بارے میں بے شمار داستانیں مشہور ہیں۔ مہمان کے استقبال، اس کی خدمت کے لیے میزبان اپنی بساط سے بڑھ کر کوشش کرتا تھا اور یہ روایت آج بھی زندہ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی معقول وجہ کے بغیر مہمان نوازی سے انکار کر دیتا تو معاشرہ اسے بے حد معیوب سمجھتا تھا، اور وہ فرد ہمیشہ کے لیے مہمانوں کی نظر میں اپنی عزت کھو بیٹھتا تھا۔ یہ بھی ایک اہم روایت تھی کہ کھانے کے دوران اجتماعی طور پر ایک ہی برتن میں مل کر کھایا جاتا تھا۔ اس دور میں عرب دنیا میں انفرادی طور پر کھانے پیش کرنے کا رواج بہت کم پایا جاتا ہے، اور صدیوں پہلے تو اس کا تصور بھی ناپید تھا۔

عرب معاشرے میں مہمان کا احترام ان کی ثقافتی شناخت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، جو عزت، سخاوت اور برادری کی گہری اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ مہمان نوازی نہ صرف میزبان کی شرافت اور کشادہ دلی کی علامت سمجھی جاتی ہے بلکہ یہ سماجی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے، خاندانی روابط کو مضبوط بنانے اور فرقہ وارانہ تعلقات کو استوار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

معاہدوں کی پاسداری

اسلام کی آمد سے قبل بھی عرب، خصوصاً عدنان کی اولاد، فطرتاً سخی اور مہمان نواز تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ معاہدے کی خلاف ورزی کو ایک سنگین جرم تصور

کرتے تھے۔ ان کے نزدیک عہد شکنی ناقابل معافی جرم تھا، اور اس کی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی دعوت کے دوران عربوں کی اسی خصوصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے حکمتِ عملی اختیار کی۔ آپ ﷺ نے مختلف قبائل سے معاہدے کیے، اور تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے بیشتر قبائل نے ان معاہدوں کی مکمل پابندی کی۔

تاریخی شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب ثقافت میں معاہدوں کی پاسداری محض ایک سماجی روایت نہیں تھی بلکہ یہ ان کی عزت، مذہبی عقائد، اعتماد اور معاشرتی اقدار کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی تھی۔ اس وصف کی بدولت نہ صرف ان کے انفرادی تعلقات مضبوط ہوتے تھے، بلکہ معاشرے میں ہم آہنگی اور استحکام بھی قائم رہتا تھا۔

فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ معیار

عرب فصاحت و بلاغت میں بے مثال تھے، اور ان کی شاعری اس کی نمایاں دلیل ہے۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی ادب کا آغاز اسلام کے ظہور سے تقریباً دو سو سال قبل ہو چکا تھا۔ عرب اپنی شاعری کے ذریعے اپنی قبائلی زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کرنے لگے تھے، اور بعض اہلِ علم کے نزدیک عربی شاعری درحقیقت عرب کی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ شاعری نہ صرف عربوں کے لیے فخر کا باعث تھی بلکہ ایک تفریحی ذریعہ بھی سمجھی جاتی تھی[29]۔

جب قرآنِ مجید نازل ہونا شروع ہوا تو ابتدا میں عربوں نے اسے محض ایک ادبی شاہکار کے طور پر پرکھنے کی کوشش کی۔ تاہم، قرآن نے انھیں چیلنج دیا کہ اگر وہ اپنی

[29] Sania Hamady, *Temperament and Character of the Arab*,Twayne Publishers, 1960Original from the University of Michigan

فصاحت و بلاغت میں واقعی بے مثال ہیں تو اس پائے کی کوئی آیت لے آئیں۔ وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے، جس سے قرآن کی برتری ثابت ہو گئی۔

عرب اور یادداشت

عربوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی غیر معمولی یادداشت تھی۔ وہ طویل گفتگو یا تحریر کو بآسانی حفظ کر لیتے تھے، اسی وجہ سے طویل قصائد اور اشعار از بر رکھنے کے ساتھ ساتھ نسب نامے یاد رکھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رحلت کے دو سے تین سو سال بعد تدوینِ حدیث کا کام شروع ہوا، تو بہت سے لوگوں کو طویل احادیث تک از بر تھیں، جو نسل در نسل محفوظ چلی آ رہی تھیں۔

عربوں کی یادداشت حیران کن حد تک مضبوط تھی، جو ان کی ثقافتی، تاریخی اور انفرادی تجربات کے حسین امتزاج کا مظہر تھی۔ ان کی زبانی روایات، ادب، تعلیم و تربیت کے انداز اور روزمرہ کی گفتگو سے بھی ان کی اس غیر معمولی ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ اپنی مضبوط یادداشت کے ذریعے اپنے ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھتے بلکہ اسے آنے والی نسلوں تک منتقل بھی کرتے تھے۔

یادداشت ان کے لیے محض ایک انفرادی صلاحیت نہیں تھی بلکہ اس نے ایک اجتماعی شعور کو بھی پروان چڑھایا، جس سے معاشرتی ہم آہنگی فروغ پائی اور ان کے اجتماعی رویے کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ یہی غیر معمولی حافظہ تھا جس کی بدولت اسلامی تعلیمات، احادیثِ نبوی اور دینی روایات محفوظ رہیں۔ بعد ازاں، انھی زبانی روایات کو جمع کر کے حدیث کی کتابوں کی تدوین عمل میں آئی، جو آج تک مستند ذرائع کے طور پر موجود ہیں۔

انتقام اور طویل جنگیں

عرب تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دشمن کو معاف کرنے میں عموماً پس و پیش سے کام لیتے تھے۔ تاریخ میں ان کی طویل المدتی جنگوں کے متعدد واقعات ملتے ہیں، جہاں بعض جنگیں پچاس سال تو بعض سو سال تک جاری رہیں۔ اکثر جنگیں نہایت معمولی اور چھوٹی باتوں سے شروع ہوئیں، مگر وقت کے ساتھ شدید تنازعات کی شکل اختیار کر گئیں۔ مدینہ کے اوس اور خزرج قبائل کی جنگ بھی کئی دہائیوں پر محیط رہی، جو اس وقت کے عرب معاشرے میں پائی جانے والی بدامنی اور انارکی کی واضح مثال تھی۔

اس عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عرب میں کوئی بااختیار مرکزی حکومت موجود نہیں تھی۔ عربوں کی خانہ بدوش طرزِ زندگی نے اس بے یقینی کے ماحول کو مزید تقویت دی۔ اکثر قبائل اپنے خاندانوں اور مویشیوں کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے، جہاں پانی اور سازگار آب و ہوا میسر آتی، وہیں اپنا عارضی مسکن بنا لیتے۔ علاوہ ازیں، ان کی نقل مکانی کی ایک اور اہم وجہ آپسی خانہ جنگیاں بھی تھیں، جو معمولی تنازعات سے شدت اختیار کر جاتی تھیں۔

عرب ثقافت میں اپنے یا اپنے خاندان پر ہونے والی کسی بھی ظلم و زیادتی کا بدلہ لینا ایک لازمی امر سمجھا جاتا تھا۔ اس روایت کی جڑیں غیرت، تاریخی پس منظر، مذہبی عقائد اور سماجی اصولوں سمیت مختلف عوامل سے وابستہ تھیں۔ اگرچہ وہ عزت کی بحالی کے لیے انتقام کو ضروری سمجھتے تھے، مگر ساتھ ہی ساتھ بعض مواقع پر معافی اور مفاہمت کی بھی کوشش کی جاتی تھی۔ عرب معاشرے میں بدلے کی روایت کو گہرائی

سے سمجھنے کے لیے ان کے انفرادی، ثقافتی اور تاریخی عوامل کو مد نظر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ یہی روایات ان کے اجتماعی طرزِ فکر اور معاشرتی ڈھانچے کی بنیاد تھیں۔

اب تک کی گفتگو سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عرب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ادب کے شاہسوار، ایک مکمل تہذیب کے وارث اور اعلیٰ انسانی اوصاف سے آراستہ قوم تھے۔ کسی بھی لحاظ سے انھیں غیر مہذب نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی زبان کی فصاحت، مہمان نوازی، اپنے عقیدے سے گہری وابستگی، بہادری، دلیری، معاہدوں کی پاسداری، غیر معمولی یادداشت، حسب و نسب کی حفاظت اور دیگر بیش بہا صفات نے انھیں دنیا میں ایک منفرد قوم کے طور پر متعارف کرایا۔

اگرچہ تعداد میں کم اور مالی و عسکری وسائل کے لحاظ سے محدود تھے، لیکن ان کی تجارت مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ افریقہ سے لے کر ایشیا تک ان کے تجارتی تعلقات استوار تھے، اور وہ اپنی دیانت داری کی بدولت کامیاب تاجر سمجھے جاتے تھے۔ بعض مورخین نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے قبل کے دور کو دورِ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ اس زمانے میں رائج کچھ ایسے اعمال کو قرار دیتے ہیں جو کسی بھی لحاظ سے قابلِ قبول نہ تھے، جیسے بچیوں کو زندہ دفن کرنا، برہنہ کعبے کا طواف، سودی لین دین، کمزوروں پر ظلم، بت پرستی، اور غرور و تکبر میں مبتلا رہنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان برائیوں کا وجود اپنی جگہ، لیکن ہر معاشرہ اچھائی اور برائی کا امتزاج ہوتا ہے۔ اسی طرح، عرب معاشرے میں بھی جہاں بہت سی مثبت اقدار تھیں، وہیں کچھ منفی رویے بھی پائے جاتے تھے۔

یہ تصور کرنا ممکن نہیں کہ اسلام کی آمد کے بعد ان میں اچانک کوئی غیر معمولی تبدیلی رونما ہو گئی۔ در حقیقت، ان میں یہ تمام خصوصیات قبل از اسلام ہی سے موجود تھیں، البتہ اسلام نے انھیں ایک نئی سمت، ایک مستحکم نظام اور ایک مرکزی قیادت

فراہم کی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی دیرینہ خوبیوں میں مزید نکھار آیا، ان کی کمزوریاں دور ہوئیں، اور وہ ایک مضبوط اور منظم قوم کی حیثیت سے ابھرے۔ انھی مثبت تبدیلیوں کے نتیجے میں وہ دنیا کے ایک وسیع حصے پر حکمرانی کرنے کے قابل ہوئے۔

عرب ثقافت میں شاعری، ادب، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ صدیوں سے مقبول ہیں۔ اسلام سے قبل بھی عربی شاعری کو اعلیٰ مقام حاصل تھا اور آج بھی اس عہد کے عربی ادب کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عرب دنیا کی تاریخ انتہائی پیچیدہ ہے، جس کی تشکیل میں مختلف سلطنتوں، تہذیبوں اور جغرافیائی وسیاسی واقعات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

آج کے دور میں عرب دنیا بھی دیگر معاشروں کی طرح شہری طرزِ زندگی کی طرف تیزی سے مائل ہو رہی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی، تعلیم، میڈیا، اور سفر کی آسان سہولتوں کے باوجود، عرب اپنے ثقافتی ورثے اور روایتی اقدار کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں، جس کا مشاہدہ معاشرے کے ہر طبقے، بادشاہ سے لے کر عام آدمی تک، کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مہمان نوازی، روایات کی پاسداری، اتحاد واتفاق، طویل دشمنی، انتقام، مزاحمت، ماضی سے گہرا تعلق، اور ثقافتی شناخت کا تحفظ عرب تہذیب کی چند نمایاں خصوصیات ہیں، جو صدیوں سے ان کی ثقافت کا لازمی حصہ رہی ہیں۔

***

خارجہ پالیسی اور سفارت کاری—قدیم سے جدید تک

آئندہ صفحات میں، میں موجودہ دنیا میں رائج سفارت کاری کے اصول وضوابط کا جائزہ لوں گا اور یہ واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تمام اصول، جنھیں آج عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے، کس طرح نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے چودہ سو سال قبل متعارف کروائے۔ آپ ﷺ نے ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر کامیاب سفارت کاری کے ذریعے محض دس سال کے مختصر عرصے میں ایک ایسی قوم، جس کی کوئی سیاسی یا معاشی شناخت نہ تھی، کو دنیا کے بہترین حکمرانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے چار بنیادی اصول بتائے جاتے ہیں: گفت و شنید کرنا، ایک دوسرے سے روابط کو مضبوط بنانا، خوشگوار تعلقات کو پروان چڑھانا اور اپنے مفادات کی حفاظت کرنا۔ یہ عمل صرف ملکوں کی سطح پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا اطلاق وہاں بھی ہوتا ہے جہاں صرف دو گروہ آپس میں کوئی معاملہ طے کرتے ہیں۔

سب سے پہلے، جدید دور میں معاہدوں کے حوالے سے اختیار کردہ طریقہ کار، موجودہ دور میں رائج سفارت کاری، مذاکرات، معاہدے، وفود کا تبادلہ، سفارت کاروں کے اختیارات، انسانی نفسیات اور سفارت کاری، خارجہ پالیسی کے بنیادی خدوخال، دوستی اور دشمنی کی حدود، اور کئی دیگر موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی جائے گی۔ اس میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ دورِ جدید میں مغرب نے اس میدان میں کیا کچھ سوچا اور ان اصولوں پر عمل کر کے دنیا کو کس طرح مسخر کیا۔ اس پر بھی بات ہو گی کہ ترقی یافتہ دنیا کے مفکرین نے اس میدان میں نئی راہیں کیسے استوار کی ہیں۔

کلاسیکل ڈپلومیسی کی ابتداء

کلاسیکی سفارت کاری (کلاسیکل ڈپلومیسی) کی ابتداء قبل مسیح میں ہوئی۔اس کی کئی مثالیں رومی سلطنت کے دور میں ملتی ہیں۔ سفارت کاری سے مراد ریاستوں کے درمیان گفت وشنید، مکالمے اور مواصلت کے ذریعے بین الاقوامی تعلقات کو منظم کرنے کے روایتی طریقے ہیں۔اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی اصطلاح ''ڈپلومیٹ''کا آغاز ہوا، جس کا مطلب ہے کسی بھی خود مختار ریاست کی جانب سے بات چیت کرنے کا مجاز شخص۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق ''ڈپلومیسی'' ایک فرانسیسی زبان کا لفظ ہے، جو قدیم یونانی زبان میں پائے جانے والے لفظ ''ڈپلوما'' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ''ایک تہہ شدہ دستاویز'' ہے۔بعد میں اس کے مفہوم میں کئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق،ڈپلومیسی کو یوں بیان کیا گیا ہے:[30]

Diplomacy, the established method of influencing the decisions and behaviour of foreign governments and peoples through dialogue, negotiation, and other measures short of war or violence

سفارت کاری (ڈپلومیسی) در حقیقت دو یا دو سے زائد فریقین کے درمیان کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کے لیے گفت وشنید، بات چیت،اور مختلف معاہدوں کے ذریعے کوشش کرنے کا عمل ہے۔

موجودہ دور میں جدید سفارتی طرزِ عمل کا آغاز یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد دیکھنے میں آیا۔تاہم،اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے قبل سفارت کاری کا وجود نہیں

---

[30] https://www.britannica.com/topic/diplomacy

تھا۔ میرے خیال میں، جس دن انسان نے قبیلوں کی شکل میں رہنا شروع کیا، سفارت کاری کا عمل اسی دن سے شروع ہو گیا تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپی ریاستی نظام کی بنیاد مضبوط ہونے کے بعد، اس کی ضرورت میں نمایاں اضافہ ہوا اور اسے باقاعدہ ایک علم کی شکل دی گئی۔

سفارت کاری کا مطلب خود مختار ریاستوں کے درمیان سرکاری تعلقات کے نظام کو قائم کرنا ہے۔ بیسویں صدی سے لے کر آج تک سفارت کاری کے عمل کو بڑے پیمانے پر اپنایا گیا ہے۔ اکثر ممالک نے دیگر ممالک میں اپنے سفارت خانے قائم کر رکھے ہیں، اور ان کے سفیر سفارت کاری کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سفارت کار ایک اہم عہدہ ہے، اور انتہائی ذمہ دار افراد کو اس عہدے کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔

اگرچہ سفارت کاری اور خارجہ پالیسی دو بالکل مختلف مفہوم رکھتے ہیں، بعض اوقات انھیں ایک دوسرے کا نعم البدل سمجھا جاتا ہے، جو درست نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سفارت کاری کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خارجہ پالیسی کی ترتیب کے دوران جو اہداف مقرر کیے جاتے ہیں، ان کی تکمیل کے لیے سفارت کاری ایک اہم طریقہ ہے۔

سفارت کار اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، جن میں خفیہ معلومات تک رسائی، حکومت مخالف عناصر سے رابطے، ذاتی تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے بااثر شخصیات تک رسائی، بین الاقوامی مکالمے اور گفت و شنید شامل ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خارجہ پالیسی کھل کر بیان کی جاتی ہے، جب کہ سفارت کاری ایک پوشیدہ عمل ہے اور اسے حتی الامکان خفیہ رکھا جاتا ہے۔ سفارت کاری کا بنیادی مقصد اپنی ریاست کو مضبوط کرنا اور اس کے مفادات کا تحفظ ہے۔ اس کام کے لیے سفارتی سرگرمیاں ہر وقت جاری رہتی ہیں۔ یہ امن کے زمانے میں بھی اتنی

ہی اہم ہوتی ہیں جتنی جنگ کے دوران۔ اس کے ساتھ ساتھ، سفارت کاری کا ایک اور اہم پہلو غیر ملکی اقوام کے ساتھ خیر سگالی کو فروغ دینا بھی ہے۔

جب بھی جنگ کی نوبت آتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سفارت کاری ناکام ہو چکی ہے۔ تاہم، اس کے باوجود جنگ سے بچنے اور اسے ختم کرنے میں سفارت کاری اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس موضوع پر مزید تفصیل اس تحریر کے دائرہ کار سے باہر ہے، البتہ یہ بات بے حد ضروری ہے کہ کامیاب سفارت کاری کے لیے کون سا طریقۂ کار اختیار کیا جانا چاہیے اور ایک سفارت کار کو کن خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے۔

اس وضاحت کے بعد، میں یہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے سفارت کاری کس انداز میں انجام دی، کیسے باصلاحیت سفارت کار تیار کیے، اور کس حکمت و بصیرت کے ساتھ ان کی تربیت کرکے اپنے مقاصد کے حصول کو ممکن بنایا۔

دورِ جدید سفارتی مشن

اقوامِ متحدہ نے اپنی کانفرنس، منعقدہ ویانا (۱۹۶۱ء)، میں سفارتی تعلقات سے متعلق "ویانا کنونشن" کو اپنایا۔ اس کنونشن کے مطابق تین طرح کے سفیروں کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

1. سفارت خانے کا سربراہ (سفیر)
2. سربراہِ سفارتی گروپ
3. کسی خاص مشن کا سربراہ

سفارتی تعلقات کے قواعد و ضوابط کے لیے ''ویانا کنونشن'' درحقیقت ایک بین الاقوامی معاہدہ ہے، جو دنیا کے آزاد ممالک کو سفارتی تعلقات کے حوالے سے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس معاہدے کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے اور اسے بین الاقوامی

سفارت کاری میں ایک بنیادی اور اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔اس کنونشن کے تحت، مشن کے تمام سربراہوں کو کئی مراعات کا حق دار بنایا گیا، اور ساتھ ہی انھیں مختلف قسم کے استثنیٰ بھی حاصل ہیں۔ ان میں سب سے اہم شق یہ ہے کہ سفارت کاروں کے ساتھ مہمانوں جیسا برتاؤ کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں، ان کے اہلِ خانہ کو بھی متعدد مراعات حاصل ہوں گی، جن میں گرفتاری سے استثنا بھی شامل ہے۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران بھی ان کے گھروں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

مزید برآں، سفارت کاروں کو ذاتی استعمال کی اشیا بغیر ٹیکس ادا کیے درآمد کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ کسی بھی فرد کو سفارت خانے میں بغیر اجازت داخل ہونے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ سفارت کار اپنے دفتر پر اپنی ریاست کا جھنڈا اور نشان لگا سکتا ہے، جبکہ ان کی گاڑیوں پر ایک شناختی علامت ہوگی تاکہ ان کی حفاظت کو یقینی بنایا جاسکے[31]۔

اسی طرح، سرکاری خط و کتابت، جسے ڈپلومیٹک بیگ کہا جاتا ہے، کو خفیہ رکھنے کا اختیار بھی سفیر کو حاصل ہوتا ہے۔ ہر سفارت کار کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ میزبان ملک میں اپنی حکومت کی پالیسیوں کو آزادی سے بیان کرسکے۔ تاہم، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سفارت کار سازگار ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے غیر شائستہ یا توہین آمیز زبان استعمال نہ کریں۔

یہ میزبان ملک کا حق ہے کہ وہ کسی بھی ملک کے سفیر کو ناپسندیدہ کردار کی بنیاد پر ملک چھوڑنے کا حکم دے سکتا ہے۔ سفیر کی رہائش گاہ، جسے عام طور پر سفارت خانہ کہا جاتا ہے، سفیر بھیجنے والے ملک کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی، سفارت خانہ بھیجنے والے

---

[31] Done at Vienna on 18 April 1961. Entered into force on 24 April 1964. United Nations, Treaty Series.

ملک کے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے، میزبان ملک کی حکومت کے سیاسی مخالفین بعض اوقات ان سفارت خانوں میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ کوئی بھی سفارت خانہ اپنی حفاظت کے لیے مسلح افراد نہیں رکھ سکتا۔ سفارت خانوں کی حتمی حفاظت میزبان ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات اس میں کوتاہی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی ایک مشہور مثال ۱۹۷۹ء میں ایرانی طلبہ کی جانب سے تہران میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ ہے۔ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے، لیکن پاکستان میں بھی ایک بار امریکی سفارت خانے پر طلبہ نے حملہ کیا تھا۔ حالیہ دور میں، سفیر کی تقرری سے پہلے، اس کا نام غیر رسمی طور پر میزبان ملک کو بھیجا جاتا ہے۔ اگر میزبان ملک کو کوئی اعتراض نہ ہو، تو سفیر کی تقرری کا باضابطہ عمل شروع کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل یہاں بیان کرنا ضروری نہیں۔

ایک کامیاب سفارت کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ گفت وشنید کا ماہر ہو، ثقافتی حساسیت سے آشنا ہو، جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہو، ذہانت کا مالک ہو، اچھے کردار کا حامل ہو، بین الاقوامی تعلقات کی گہری سمجھ رکھتا ہو، دیانتدار ہو اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ان خصوصیات کا حامل فرد ہی اپنے ملک کی مؤثر نمائندگی کر سکتا ہے اور پرامن و نتیجہ خیز بین الاقوامی تعلقات کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔

ویانا کنونشن کے مطابق، کسی بھی سفارتی مشن کی پانچ بنیادی ذمہ داریاں ہوتی ہیں:

1. میزبان ریاست میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنا۔
2. اپنے ملک کے مفادات کا تحفظ یقینی بنانا۔
3. میزبان ریاست کے ساتھ مذاکرات کرنا اور معاہدوں پر دستخط کرنا۔

4. میزبان ملک میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات اور پیش رفت سے اپنے ملک کو آگاہ کرنا۔

5. دونوں ریاستوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا اور ساتھ ہی اقتصادی، تجارتی، ثقافتی اور سائنسی تعلقات میں بہتری لانا۔

اب تک کی گئی بحث میں سفارت کاری کے بارے میں چند اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ بھی ضروری ہے کہ سفارت کاری کو قابلِ اعتماد بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ ایک سفیر کا قابلِ اعتماد، ایماندار اور منصف مزاج ہونا دونوں ممالک کے درمیان صحت مند تعلقات کے قیام اور استحکام میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک کامیاب سفیر میں یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ مذاکرات کے دوران مسائل کے حل کے لیے لچکدار مگر ثابت قدم رویہ اپنا سکے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک کامیاب سفارت کار نہ صرف بہترین نفسیات دان ہو بلکہ وہ میزبان ملک کی تاریخ، ثقافت، تہذیب و تمدن، طرزِ زندگی اور عوام کی پسند و ناپسند سے بھی گہری آگاہی رکھتا ہو۔

ہر ملک کے سفارتی عملے کو بیرونِ ملک اپنے ملک کی نمائندگی کے لیے ایسے افراد کی تلاش ہوتی ہے جو اس کام کا تجربہ اور صلاحیت، دونوں رکھتے ہوں۔ ایک سفارت کار میں صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت بھی موجود ہونی چاہیے۔ ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ سفیر کی قابلیت کے علاوہ اس کا نسلی، سماجی، اور جغرافیائی پس منظر بھی اہم ہوتا ہے۔ میزبان ملک کی زبان پر عبور حاصل ہونا ایک اہم ضرورت ہے، کیونکہ اس سے سفارت کاری میں مزید سہولت پیدا ہوتی ہے۔

ویانا کنونشن کی چند اہم دفعات درج ذیل ہیں:

- سفارتی مشن کی عمارت میں میزبان ملک کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

- سفیر کی اجازت کے بغیر کوئی بھی شخص سفارت خانے میں داخل نہیں ہو سکتا۔
- سفارتی مشن کی تمام دستاویزات مکمل طور پر محفوظ ہوتی ہیں، اور میزبان ملک کو ان تک کوئی رسائی حاصل نہیں ہوتی۔
- میزبان ملک اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ سفارت کار اپنے ملک سے آزادانہ طور پر رابطہ برقرار رکھ سکیں۔
- میزبان ملک کسی بھی سفارت کار کو گرفتار یا حراست میں نہیں لے سکتا، نہ ہی اس پر کوئی مقدمہ چلا سکتا ہے۔
- سفارت کار میزبان ریاست کے سول اور فوجداری قوانین کے دائرہ اختیار سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔
- سفارتی مشن کے آنے والے سامان پر ٹیکس اور دیگر محصولات سے استثنا حاصل ہوتا ہے۔
- میزبان ملک میں رہنے والے سفارت کاروں کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان کے افراد کو بھی تحفظات حاصل ہوتے ہیں۔

خارجہ پالیسی کے مقاصد

خارجہ پالیسی کا ایک اہم مقصد ریاست کے مفادات کو فروغ دینا، اس کی قومی آزادی، سلامتی، اور سالمیت کی حفاظت میں کردار ادا کرنا ہے۔ کسی بھی ملک کے حکمران پر یہ بنیادی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مؤثر خارجہ پالیسی تشکیل دے اور اس کے نفاذ کی نگرانی کرے۔ اس مقصد کے لیے ہر ملک میں "وزارتِ خارجہ" کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا جاتا ہے، جس کا نگران ایک وزیر مقرر کیا جاتا ہے۔ وزیرِ خارجہ کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بیرونِ ملک تعینات سفیروں کی رہنمائی کرے اور ان کی کارکردگی کی نگرانی کرے۔

آج کے دور میں ہر ملک اپنی مخصوص خارجہ پالیسی رکھتا ہے اور اس کے لیے بہترین افراد مختص کرتا ہے۔ ایک مؤثر خارجہ پالیسی ترتیب دینے کے لیے ''تھنک ٹینکس'' نامی ادارے قائم کیے جاتے ہیں، جو پالیسی سازی کے عمل میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کے چند اہم مقاصد میں ملکی دفاع و سلامتی، اقتصادی فوائد کا حصول، اور اپنے نظریات کی ترویج شامل ہیں۔

خارجہ پالیسی بناتے وقت اہم امور:

- ❖ پرامن تصفیے کے امکانات کو اجاگر کرنا اور اس حوالے سے پائے جانے والے شکوک و شبہات کو دور کرنا۔
- ❖ ملکی بنیادی مفادات اور مقاصد پر مضبوط قومی اتفاقِ رائے کا ہونا۔
- ❖ آزادی، قانون کی حکمرانی، اور بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری کو خاص اہمیت دینا۔
- ❖ ملکی خوشحالی کے لیے دیگر ممالک سے خوشگوار تعلقات قائم کرنا۔
- ❖ اپنے اتحادیوں اور دوست ممالک کی سلامتی کا تحفظ یقینی بنانا۔
- ❖ ممکنہ تنازعات سے بچنے کے لیے دوستانہ معاہدے کر کے محفوظ سرحدوں کو یقینی بنانا۔
- ❖ اپنے سے کمزور ممالک کی اقتصادی ترقی میں معاونت کرنا۔
- ❖ اپنے نظریات کی ترویج کرنا لیکن انھیں دوسروں پر زبردستی مسلط نہ کرنا۔
- ❖ بدلتے عالمی حالات کے مطابق اپنی خارجہ پالیسی کو ترتیب دینا۔
- ❖ عالمی سطح پر ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجی، اسلحہ سازی، اور نظریاتی تبدیلیوں کے بارے میں بہترین معلومات حاصل کرنا۔
- ❖ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں قومی نظریات، اقتصادی اور فوجی طاقت، اور سفارتی مکالمے کے اصولوں سے رہنمائی لینا۔
- ❖ اپنی قومی سلامتی کا دفاع، ملکی خوشحالی کو یقینی بنانا، اور انسانی حقوق اور اصولوں کو

فروغ دینا۔

- تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں درپیش چیلنجز کا عقل مندی سے سامنا کرنا۔
- اپنے بنیادی مفادات اور اقدار کا تحفظ کرتے ہوئے عالمی برادری سے قریبی رابطے میں رہنا۔
- دنیا کو یہ یقین دلانا کہ اس کی ریاست کا کسی دوسرے ملک کے خلاف جنگ بھڑکانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

پچھلے صفحات میں بیان کردہ نکات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں کن امور کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ موجودہ دور کے مفکرین اور پالیسی ساز اداروں نے ان رہنما اصولوں کو عصرِ حاضر کی بدلتی ہوئی دنیا کے تناظر میں پیش کیا ہے، اور ان ہی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنی خارجہ پالیسی ترتیب دی جاتی ہے۔

بین الاقوامی معاہدے

مختلف قوموں کے درمیان معاہدوں کا ہونا ایک صدیوں پرانی روایت ہے۔ اس موضوع پر موجودہ دور میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ معاہدے رسمی بھی ہو سکتے ہیں اور غیر رسمی بھی، لیکن ہر دو صورتوں میں فریقین پر ان کی پاسداری لازم ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسے معاہدے خود مختار ریاستوں کے درمیان طے پاتے ہیں، تاہم بعض اوقات یہ بین الاقوامی تنظیموں، کاروباری اداروں، اور غیر سرکاری تنظیموں کے مابین بھی کیے جاتے ہیں۔

جب دو ممالک کے درمیان کوئی معاہدہ طے پاتا ہے تو اسے "دوطرفہ معاہدہ" کہا جاتا ہے، جبکہ اگر یہ کئی ممالک یا گروہوں کے درمیان ہو تو "کثیر الطرفہ معاہدہ" کہلاتا ہے۔ ہر معاہدے کی کوئی نہ کوئی بنیادی یا مخصوص مقصد ہوتا ہے۔ کسی بھی معاہدے

تک پہنچنے سے پہلے ایک طویل مذاکراتی عمل شروع کیا جاتا ہے۔ مذاکرات مکمل ہونے کے بعد معاہدہ تحریر کیا جاتا ہے، جسے فریقین تسلیم کرتے ہیں اور ان کے نمائندے اس پر دستخط کرتے ہیں۔ عام طور پر معاہدے میں یہ شق شامل کی جاتی ہے کہ فریقین کی باہمی مشاورت اور رضامندی سے اس میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔

بین الاقوامی معاہدے عالمی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ در حقیقت، معاہدوں کی تاریخ کے بغیر دنیا کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ خاص طور پر جنگ بندی کے معاہدے سب سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل سمجھے جاتے ہیں۔ بعض حلقوں کا خیال ہوتا ہے کہ جنگ بندی کی صورت میں ان کی بقا کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ایسے معاہدے عام شہریوں اور املاک کے تحفظ، قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک، اور زخمی دشمنوں کے طبّی علاج جیسے کئی اہم امور کے لیے نہایت ضروری ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی معاہدوں کا ایک اور اہم پہلو "انسانی حقوق کا تحفظ" ہے۔ آج کے دور میں انسانی حقوق کی پاسداری ایک "معیاری اصول" بن چکی ہے، جو تقریباً ہر بین الاقوامی معاہدے کا حصہ ہوتی ہے۔ خاص طور پر غیر ملکی شہریوں کے ساتھ برتاؤ ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے، جس پر عالمی سطح پر مسلسل بحث جاری رہتی ہے۔

زیادہ تر معاہدے معروضی حالات کے مطابق ایک مخصوص شکل اختیار کر لیتے ہیں، تاہم ان کی کامیابی کا سب سے اہم پہلو طے شدہ منصوبے کے مطابق ان پر مؤثر عمل درآمد ہے۔ یہ امر کسی بھی معاہدے کی پائیداری اور اس کے مطلوبہ نتائج کے حصول میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی بھی معاہدے کے عمومی مقاصد بیان کرنے کے بعد فریقین متفقہ شرائط پر گفتگو کرتے ہیں۔ اگر معاہدہ کسی مخصوص مدت کے لیے کیا جارہا ہو، تو اس کا ذکر بھی معاہدے میں شامل کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی معاہدہ دائمی نہیں ہوتا، اسی لیے ہر معاہدے میں ایک ایسی شق شامل کی جاسکتی ہے جو فریقین کو اسے ختم کرنے کا اختیار دے۔ معاہدے کی توثیق بھی ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے، جس کے لیے گواہوں کا

انتظام کیا جاتا ہے۔ مقام اور تاریخ درج کرنے کے ساتھ ساتھ فریقین کے دستخط لیے جاتے ہیں اور مہر ثبت کی جاتی ہے۔

معاہدے مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں؛ کچھ کثیر الطرفہ اور کچھ دوطرفہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، کچھ معاہدے سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں، جن میں امن معاہدے، اتحادی معاہدے، علاقائی معاہدے، اور تخفیفِ اسلحہ سے متعلق معاہدے شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح، بعض تجارتی معاہدے بھی ہوتے ہیں، جن میں محصولات اور دیگر اقتصادی امور پر بات کی جاتی ہے۔ کچھ معاہدے بین الاقوامی تنظیموں، یونینوں، اور خصوصی ایجنسیوں کے قیام اور ان کے نظم و نسق کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ، جرائم سے متعلق معاہدے بھی کیے جاتے ہیں، جیسے مجرموں کی حوالگی کے معاہدے۔ انصاف سے متعلق معاہدے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، جن میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے مشترکہ کوششوں پر اتفاق کیا جاتا ہے۔ اسی طرح، بعض معاہدے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بین الاقوامی تنازعات کے پرامن حل کے طریقہ کار وضع کیے جاتے ہیں۔ یہ معاہدے عالمی استحکام اور امن کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک بہترین معاہدہ وہی ہوتا ہے جس کے نفاذ کے لیے کسی تیسرے فریق کی ضرورت نہ ہو، بلکہ اس میں خود اپنی عمل داری کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب دو یا زیادہ فریقین معاہدے کی مکمل پاسداری کا عہد کریں اور اس پر عمل درآمد کو اپنے مفاد میں سمجھیں۔ عام طور پر، فریقین اپنے معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں، جس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، جن میں سب سے اہم کسی بھی ممکنہ انتقامی کارروائی سے بچنا ہوتا ہے۔

بین الاقوامی معاہدے کرتے وقت ایک بنیادی اصول کا خیال رکھنا ضروری ہے:
معاہدے کی شرائط فریقین کے داخلی قوانین، روایات، عقائد اور نظریات سے ہم آہنگ ہوں۔ اسی صورت میں وہ حقیقت پسندانہ اور قابل عمل ہوں گے، اور ان کے ذریعے کسی نظریاتی تبدیلی یا عملی اصلاح کی امید کی جاسکتی ہے۔ ایسے معاہدے ہی ریاستوں کو سنجیدگی سے عمل درآمد پر آمادہ کر سکتے ہیں۔

مختلف اقوام کے درمیان باہمی معاہدے بین الاقوامی تعلقات کی تشکیل، باہمی تعاون کے فروغ، اور عالمی چیلنجز سے نمٹنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ گفت وشنید، معاہدے کی توثیق اور اس پر مؤثر عمل درآمد کے ذریعے ممالک ایک ایسا فریم ورک قائم کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے منسلک دنیا میں امن واستحکام کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ، باہمی فوائد کے حصول میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

عالمی سفارت کاری اور بین الاقوامی تعلقات پر ان معاہدوں کے اثرات کو سمجھنے کے لیے ان کی نوعیت، اقسام، عمل درآمد کے مراحل، اور مجموعی اہمیت کو جاننا ضروری ہے۔ میرے خیال میں، اگر باہمی معاہدے نہ ہوں اور ان کی پاسداری نہ کی جائے تو شاید دنیا ایک دن کے لیے بھی امن کا تجربہ نہ کر سکے، اور نہ ہی کوئی پائیدار معاشی یا معاشرتی ترقی ممکن ہو۔

بین الاقوامی اتحاد برائے مشترکہ دفاع

بین الاقوامی تعلقات میں یہ بات بے حد اہم ہے کہ دو یا زیادہ ریاستوں کے درمیان جنگ یا کسی ممکنہ خطرے کی صورت میں باہمی تعاون کے لیے باضابطہ معاہدے کیے جائیں۔ آزاد اور خود مختار ریاستوں کے درمیان کسی دشمن کی ممکنہ کارروائی کے خلاف کیے جانے والے اجتماعی دفاعی نوعیت کے معاہدے کو "دفاعی معاہدہ" کہا جاتا ہے۔ عام طور پر، ایسے اتحاد باضابطہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کی بنیادی شرط یہ ہوتی

ہے کہ اگر کسی اتحادی ملک کو جنگ کا سامنا کرنا پڑے تو اتحاد میں شامل رکن ممالک اس کی مدد کے پابند ہوں۔

ایسے اتحاد کا سب سے بڑا فائدہ طاقت کے توازن کو برقرار رکھنا ہوتا ہے، جو کمزور ریاستوں کو زیادہ مضبوط ممالک کے خلاف ایک متوازن پوزیشن حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اکثر چھوٹے ممالک مل کر ایک دفاعی اتحاد قائم کرتے ہیں، جس کے ذریعے وہ کسی بڑی طاقت کا مؤثر مقابلہ کر سکتے ہیں۔

تاریخ میں بھی ہمیں دفاعی معاہدوں کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مدینہ کے آس پاس بسنے والے قبائل کے ساتھ دفاعی معاہدے کیے، جس کے نتیجے میں قریش کی طاقت کے مقابلے میں ایک توازن قائم ہوا۔ (اس موضوع پر تفصیل سے بات اگلے صفحات میں ہو گی۔)

وفود کا استقبال و اکرام اور سفیر کی حیثیت

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے سے ہی تمام اقوام سفیروں اور سفارت کاروں کو ایک خاص حیثیت دیتی آئی ہیں۔ ویانا کنونشن نے بھی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سفارت کاروں کے تحفظ اور سفارتی تعلقات کے اصول وضع کیے ہیں۔

درج بالا سطور میں میں نے ان بین الاقوامی قوانین کا ذکر کیا ہے جن پر دنیا کے بیشتر ممالک نے دستخط کیے ہیں اور انھیں اپنے اندرونی نظام میں رائج بھی کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی مختلف ممالک اور قبائل کی طرف سے آنے والے سفیروں اور ان کے نمائندوں کا احترام کے ساتھ استقبال کیا اور ان سے سفارتی معاملات طے کیے، جو سفارت کاری کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتا ہے۔

خارجہ پالیسی، سفارت کاری اور انسانی نفسیات

انسانی نفسیات کی بطور علم اہمیت صدیوں پر محیط ہے، کیونکہ یہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ تاہم، ماضی میں نفسیات کو ایک الگ اور خود مختار علمی شعبے کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور نہ ہی اسے باضابطہ طور پر تعلیمی اداروں میں پڑھایا جاتا تھا۔ گزشتہ چند صدیوں کے دوران، انسانی رویوں اور مشاہدات کو سائنسی بنیادوں پر منظم کیا گیا، جس کے نتیجے میں نفسیات کو ایک مستقل اور باقاعدہ علمی شعبے کی حیثیت حاصل ہوئی۔

بیسویں صدی میں کئی نامور ماہرینِ نفسیات نے اس علم کو باقاعدہ ایک سائنسی میدان کے طور پر متعارف کروایا اور اس کی مختلف شاخیں وضع کیں۔ آج نفسیات ایک مستند علمی شعبہ بن چکا ہے، جس میں تحقیق کی جاتی ہے اور ماہرین کو باقاعدہ اسناد دی جاتی ہیں۔ انھی ارتقائی مراحل میں نفسیات کی ایک مخصوص شاخ بھی سامنے آئی، جسے ''سفارت کاری میں انسانی نفسیات'' یا ''سائیکالوجی آف ڈپلومیسی'' کا نام دیا گیا۔

گزشتہ چند سالوں میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سفارت کاری کے لیے منتخب کیے جانے والے افراد کو باقاعدہ نفسیاتی تربیت دی جاتی ہے۔ البتہ، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ماضی کے سفارت کار انسانی نفسیات سے ناواقف تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہ علم غیر رسمی طور پر تجربات اور مشاہدات کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا، جبکہ اب اسے باقاعدہ ایک علمی و سائنسی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور کئی محققین نے اس پر گہری تحقیق بھی کی ہے، جو اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتی ہے۔

موجودہ دور کے سفارت کاروں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنی قوم کے مفادات کو مقدم رکھتے ہوئے معاہدے کریں، خواہ اس میں مدِ مقابل کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ دوسری طرف، ماہرینِ نفسیات کا موقف یہ ہے کہ سفارت کاری کو ایک زیادہ مثالی، مساویانہ اور نظریاتی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ تاہم، عملی طور پر سفارت کاران ہی نکات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جو ان کے مخالف کے لیے مشکلات پیدا کر سکتے ہوں۔

یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سفارت کاری کی نفسیات کا اطلاق عمومی یا عالمی سطح (macro level) پر نہیں بلکہ انفرادی ملاقاتوں اور مذاکرات (one-on-one) کے دوران کیا جاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسانی نفسیات کو مؤثر طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک کامیاب سفارت کار کے لیے چند بنیادی مہارتیں بے حد ضروری ہیں، جن میں:

- اپنی بات کو مؤثر اور مدلل انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت
- گفت وشنید میں مہارت اور تنازعات کے ممکنہ حل تجویز کرنے کی اہلیت
- منصفانہ فیصلے کرنے کا حوصلہ
- اپنی پوزیشن اور حالات کا مکمل ادراک
- قوتِ برداشت اور دور اندیشی
- مستقبل کے فوائد اور نقصانات کا درست اندازہ لگانے کی مہارت
- الفاظ کے چناؤ میں مہارت اور خوب صورت اندازِ بیان
- تقریر اور مکالمے میں مہارت، جس میں الفاظ کے ساتھ ساتھ اشاروں کا استعمال بھی شامل ہو

❖ مذاکرات کے دوران اپنی حکمتِ عملی کو دانش مندی سے بروئے کار لانا

❖ مدِ مقابل کی ذہنی کیفیت اور سوچنے کے انداز کو سمجھنے کی صلاحیت

یہ تمام عوامل مل کر ایک سفارت کار کو کامیاب مذاکرات کرنے اور اپنے ملک کے مفادات کو بہترین طریقے سے محفوظ رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

مذاکرات کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کسی فریق نے علمِ نفسیات کی مدد سے جذبات، تعصبات اور گفت و شنید کے پس پردہ محرکات کو سمجھنے میں کس حد تک برتری حاصل کی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال یہ ہے کہ کون سا فریق دوسرے کے مذہبی، ثقافتی، تاریخی رجحانات اور ترجیحات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتا ہے اور ان سے مذاکراتی برتری حاصل کرتا ہے۔

ایک معروف ویب سائٹ Diplomacy.edu نے انسانی نفسیات اور سفارت کاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مذاکرات انسانی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ وقوع پذیر ہونے والے معاملات میں سے ایک ہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو پیچیدہ مہارتوں اور وسیع علم کا متقاضی ہے۔ ایک کامیاب سفارت کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ فریقِ مخالف کے جذبات کو نہ صرف سمجھنے بلکہ عقلمندی سے ان کا استعمال کرنے کی مہارت رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ، ثقافتی اور نفسیاتی اختلافات کو سمجھنے اور ان کا مؤثر تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی ایک پیشہ ور سفارت کار کے لیے ناگزیر ہے۔''

جدید دور میں سفارت کاری میں نفسیات کا استعمال پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے، اور اب یہ کسی بھی کامیاب سفارت کار کی بنیادی مہارتوں میں شامل ہو چکا ہے۔

دنیا بھر کی تاریخ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ جب تک کسی بھی معاہدے کی بنیاد سماجی انصاف کے اصولوں پر نہیں رکھی جاتی، تب تک کامیاب بین الاقوامی سفارت کاری کا تصور بھی ممکن نہیں۔ سماجی انصاف ہی وہ بنیادی عنصر ہے جو مذاکرات کو کسی نتیجے تک پہنچا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے سفارت کاری کے دوران صرف انفرادی نہیں، بلکہ فریقِ مخالف کی اجتماعی نفسیاتی کیفیت کو بھی سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اگر کسی معاہدے میں سماجی انصاف کی جھلک نمایاں ہو گی، تو ہی لوگ اسے قبول کریں گے؛ بصورتِ دیگر، ایسے مذاکرات کو نامکمل اور غیر مؤثر سمجھا جائے گا۔

اگر کوئی معاہدہ یکطرفہ فیصلے پر مبنی ہو، تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک فریق طاقت کے بل بوتے پر فیصلہ سازی کے عمل پر اثر انداز ہو رہا ہے، جو دیرپا امن اور استحکام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ سفارت کاری کے عمل میں اعلیٰ مقاصد اور کامیاب نتائج کا حصول کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بہترین سفارت کار ہمیشہ نقطۂ نظر کی یکسانیت کو ترجیح دیتے ہیں اور اختلافِ رائے کو کم سے کم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محدود اختلاف سے بچنے کے لیے اپنی پوزیشن سے پیچھے ہٹنا بعض اوقات ایک دانش مندانہ حکمتِ عملی ہوتی ہے، جو بالآخر وسیع پیمانے پر اتفاقِ رائے کے فروغ میں مدد دیتی ہے۔

ماہرینِ نفسیات کے نزدیک کسی بھی صورتِ حال کا باریک بینی سے تجزیہ کرنا بے حد اہم ہوتا ہے۔ اس تجزیے کے لیے یادداشت، جذبات، تصورات، خیالات، منطق اور وجوہات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ عمل انفرادی طور پر کیا جاتا ہے، مگر سفارت کاری میں اسے ایک مؤثر حکمتِ عملی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی نفسیات کا علم کامیاب سفارت کاری کے لیے درکار مہارتوں کو مؤثر انداز میں بروئے کار لانے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سفارت کاروں کو اپنے نقطۂ نظر کے اظہار، دوسروں کے خیالات کو سمجھنے، تنازعات کو حل

کرنے، اختلافِ رائے کو باعزت طریقے سے سنبھالنے اور ایک منصفانہ حل تلاش کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ سماجی انصاف نہ صرف باہمی تنازعات کے حل کے لیے ناگزیر ہے بلکہ اس کا عملی حصول بھی ایک پیچیدہ اور مشکل کام ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ فریقین اس امر کا یقین رکھیں کہ معاہدے کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد منصفانہ طور پر تقسیم کیے جائیں گے۔ یہ اصول کسی بھی کامیاب سفارت کاری کا بنیادی جزو ہے۔ سماجی انصاف ہی وہ عنصر ہے جو ایک مثبت اور پُر امید تصور کو جنم دیتا ہے۔تاہم، یہ اسی وقت ممکن ہے جب تصفیہ طلب مسائل کو تعصبات سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے۔

میرے خیال میں مسائل کے مؤثر حل کے لیے اس سوچ کو فروغ دینا نہایت اہم ہے۔

کامیاب سفارت کاری کے لیے ضروری ہے کہ ایک سفارت کار میں ایسی مہارتیں موجود ہوں جو اس کے طرزِ عمل کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ ایک مؤثر سفارت کار کسی بھی لمحے اپنی مہارتوں کو بروئے کار لا کر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرنے، دوسروں کے خیالات کو سمجھنے، تنازعات کے ممکنہ حل کے لیے فریقِ مخالف کی رائے کو اہمیت دینے، باہمی اختلافات کو باعزت اور نتیجہ خیز انداز میں سلجھانے اور ایک منصفانہ حل تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ، سفارت کار کو چاہیے کہ وہ صرف اپنی جماعت کی دی ہوئی ''پارٹی لائن'' کو ہی حتمی سچ نہ سمجھے، بلکہ وسیع تر سماجی اور انسانی پہلوؤں کو بھی مد نظر رکھے۔ صرف اور صرف پارٹی لائن کی پابندی کسی معاہدے کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔ ایک مؤثر معاہدے کے لیے ضروری ہے کہ پارٹی مفادات کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی مد نظر رکھا جائے۔ یہی رویہ کسی ٹھوس اور دیرپا نتیجے تک

پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

سفارت کاری میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جب مذاکرات کے نتائج معقول اور متوازن نظر آ رہے ہوں، تو عموماً لوگ، سوائے ایک قلیل اقلیت کے، انھیں قبول کرنے کے لیے زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں، نامکمل مذاکرات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ مستقبل میں مزید گفت و شنید کی راہ ہموار کر سکتے ہیں۔

بین الاقوامی سفارت کاری میں انسانی نفسیات کے اثر و رسوخ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں قائم امریکن سائیکالوجیکل ایسوسی ایشن نے اقوامِ متحدہ کے ساتھ مل کر انسانی نفسیات کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کئی عالمی مسائل کے حل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان میں بچوں اور اقلیتوں کے حقوق، عمر رسیدگی، ذہنی صحت و بہبود، ماحولیات، اور دیگر سماجی مسائل شامل ہیں۔

اب تک کی گئی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ماہرینِ نفسیات سفارت کاری میں ایک کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ اس اثر سے مبرا نہیں—چاہے وہ محلے کی سطح پر درپیش مسائل ہوں یا کسی پیچیدہ بین الاقوامی تنازع کا معاملہ ہو۔ انسانی نفسیات کے اصولوں کی مدد سے سماجی انصاف کو فروغ دیا جا سکتا ہے اور دنیا میں مثبت تبدیلی کے خواب کو حقیقت میں بدلا جا سکتا ہے۔

ایک معروف تنظیم جو خارجہ پالیسی و سفارت کاری بارے میں تربیت کا اہتمام کرتی ہے، خارجہ پالیسی و سفارت کاری کی کوئی سوا سو سے بھی زائد اقسام بتائی ہیں۔ جن میں چند ایک کے نام کچھ اس طرح سے ہیں؟

Aid diplomacy, Art diplomacy, Cultural diplomacy, Youth diplomacy, Science diplomacy, Peace diplomacy etc.

خارجہ پالیسی اور سفارت کاری صرف سیاسی امور تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ وہی قومیں ترقی اور استحکام حاصل کرتی ہیں جو مؤثر خارجہ پالیسی اور سفارتی حکمت عملی ترتیب دینے میں مہارت رکھتی ہیں۔

آپ ﷺ کی سفارت کاری اور مدبرانہ خارجہ پالیسی اس کی بہترین مثال ہے، جس نے مختصر مدت میں اسلامی انقلاب برپا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف سفارتی تعلقات کو استوار کیا بلکہ مختلف اقوام اور قبائل کے ساتھ حکمتِ عملی پر مبنی معاہدے کیے، جو اسلام کے پھیلاؤ اور استحکام کا ذریعہ بنے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جس سے آج کی دنیا بھی رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔

***

اسلام میں بین الاقوامی تعلقات اور صلح و جنگ کے اصول

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مرتب کردہ خارجہ پالیسی اور سفارت کاری پر بحث کرنے سے قبل، یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں خارجہ تعلقات، سفارت کاری، اور باہمی معاہدوں سے متعلق دی گئی ہدایات اور اصولوں کا جائزہ لیا جائے۔ یہی وہ بنیادی احکامات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر آپ ﷺ نے ایک قلیل مدت میں ایک پائیدار اور دیرپا انقلاب برپا کیا۔

ان صفحات میں مفصل طور پر قرآن مجید اور احادیث میں دیے گئے اُن احکامات کا ذکر کیا جائے گا، جو دیگر اقوام کے ساتھ جنگ یا مذاکرات کرتے وقت سامنے رکھنا ضروری ہیں اور ان پر عمل کرنا بھی لازمی ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ اسلام میں جنگی احکامات، یعنی جنگ سے پہلے اور بعد میں، کیسے تھے اور مذاکرات کے دوران کن باتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جاننے کو ملے گا کہ آپ ﷺ نے ان اقدامات پر عمل کر کے یہ ثابت کیا کہ حقیقی فتح صرف قرآن و سنت کے احکامات پر عمل کر کے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی سلسلے میں آپ ﷺ کی زندگی سے بھی ہمارے لیے بے شمار رہنمائی ملتی ہے۔

سب سے پہلے، خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ترتیب دیتے وقت اسلام کے احکامات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ ان صفحات میں تین موضوعات پر بات کی جائے گی:

- غیر مسلموں سے تعلقات اور انھیں دین کی طرف دعوت۔
- جنگ سے پہلے، دورانِ جنگ اور جنگ کے بعد کس طرح کا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟
- غیر مسلموں سے معاہدے اور ان کی پاسداری کیسے کی جانی چاہیے؟

میرے نزدیک یہ تینوں ہی باتیں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی بنیاد ہیں۔

آپ ﷺ بحثیت ایک داعی

قرآن مجید میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ آپ ﷺ کی ذمہ داری لوگوں تک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا پیغام پہنچانا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔
(سورۃ الاحزاب ۳۳: ۴۵-۴۸)

”اے نبیؐ، ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اور ہر گز نہ دبو کفار و منافقین سے، کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دے۔“

اس کے علاوہ سورۃ الاسراء میں آتا ہے؛

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا۔ (الاسراء ۱۷: ۵۴)

تمہارا رب تمہارے حال سے زیادہ واقف ہے، وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے اور اے نبیؐ، ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں

بھیجا ہے۔

سورۃ النحل میں بھی آپ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے کس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بات کو لوگوں تک پہنچانا ہے؛

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ۔ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ۔ (النحل ۱۶: ۱۲۵-۱۲۸)

"اے نبیؐ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو تمھارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔

اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

اے محمدؐ، صبر سے کام کیے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے اِن لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔

اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔"

اوپر درج کی گئی چند آیات سے یہ بات واضح طور پر جانی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد لوگوں تک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا پیغام پہنچانا تھا۔ بعد ازاں، اس پر ایمان لانا یا نہ لانا لوگوں کا اپنا فیصلہ تھا۔ آپ ﷺ ان کے فیصلے کے ذمہ دار نہیں تھے۔ یہ آیات آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی بنیاد ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ آپ ﷺ کو مخالفینِ اسلام سے جنگیں بھی کرنا پڑیں۔ ایسا اسی وقت

ہوا جب مخالفینِ اسلام کی طرف سے ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی، تو پھر آپ ﷺ کو بھی جنگ کا حکم دیا گیا۔ یاد رہے کہ جنگ کی اجازت مدینہ ہجرت کے بعد دی گئی اور اس کے متعلق احکامات نازل کیے گئے، جنھیں اب عام طور پر ''جہاد'' کا نام دیا جاتا ہے۔

آپ ﷺ کی تمام تر خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی بنیاد سب سے پہلے حکمت کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا تھی۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ احسن طریقے سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا جائے۔ یہ اسلام میں خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی ایک بنیادی شرط ہے، یعنی صلح و آشتی، بات چیت، خیر خواہی اور خیر سگالی۔

جنگ کی اجازت اور خارجہ پالیسی اور سفارت کاری

''جہاد'' کا لفظ بھی جنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ عربی لفظ جَاھَدَ، یُجَاھِدُ، مُجَاھَدَۃً سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے "پورے دل سے کوشش کرنا"۔ اس پر کئی علما نے سیر حاصل بحث کی ہے، مگر وہ ہمارے موجودہ موضوع سے زیادہ متعلق نہیں۔ جہاد کی اصطلاح خاص طور پر مذہبی اور اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے ہتھیاروں کے ساتھ یا بغیر ہتھیاروں کے جدوجہد کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ جہاد کے ایک معنی اپنے نفس کی اصلاح کرنا بھی ہیں۔

اس موقع پر ہم صرف اس جہاد کی بات کریں گے جو جنگ سے متعلق ہے۔ یاد رہے کہ کسی بھی تنازعے کا آخری حل عموماً میدانِ جنگ میں ہی نکلتا ہے، اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب تمام تر گفت و شنید کے راستے بند ہو چکے ہوں اور مسئلہ مذاکرات سے حل نہ ہو رہا ہو۔ جنگ تک پہنچنے کا فیصلہ بھی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔

ان صفحات میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آپ ﷺ نے جنگ سے بچنے کے لیے کون سی حکمتِ عملی اختیار کی اور اگر جنگ آن پڑی، تو کس طرح قرآن کے

احکامات کی پابندی کی، جو ہم سب کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔اس سے ہم یہ بھی سیکھ سکتے ہیں کہ جنگی صورتِ حال میں بھی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو منظم کیسے رکھا جائے۔اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جنگ کا مقصد تباہی و بربادی پھیلانا نہیں ہے، بلکہ اس کی اجازت اسی وقت دی گئی جب خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ناکام ہو گئی اور دشمنوں کے ساتھ بات چیت کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔

جہاد کے بارے میں ابتدائی قرآنی آیات ہجرت کے فوراً بعد نازل ہوئیں، یعنی یہ مدنی آیات ہیں۔ ان میں وہ دائمی احکامات دیے گئے جو جہاد کی اصل روح سمجھے جا سکتے ہیں۔ سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ کا حکم ان الفاظ میں درج ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ۔ (الحج ۲۲: ۳۹)۔اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے۔

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ (سورۃ الحج ۲۲: ۴۰)

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ”ہمارا رب اللہ ہے“ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔

ان آیات میں جنگ کی اجازت دی گئی اور فوراً بعد یہ کہا گیا کہ

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ۔ (سورۃ الحج ۲۲: ۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر آپ جنگ میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں، تو اس کے بعد آپ کو کیا اقدامات کرنے ہوں گے۔ ان میں نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا شامل ہیں۔ ساتھ ہی، یہ پختہ یقین بھی رکھنا ہو گا کہ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہاں سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جہاد کا اصل مقصد اللہ کی زمین پر اس کے احکامات کی پابندی کرنا ہے۔ جہاد کسی ذاتی مقصد کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ یہ صرف اللہ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے ہوتا ہے۔

سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا:

وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ۔ (البقرہ ۲: ۱۹۰)

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ وَ اَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ اَخۡرَجُوۡکُمۡ وَ الۡفِتۡنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوۡہُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡہِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ فَاقۡتُلُوۡہُمۡ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ۔ (البقرہ ۲: ۱۹۱)

ان سے لڑو جہاں بھی تمہارااُن سے مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ برا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چُوکیں، تو تم بھی بے تکلف انھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔(البقرہ۲: ۱۹۲)

پھرا گروہ باز آجائیں، تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۔(البقرہ۲: ۱۹۳)

تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھرا گروہ باز آجائیں، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔

ان آیات کے علاوہ، قرآن مجید میں کئی دیگر مقامات پر بھی جہاد کے بارے میں احکامات ملتے ہیں۔ اوپر درج کردہ آیات سے تین بنیادی نکات واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

- لڑو، لیکن زیادتی نہ کرو۔
- قتل ایک سنگین جرم ہے، لیکن فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ مسجدِ حرام کے قریب جنگ سے بچنے کی کوشش کرو، لیکن اگر دشمن جنگ پر آمادہ ہو تو تم بھی مقابلہ کرو۔
- اگر وہ باز آجائیں، تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

درج بالا آیات کی تشریح کرتے ہوئے، سید ابوالا علیٰ مودودی اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں۔

”یعنی تمہاری جنگ نہ تو اپنی مادی اغراض کے لیے ہو، نہ ان لوگوں پر ہاتھ

اٹھاؤ، جو دین حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے استعمال کرو۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں اور زخمیوں پر دست درازی کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا اور دوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال ''حد سے گزرنے'' کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں ان سب کی ممانعت وارد ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے، جہاں وہ ناگزیر ہو، اور اسی حد تک کیا جائے، جتنی اس کی ضرورت ہو۔

جنگ کا مقصد بھی امن کا قیام ہی ہوتا ہے۔ امن، انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور سب سے زیادہ ترجیح کا حامل ہے۔ قرآن مجید اور سنتِ مطہرہ کا اصل مقصد انسان کی اصلاح اور اس کی فلاح و بہبود ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں امن قائم ہو۔ امن، معتدل حالات کا دوسرا نام ہے اور انھی حالات میں اصلاحِ انسانیت کا عمل ممکن ہے۔

دوسری طرف، اگر جنگ ناگزیر ہو تو اس کے لیے بھی واضح احکامات موجود ہیں کہ دورانِ جنگ بے قصور، نہتے اور کمزور لوگوں پر کسی بھی طرح کا ظلم نہ ہو۔ جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے جو عملاً جنگ میں شریک ہوں یا جو جنگی مشورے اور سامان کی فراہمی میں شامل ہوں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ بھی واضح حکم دیا ہے کہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور عبادت میں مشغول گوشہ نشین افراد کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یہی نہیں، بلکہ سرسبز کھیتوں، پھل دار درختوں اور باغات کو نقصان پہنچانے سے بھی سختی سے منع کیا گیا ہے۔

اس بارے ارشاد نبویؐ ہے:

(مرفوع) حدثنا احمد بن یونس، اخبرنا اللیث، عن نافع ان عبد اللہ رضی اللہ عنه، اخبرہ ان امراۃ وجدت فی بعض مغازی النبی صلی اللہ علیه وسلم مقتولة، فانکر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم " قتل النساء، والصبیان". (صحیح بخاری حدیث نمبر ۳۰۱۴)

ترجمہ: ہم سے احمد بن یونس نے بیان کیا' کہا ہم کو لیث نے خبر دی' انھیں نافع نے اور انھیں عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک غزوہ (غزوہ فتح) میں ایک عورت مقتول پائی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل پر غصے کا اظہار فرمایا۔

یہ بھی ایک حدیث سے جاننے کو ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے جنگ کی آرزو کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جنگ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی آرزو کی جائے۔ یہ تو وہ آخری بات ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اب بات چیت سے معاملہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔

(مرفوع ، موقوف) وقال: ابو عامر، حدثنا مغیرۃ بن عبد الرحمن، عن ابی الزناد، عن الاعرج، عن ابی هریرۃ رضی اللہ عنه، عن النبی صلی اللہ علیه وسلم، قال: لا تمنوا لقاء العدو، فإذا لقیتموهم فاصبروا۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۳۰۲۶)

ابو عامر نے کہا: ہم سے مغیرہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا' ان سے ابوالزناد نے' ان سے اعرج نے اور ان سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دشمن سے لڑنے بھڑنے کی تمنا نہ کرو' ہاں!

اگر جنگ شروع ہو جائے تو پھر صبر سے کام لو۔

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام میں جنگ ایک مستقل اصول کے طور پر نہیں، بلکہ ایک استثنائی اور ناگزیر عمل کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ تاہم، یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ اسلام میں جنگ کا حکم صرف اسی وقت دیا گیا ہے جب حالات اسے ناگزیر بنا دیں اور ریاست اس نتیجے پر پہنچے کہ جنگ کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس طرح، جنگ قانونِ ضرورت کے تحت کیا جانے والا ایک وقتی عمل ہے، نہ کہ کوئی ابدی اصول یا مستقل عمل۔

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے معاہدے میں یہ شرط شامل تھی کہ آئندہ دس سال تک جنگ نہیں کی جائے گی۔ اسلامی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ اس کا بنیادی مقصد انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی میں دینا اور دنیا میں امن و آشتی کو فروغ دینا ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو جنگ و تباہی سے نفرت، دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک، انسانی جان کی قدر، اس کی حفاظت و خیر خواہی اور حق کی دعوت دینے کا حکم دیتا ہے۔ مزید برآں، اسلام تقویٰ و پرہیزگاری، علم و عمل، اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

قرآن مجید میں اس بارے میں واضح احکامات موجود ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران ۳: ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

ایک بہترین امت کا اصل ہتھیار بہترین فکر و عمل ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر اپنی بات کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

یہی وہ احکامات ہیں جن کی آپ ﷺ نے سختی سے پابندی کی اور انھیں اپنی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو بنایا۔ آج بھی بھلائی اسی میں ہے کہ ان اصولوں پر عمل کیا جائے تاکہ دنیا بھر میں امن قائم کیا جا سکے، جیسا کہ آپ ﷺ نے عرب جیسے بدوی معاشرے میں قائم کیا، جہاں ریاست نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔

جہاد کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں ایک معروف کتاب الجہاد فی الاسلام ہے، جسے سید مودودیؒ نے تحریر کیا۔ ان صفحات میں یہ بات بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں جو بھی جدوجہد کی، چاہے وہ مذاکرات ہوں، غزوات ہوں یا جنگ، ان سب کا مقصد صرف اور صرف اللہ کے دین کی سربلندی تھا۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہونے والی تمام جنگوں کو ''جہاد'' کہا جاتا ہے۔

وہ جنگ جس میں آپ ﷺ بنفسِ نفیس شریک ہوئے، اسے ''غزوہ'' کہا جاتا ہے، جبکہ وہ جنگ جس میں آپ ﷺ شریک نہیں ہوئے، محض جنگ کہلاتی ہے۔ ایسی جنگ جو کسی ذاتی سلطنت کی توسیع، ذاتی مفادات، یا مال و دولت کے حصول کے لیے کی جائے، وہ محض جنگ تو ہو سکتی ہے، مگر جہاد نہیں۔ جہاد وہی ہے جو محض اللہ رب العزت کی رضا کے لیے کیا جائے۔

اب تک کی گئی بحث یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن مجید دشمنوں کے ساتھ معاملات طے کرتے وقت ہمیں کن اصولوں کی تلقین کرتا ہے۔ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی میں ان تمام احکامات کی سختی سے پابندی کی جس کا ثبوت آپ ﷺ کی مبارک زندگی سے ملتا ہے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی خارجہ پالیسی، جس کا ایک جزو جنگ کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بنیاد پر ہی ترتیب دی تھی، اور یہی آج کی دنیا کے لیے بھی بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

آپ ﷺ کی جنگی حکمتِ عملی دراصل آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو تھی۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہر جنگ کے بعد آپ ﷺ نے دشمنوں کے صرف جسم ہی نہیں، بلکہ ان کے دل بھی فتح کیے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ جنگ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی اور صرف اسی وقت جنگ کا راستہ اختیار کیا جب دشمن نے مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب جنگ ناگزیر ہو گئی تو آپ ﷺ نے بہترین حکمتِ عملی کے ساتھ جنگ لڑی اور ہر معرکے میں کامیابی حاصل کی۔

آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں، ان سب میں فتح نصیب ہوئی، سوائے جنگ اُحد کے، جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کے روز کسی کو فتح یا شکست نہیں ہوئی۔ تاہم، جنگ کے اگلے روز جب آپ ﷺ نے مشرکینِ مکہ کا پیچھا کیا اور وہ میدان چھوڑ کر واپس مکہ چلے گئے، تو یہ بھی درحقیقت آپ ﷺ کی ہی جیت تھی۔

جنگوں میں دو طرح کی حکمتِ عملی اپنائی جاتی ہے:

میدانِ جنگ سے متعلق حکمتِ عملی (جنگ کے دوران کی جانے والی تدابیر)

سیاسی و سفارتی حکمتِ عملی (وہ معاملات جو جنگ سے جڑے ہوتے ہیں)

بسا اوقات میدانِ جنگ کی جیت سیاسی میدان میں شکست میں بدل جاتی ہے۔ لہٰذا، ضروری ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ کے ساتھ ساتھ سیاسی و سفارتی سطح پر بھی کامیابی حاصل کی جائے۔ یہی حکمتِ عملی ہمیں آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے نہ صرف میدانِ جنگ میں فتح حاصل کی بلکہ سیاسی میدان میں بھی

کامیابی حاصل کی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر جنگ کے بعد آپ ﷺ کے جاںنثاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کی بہترین خارجہ پالیسی کے باعث لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں سورہ النصر میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ۔ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۔ (النصر ۱۱۰ : ۱-۲)۔ جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے، اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

میرے نزدیک فتح مکہ کے بعد لوگوں کا گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونا درحقیقت آپ ﷺ کی ان پالیسیوں کا نتیجہ تھا، جن کی مدد سے آپ ﷺ نے اہلِ عرب کے دل جیت لیے۔ دنیا کی تاریخ میں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کوئی بادشاہ میدانِ جنگ میں فتح تو حاصل کر لیتا ہے، لیکن عوام اس کی اطاعت قبول نہیں کرتے۔ اس کی ایک بڑی مثال انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ ہے۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی افواج کو تو شکست دے دی، لیکن وہ کبھی بھی یہاں کے عوام کے دلوں پر راج نہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد قتل و غارت گری نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ نے جنگ صرف اس وقت کی جب کوئی اور راستہ باقی نہ رہا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جنگ کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ لوگ آپ ﷺ کے اخلاق، انصاف اور حکمتِ عملی سے متاثر ہو کر خود اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔

آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے ہمیں ایک خوب صورت حقیقت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ چار بڑی جنگیں بدر، اُحد، خندق اور فتح مکہ تمام کی تمام قریشِ مکہ کے خلاف

تھیں۔ان میں سے تین جنگوں میں قریشِ مکہ نے حملہ کیا، اور آپ ﷺ نے دفاع میں جنگ لڑی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ ﷺ نے مکہ پر حملہ محض طاقت کے مظاہرے کے لیے نہیں کیا، بلکہ یہ مشرکینِ مکہ کی جانب سے معاہدے کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھا۔اس موقع پر، بطور فاتح، آپ ﷺ کا کردار رہتی دنیا تک ایک مثال ہے کہ کس طرح آپ ﷺ نے فتح سے پہلے اور فتح کے بعد رحمدلی اور بڑے پن کا ثبوت دیا۔

جنگِ حنین آٹھویں ہجری میں ہوئی۔ یہ جنگ اس وقت ہوئی جب وہاں کے قبائل نے محسوس کیا کہ ابھرتی ہوئی اسلامی ریاست کو دبانا ضروری ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مدینہ میں آپ ﷺ یہودیوں سے کہیں زیادہ طاقتور تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے کبھی ان کے خلاف جنگ میں پہل نہیں کی۔ البتہ، جب یہودیوں نے بار بار معاہدوں کی خلاف ورزی کی اور سازشیں کیں، تب آپ ﷺ نے ان کے خلاف ایکشن لیا۔ جنگِ خیبر بھی دراصل یہودیوں کی مسلسل سازشوں کا نتیجہ تھی۔

اس کے علاوہ، پورے عرب میں بے شمار قبائل آباد تھے، اور آپ ﷺ نے ان میں سے اکثر کے ساتھ امن معاہدے کیے۔ آپ ﷺ نے کسی بھی قبیلے کے خلاف جنگ نہیں کی جب تک کہ ان کی طرف سے زیادتی نہ کی گئی۔

اسلام میں جنگی احکامات کا خلاصہ

قران وحدیث اور آپ ﷺ کی سیرت کے مطالعے سے جنگ کے بارے میں جو احکامات ملتے ہیں، ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے؛

1. جنگ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا، اور جنگ کی دعا کرنے سے منع کیا گیا۔
2. اگر جنگ ناگزیر ہو جائے تو دلیری اور ثابت قدمی سے مقابلے کا حکم دیا گیا ہے۔
3. جنگ میں پہل کرنے، اسے کمائی کا ذریعہ بنانے اور غیر ضروری جارحیت برتنے کی

ممانعت کی گئی ہے۔

4. اسلام نے دشمنوں کو دو طبقات میں تقسیم کیا ہے:

اہلِ قتال: وہ جو عملاً جنگ میں حصہ لے رہے ہوں (یعنی میدان جنگ میں موجود جنگجو)۔ غیر اہلِ قتال: وہ لوگ جو جنگ میں براہ راست شریک نہ ہوں، جیسے: عورتیں، بچے، بیمار، زخمی، نابینا، جسمانی معذور، پاگل، مسافر، عبادت گزار، اور مندروں یا خانقاہوں کے مجاور۔ ایسے غیر جنگجو افراد پر حملہ کرنے یا انھیں نقصان پہنچانے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

5. کسی زخمی پر دوبارہ حملہ نہ کیا جائے۔

6. جو شخص میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگ جائے، اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔

7. جو شخص اپنے دروازے بند کر کے بیٹھ جائے، اس پر حملہ نہ کیا جائے، بلکہ اسے امان دی جائے۔

8. غفلت میں حملہ کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

9. آگ میں جلانے، ہاتھ باندھ کر قتل کرنے، لوٹ مار، تباہی پھیلانے، بد نما مثلہ (لاشوں کا مثلہ کرنا)، بد عہدی، اور جنگی مال میں خیانت کرنے کی سخت ممانعت ہے۔

10. قیدیوں کو قتل نہ کرنے اور سفیروں کو نقصان نہ پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔

11. عام راستوں کو تنگ کرنے اور بے گناہ راہگیروں کو تکلیف دینے سے روکا گیا ہے۔

12. آپ ﷺ ہمیشہ فوج کو جنگ سے پہلے تقویٰ، خوفِ خدا، عدل و انصاف، اور بد عہدی و خیانت سے بچنے کی سختی سے نصیحت فرماتے۔

***

بین الاقوامی تعلقات میں اسلامی معاہداتی روایات

اب تک ہم دو پہلوؤں پر بات کر چکے ہیں: آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد اور اسلام میں جنگی احکامات۔ اب ہم یہاں تیسرے اہم پہلو پر بات کریں گے کہ غیر مسلموں سے معاہدے کرتے وقت قرآن مجید اور سنتِ مطہرہ ہمیں کیا احکامات دیتے ہیں؟

دو یا دو سے زائد افراد یا گروہوں کا کسی ایک بات پر متفق ہو جانا "وعدہ"، "عہد" یا "معاہدہ" کہلاتا ہے۔ "وعدہ" اور "عہد" دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں، اور ان کے معانی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں کا مفہوم قول و قرار کرنا ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں عام بات کو "وعدہ" کہا جاتا ہے، جبکہ کوئی بڑی بات، جیسے کوئی بڑا مالی معاملہ، تو اسے "عہد" کہتے ہیں۔ جب دو افراد یا دو قوموں کے درمیان کوئی ایسا معاملہ طے پائے جو دیرپا ہو اور کسی اہم معاملے سے متعلق ہو، جیسے جنگ کے بعد صلح، مالی لین دین، یا جائیداد کی خرید و فروخت، تو اسے تحریری طور پر محفوظ کیا جاتا ہے اور "معاہدہ" کہا جاتا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن مجید میں انفرادی اور اجتماعی وعدوں اور معاہدوں کے بارے میں وضاحت فرمائی ہے۔ یہاں ہم صرف ان معاہدوں پر بات کریں گے جو آپ ﷺ نے مختلف قبائل اور ممالک کے ساتھ کیے۔ یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ قرآن مجید اور سنت مطہرہ ہمیں معاہدوں کے بارے میں کیا احکامات دیتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اصول نہیں سمجھ سکتے۔

قرآن مجید اور سنتِ مطہرہ ہمیں ہر طرح کے وعدوں اور معاہدوں کی پاسداری کا حکم دیتے ہیں، چاہے وہ انفرادی سطح پر ہوں یا اجتماعی سطح پر۔ ہمیں آپ ﷺ کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ معاہدے کرتے وقت ہمیشہ انھیں تحریری شکل میں لکھواتے تھے۔ اس کی کئی مثالیں سیرت کی کتب میں موجود ہیں، جیسے صلح حدیبیہ، اہلِ نجران سے کیا گیا معاہدہ، بنی ثقیف سے کیا گیا معاہدہ، اور اہلِ مدینہ اور یہود کے درمیان ہونے والا مشہور معاہدہ۔

یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کوئی ایسا معاہدہ نہیں کیا جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ یہ بات ہمیں اہلِ نجران سے ہونے والے معاہدے میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ہر معاہدے کی دو نقلیں تیار کرواتے تھے تاکہ ہر فریق کے پاس ایک ایک کاپی محفوظ رہے۔

معاہدات پر اہم افراد اور گواہوں کے دستخط کرنے کا ذکر بھی ہمیں سیرتِ پاک سے ملتا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ آپ ﷺ نے جب بھی کوئی معاہدہ کیا، انسانی حقوق کا بھرپور خیال رکھا۔ ہر معاہدے میں آپ ﷺ نے ہر فرد کے شہری اور مذہبی حقوق کی آزادی کو مقدم جانا۔ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے معاہدات میں ہر فرد کے عقیدے کی آزادی کا خاص خیال رکھا اور کسی کو اس کی مرضی کے بغیر اپنا مذہب چھوڑنے یا اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی مکمل آزادی دی۔

اس بات کی بھی آپ ﷺ نے یقین دہانی کروائی کہ اسلامی ریاست میں بسنے والے تمام غیر مسلموں کی عبادت گاہیں مکمل طور پر محفوظ رہیں گی (جیسے معاہدۂ نجران میں یہ بات شامل تھی)۔ نہ صرف مذہبی بلکہ آپ ﷺ نے جن لوگوں سے معاہدہ

فرمایا، ان کے معاشی اور تجارتی حقوق کا بھی بھرپور خیال رکھا اور ان کے جان و مال کے تحفظ کی مکمل ضمانت دی۔

عہد کی پابندی اور قرآن وحدیث

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (المومنون ۲۳:۸)

اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں۔

اس آیت میں ایمان لانے والوں کی ایک اہم صفت بیان کی گئی ہے۔ یقینی طور پر اس صفت کا سب سے بہترین اظہار آپ ﷺ کی زندگی میں ہی نظر آتا ہے، جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ہے۔ سورۃ التوبہ میں معاہدوں کے بارے میں تیرہ آیات موجود ہیں، جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک ایفائے عہد کی کس قدر اہمیت ہے۔ انھی آیات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کن حالات میں معاہدے ختم کیے جا سکتے ہیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

سورۃ التوبہ ۹:۱

اعلان برات ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ

وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ۔ سورۃ التوبہ ۹:۲

پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اُس کا رسول بھی اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لیے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور اے نبیؐ، انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنادو۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔

بجز اُن مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انھوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَــلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں اُن کی خبر لینے کے لیے بیٹھو پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ در گزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ۔

اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اُسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اُسے اس کے مامن تک پہنچادو یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

كَيۡفَ يَكُوۡنُ لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ عَهۡدٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعِنۡدَ رَسُوۡلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ‌ ۚ فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَـكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ۔

اِن مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے؟ بجز اُن لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا، تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔

كَيۡفَ وَاِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ لَا يَرۡقُبُوۡا فِيۡكُمۡ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً‌ ؕ يُرۡضُوۡنَكُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَتَاۡبٰى قُلُوۡبُهُمۡ‌ۚ وَاَكۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ۔

مگر اِن کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اُن کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملے میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

اِشۡتَرَوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ۔

انھوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی پھر اللہ کے راستے میں سدِ راہ بن کر کھڑے ہو گئے بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔

لَا يَرۡقُبُوۡنَ فِىۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ۔

کسی مومن کے معاملے میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا اور زیادتی ہمیشہ انھی کی طرف سے ہوئی ہے۔

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ‌ ؕ وَنُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ۔

پس اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکٰوۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لیے ہم اپنے احکام واضح کیے دیتے ہیں۔

وَاِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَطَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّةَ الۡكُفۡرِ‌ ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنۡتَهُوۡنَ۔

اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبر داروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا اعتبار نہیں شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔

اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ وَهَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ وَهُمۡ بَدَءُوۡكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ‌ ؕ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ‌ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔

کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنھوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔

سورۃ بنی اسرائیل میں عہد کی پابندی بارے میں ایک واضح حکم ملتا ہے۔ جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عہد کی پابندی بارے میں پوچھ گچھ بھی ہو گی۔

وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡيَتِيۡمِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ حَتّٰى يَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ‌ ۖ وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـئُوۡلًا۔ (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴)

مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو، مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے، عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جوابدہی کرنی ہو گی۔

سورۃ المائدہ میں بھی عہد پورا کرنے بارے میں ایک حکم ملتا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ (المائدہ۵:۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو

(احمد رضا خان بریلوی نے عقود کا ترجمہ قول کیا ہے۔ مفتی تقی عثمانی نے اس کا ترجمہ معاہدوں کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے اس کا ترجمہ عہد کیا ہے)

اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ۔ (الانفال۱۰:۵۶)

(خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ۔ (الانفال۱۰:۵۷)

پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد جو دوسرے لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں توقع ہے کہ بدعہدوں کے اِس انجام سے وہ سبق لیں گے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآىِٕنِیْنَ۔ (الانفال۱۰:۵۹)

اور اگر کبھی تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۔ (النساء۴: ۹۰)

البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

مفتی تقی عثمانی نے ان آیات کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے؛

ہاں وہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان کوئی (صلح کا) معاہدہ ہے، یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ ان کے دل تمہارے خلاف جنگ کرنے سے بھی بیزار ہوں، اور اپنی قوم کے خلاف جنگ کرنے سے بھی اور اگر اللہ چاہتا تو انھیں تم پر مسلط کر دیتا تو وہ تم سے ضرور جنگ کرتے۔ چنانچہ اگر وہ تم سے کنارہ کشی کرتے ہوئے تم سے جنگ نہ کریں، اور تم کو امن کی پیشکش کر دیں تو اللہ نے تم کو ان کے خلاف کسی کارروائی کا کوئی حق نہیں دیا۔

وعدے اور معاہدے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند فرمان بھی یہاں بیان کیے جا رہے ہیں۔ ان سے ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک وعدے کی پابندی کے کتنے سخت احکامات ہیں۔

(مرفوع) حدثنا محمد بن كثير، اخبرنا سفيان، عن الاعمش، عن إبراهيم التيمي، عن ابيه، عن علي رضي الله عنه، قال: ما كتبنا عن النبي صلى الله عليه وسلم إلا القرآن وما في هذه الصحيفة، قال النبي صلى الله عليه وسلم: " المدينة حرام ما بين عائر إلى كذا فمن أُحدث حدثا او آوى محدثا فعليه لعنة الله، والملائكة والناس اجمعين، لا يقبل منه عدل ولا صرف، وذمة المسلمين واُحدة يسعى بها ادناهم فمن اخفر مسلما فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين، لا يقبل منه صرف ولا عدل ومن والى قوما بغير إذن مواليه فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين، لا يقبل منه صرف ولا عدل۔" صحيح بخاری ۳۱۷۹

ہم سے محمد بن کثیر نے بیان کیا، کہا ہم کو سفیان ثوری نے خبر دی، انہیں اعمش نے، انہیں ابراہیم تیمی نے، انہیں ان کے باپ (یزید بن شریک تیمی) نے اور ان سے علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بس یہی قرآن مجید لکھا اور جو کچھ اس ورق میں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مدینہ عائر پہاڑی اور فلاں (کدیٰ) پہاڑی کے درمیان تک حرم ہے۔ پس جس نے یہاں (دین میں) کوئی نئی چیز داخل کی یا کسی ایسے شخص کو اس کے حدود میں پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور انسان سب کی لعنت ہو گی۔ نہ اس کا کوئی فرض قبول اور نہ نفل قبول ہو گا۔ اور مسلمان پناہ دینے میں سب برابر ہیں۔ معمولی سے معمولی مسلمان (عورت یا غلام) کسی کافر کو پناہ دے سکتے ہیں۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کا کیا ہوا عہد توڑ ڈالے اس پر اللہ اور ملائکہ اور انسان سب کی لعنت ہو گی، نہ اس کی کوئی فرض عبادت قبول ہو گی اور نہ نفل! اور جس غلام یا لونڈی نے اپنے آقا اپنے مالک کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو اپنا مالک بنا لیا، تو اس پر اللہ اور ملائکہ اور انسان سب کی لعنت ہو گی، نہ اس کی کوئی فرض عبادت قبول ہو گی اور نہ نفل۔

(مرفوع) حدثنا قبيصة بن عقبة، قال: حدثنا سفيان، عن الاعمش، عن عبد الله بن مرة، عن مسروق، عن عبد الله بن عمرو، ان النبي صلى الله عليه وسلم، قال:" اربع من كن فيه كان منافقا خالصا، ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها إذا، اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر"، تابعه شعبة، عن الاعمش۔ (صحيح بخاری ۳۴)

ہم سے قبیصہ بن عقبہ نے یہ حدیث بیان کی، ان سے سفیان نے، وہ اعمش بن عبید اللہ بن مرہ سے نقل کرتے ہیں، وہ مسروق سے، وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار عادتیں جس کسی میں ہوں تو وہ خالص منافق ہے اور جس کسی میں ان چاروں میں سے ایک عادت ہو تو وہ (بھی) نفاق ہی ہے، جب تک اسے نہ چھوڑ دے۔ (وہ یہ ہیں) جب اسے امین بنایا جائے تو (امانت میں) خیانت کرے اور بات کرتے وقت جھوٹ بولے اور جب (کسی سے) عہد کرے تو اسے پورا نہ کرے اور جب (کسی سے) لڑے تو گالیوں پر اتر آئے۔ اس حدیث کو شعبہ نے (بھی) سفیان کے ساتھ اعمش سے روایت کیا ہے۔

وعن انس رضى الله عنه قال: قلما خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا قال: «لا إيمان لمن لا امانة له ولا دين لمن لا عهد له» . رواه البيهقي في شعب الإيمان۔ (مشکوۃ المصابیح ۳۵)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی ہمیں خطاب کرتے تو فرماتے: ”جس شخص میں امانت نہیں اس کا ایمان ہی نہیں، اور جس شخص کا عہد نہیں اس کا کوئی دین ہی نہیں۔“ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

سورۃ انفال میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان موجود ہے جس میں معاہدے کو ختم کرنے بارے میں میں ہے۔

خلاصہ بحث؛ وعدہ، عہد اور معاہدہ

پچھلے صفحات میں معاہدات کے اصولوں کو قرآن کریم اور سنتِ مبارکہ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں معاہدات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ ایک منظم، مستحکم، اور پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے اسلامی تعلیمات کو مؤثر انداز میں فروغ دینا ناگزیر ہے، تاکہ سماجی، سیاسی، معاشی، اور اخلاقی تعلقات کی مضبوط بنیاد استوار کی جاسکے۔

وعدے اور معاہدے انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطحوں پر کیے جاتے ہیں، اور دونوں صورتوں میں ان کی پاسداری لازم ہوتی ہے۔ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اتحاد کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ امن کی بنیاد ہے، کیونکہ جنگ اور تنازعات اسلام کا مقصد نہیں۔ لہٰذا، لوگوں کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے اور سماجی، مذہبی، سیاسی و مالی معاملات میں امن و استحکام برقرار رکھنے کے لیے معاہدات ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، اور ان کی پابندی بھی انتہائی ضروری ہے۔

***

پیامبرِ رحمت ﷺ اور خارجہ پالیسی

کسی بھی پالیسی، خواہ وہ خارجہ ہو یا داخلہ، ذاتی ہو یا اجتماعی، اس کی بنیاد ان نکات پر رکھی جاتی ہے جو کسی ادارے یا فرد کی آرزو یا مطمحِ نظر ہوتے ہیں۔ سفارت کاری بھی انھی بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے جو خود مختاری کے احترام، تنازعات کے پُرامن حل اور باہمی تعاون کو ترجیح دیتی ہے۔ اس کی تائید مختلف نظریات سے ہوتی ہے جو ریاستی طرزِ عمل اور بین الاقوامی تعلقات کی وضاحت کرتے ہیں۔ بااصول سفارت کاری کے طور طریقے قوموں کے درمیان مؤثر روابط کے لیے ناگزیر ہیں، جو انھیں پیچیدہ عالمی چیلنجوں سے نمٹنے اور پائیدار تعلقات استوار کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ عالمی سطح پر امن، استحکام اور تعاون کے فروغ میں اس کے کردار کو سمجھنے کے لیے خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے ان بنیادی عناصر کا ادراک ضروری ہے۔

اسی تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی خارجہ پالیسی انھی مقاصد کو مدنظر رکھ کر تشکیل دی جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں اور جنھیں آپ ﷺ نے خود بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کے خدوخال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ ﷺ کی زندگی کے مقاصد پر غور کیا جائے۔

مقصد یا مطمحِ نظر وہ بنیاد ہے جس کے تحت کوئی بھی کام سرانجام دیا جاتا ہے یا کوئی ہدف حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جو ہر انسان کے عمل، سوچ اور فیصلوں کے اسباب کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ آپ ﷺ کا مقصدِ حیات کیا تھا؟ آپ ﷺ کی بعثت کا مطمحِ نظر کیا تھا؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے سب سے

مؤثر ذریعہ قرآن پاک اور آپ ﷺ کے فرامین ہیں۔ قرآن مجید میں اس حوالے سے متعدد آیات موجود ہیں، جن میں سے چند کا حوالہ یہاں دیا جا رہا ہے۔

قرآن مجید اور مقصدِ بعثت نبوی ﷺ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ (الحدید ۵۷:۲۵)

ہم نے اپنے رسُولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اُس کو دیکھے بغیر اُس کی اور اُس کے رسُولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوّت والا اور زبردست ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔ (الصف ۶۱:۹)

وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

سورۃ الاحزاب ۳۳ (۴۵-۴۸) میں بھی آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۔ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۔ (احزاب ۳۳:۴۵-۴۸)

"اے نبیؐ، ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اور ہر گز نہ دبو کفار و منافقین سے، کوئی پروا نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دے۔"

اس کے علاوہ سورۃ انبیا میں بھی واضح طور پر آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کی گیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (انبیا ۲۱: ۱۰۷)

اے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔

قرآن میں آپ ﷺ کی بعثت کے بعد جس طرح کا معاشرہ وجود میں آیا، اس کا ذکر قرآن کچھ یوں کرتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (سورۃ آلِ عمران ۳: ۱۰۳)

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقے میں نہ پڑو اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا اس طرح اللہ اپنی

نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمھیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡہِمۡ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ ۚ وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ۔ (سورۃ آل عمران ۳: ۱۶۴)

درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا۔ (الاحزاب ۳۳: ۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا اُمیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ۔ (الانبیا ۲۱: ۱۰۷)

اے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔

لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ۔ (سورۃ التوبہ ۹: ۱۲۸)

دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

سورۃ احزاب میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آپ ﷺ کے متعلق فرمان (آیت نمبر ۴۵تا۴۸):

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۔ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۔ (احزاب ۳۳: ۴۵-۴۸)

"اے نبیؐ، ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اور ہر گز نہ دبو کفار و منافقین سے، کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دے۔"

حدیث مبارکہ اور مقصد بعثتِ نبوی

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ، حَدَّثَنَا فُلَيْحٌ، حَدَّثَنَا هِلَالُ بْنُ عَلِيٍّ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ:" كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَمَنْ يَأْبَى؟، قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى".

ہم سے محمد بن سنان نے بیان کیا، ان سے فلیح بن سلیمان نے بیان کیا، ان سے ہلال بن علی نے بیان کیا، ان سے عطاء بن یسار نے اور ان سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ساری امت جنت میں جائے گی سوائے ان کے جنھوں نے انکار کیا۔" صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! انکار کون کرے گا؟ فرمایا

"جو میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا اس نے انکار کیا۔ البخاري/كِتَاب الِاعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ/ح: ۷۲۸۰

ان آیات اور احادیث کے علاوہ بھی کئی مقامات پر بعثتِ نبوی ﷺ کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام پہنچانا تھا۔ یعنی جہالت میں ڈوبے ہوئے باطل نظام کا خاتمہ کر کے ایسا نظام قائم کرنا جہاں اللہ سبحان. و تعالیٰ کی حاکمیت ہو اور اسی کے احکام نافذ کیے جائیں۔ آپ ﷺ کا مشن یہ تھا کہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ ان کا حقیقی خالق اور مالک صرف اللہ ہے، اور محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قیامت کے برپا ہونے، مردوں کے زندہ کیے جانے، اور جزا و سزا کے دن کے بارے میں انھیں خبردار کرنا بھی آپ ﷺ کی دعوت کا اہم حصہ تھا۔

ان آیات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد دین کو غالب کرنا تھا۔ اسی لیے جب بھی آپ ﷺ نے غیر مسلموں سے معاملات طے کیے، سب سے پہلے انھیں اللہ کا پیغام پہنچایا۔ پھر جہاں تک ممکن ہوا، اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کا عملی منصوبہ بھی ترتیب دیا اور اسے نافذ کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ اگر اس راہ میں جنگ ناگزیر ہوئی، تو آپ ﷺ نے اس سے بھی گریز نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ کا بنیادی طریقہ کار ہمیشہ دعوت اور حکمت بھری گفتگو پر مبنی ہوتا تھا، اور جب تمام پرامن ذرائع ختم ہو جاتے اور مخالفین شدید رکاوٹیں کھڑی کرتے، تو آپ ﷺ دفاعی اقدامات کے لیے بھی تیار ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی میں ہمیشہ بات چیت کو ترجیح دی گئی، اور اکثر معاملات پرامن مذاکرات سے ہی حل ہو جاتے، جبکہ جنگ کی نوبت بہت کم آتی۔

آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے یہ نہایت حسین پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کوئی پالیسی نہیں بنائی اور نہ ہی کسی ذاتی فائدے کے لیے کوئی معاہدہ کیا۔ آپ ﷺ کا ہر فیصلہ اور ہر اقدام صرف اور صرف دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے تھا۔ آپ ﷺ بارہا یہ وضاحت فرماتے کہ اسلام کی سربلندی در حقیقت دنیا میں امن و محبت کے قیام کی ضمانت ہے۔ اس کے نتیجے میں عدل و انصاف کا بول بالا ہوگا، انسانوں کے درمیان مساوات کو فروغ ملے گا، رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق ختم ہو گی، عزتِ نفس کی مکمل پاسداری ہو گی، اور ہر شخص کو اپنے عقیدے کے مطابق ذاتی معاملات طے کرنے کی آزادی حاصل ہو گی۔ ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق عبادت کر سکے گا، اپنی مرضی سے کاروبار کر سکے گا، اور اس کی جان و مال محفوظ رہیں گے۔ کسی کو اس کے مال پر ناجائز قبضہ کرنے یا اس کی مرضی کے بغیر اسے نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہو گی۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا مقصد انسانوں کی زندگیوں میں ایک مکمل اور ہمہ جہت انقلاب برپا کرنا تھا۔ آپ ﷺ کو ایک اخلاقی و روحانی پیشوا، قانون ساز، اور امن و انصاف کے علمبردار کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات اور عملی زندگی نے اربوں انسانوں پر گہرا اثر ڈالا ہے اور آج بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو سمجھنا اسلام کی بنیادوں اور ان اصولوں کو جاننے میں بصیرت فراہم کرتا ہے جو ایمان اور اس کے پیروکاروں کی زندگیوں کی تشکیل میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

خلاصۂ بحث بعثت نبی ﷺ کا مقصد

قرآن مجید کی مذکورہ آیات اور کئی دیگر مقامات کے علاوہ متعدد احادیث میں بھی

نبی کریم ﷺ کی بعثت کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ان آیات اور احادیث کا خلاصہ کچھ یوں کیا جاسکتا ہے:

توحید کا پیغام—آپ ﷺ نے اپنے مشن کا آغاز توحید کی دعوت اور ایک خدا کی عبادت کے پیغام کے ساتھ کیا۔یہی پیغام اسلام کی بنیاد ہے۔

عدل و مساوات کی ترویج—نبی اکرم ﷺ نے انصاف، مساوات، اور تمام انسانوں کے حقوق کے احترام پر زور دیا۔آپ ﷺ نے جبر اور امتیازی سلوک کے خلاف جدوجہد کی اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو انسانی اقدار پر مبنی ہو۔

حسنِ اخلاق اور عمدہ برتاؤ—رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اخلاق اور حسن سلوک کی بہترین مثال ہے۔آپ ﷺ نے محبت، مہربانی، اور درگزر کا عملی نمونہ پیش کیا اور دوسروں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تعلیم دی۔

ریاستی بندوبست اور قیادت—آپ ﷺ نہ صرف ایک عظیم مذہبی رہنما تھے بلکہ بہترین حکمران اور منتظم بھی تھے۔آپ ﷺ نے معاشرتی اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ایک اسلامی ریاست قائم کی۔

ثقافتی اور سماجی اثرات—نبی کریم ﷺ کی تعلیمات نے اسلامی معاشروں کی ثقافت، فن، اور ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے، جن کی جھلک آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے کامل نمونہ—مسلمان آپ ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے ایک کامل نمونہ سمجھتے ہیں اور اپنے طرزِ عمل، گفتگو، اور عقائد میں آپ ﷺ کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

روزمرہ زندگی کے لیے رہنمائی—آپ ﷺ نے نماز، روزہ، صدقہ، کاروباری اخلاقیات، شادی، اور دیگر دنیاوی و دینی معاملات میں واضح رہنمائی عطا فرمائی۔

اسلامی قوانین کا تعین—آپ ﷺ کی بعثت کی برکت سے مسلمانوں کو اپنے معاشرتی اور قانونی اصولوں کو ترتیب دینے کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں مکمل رہنمائی حاصل ہوئی۔

اللہ سے قریبی تعلق—آپ ﷺ کی تعلیمات کے ذریعے مسلمانوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے قریبی تعلق استوار کرنے کے طریقے سیکھنے کا موقع ملا۔

سماجی ہم آہنگی اور مساوات—آپ ﷺ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے جہاں سماجی ہم آہنگی، مساوات، اور اتحاد ہو۔ جہاں رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر تقویٰ کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ برتاؤ کیا جائے اور اخوت و بھائی چارے کو فروغ دیا جائے۔

کمزوروں کا خیال اور فلاحی نظام—نبی کریم ﷺ ایسا معاشرہ چاہتے تھے جہاں کمزوروں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھا جائے، اور ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل ریاست اور اہلِ ثروت کی مشترکہ ذمہ داری ہو۔

درج بالا نکات کا خلاصہ اگر ایک جملے میں کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کے لیے محبت، دیانت، انصاف، اور انسانیت کا درس دیتی ہے۔ آپ ﷺ اللہ کی رحمت اور ہدایت کا مظہر ہیں، اور آپ ﷺ کی تعلیمات ہر دور کے انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

ان نکات کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ہم نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد دینِ اسلام کی سربلندی پر رکھی، نہ کہ ذاتی، خاندانی، یا قبائلی مفادات پر۔

یہی سب سے اہم بات ہے کہ اگر آج ہم آپ ﷺ کی سنت کے مطابق اپنے مسائل حل کرنا چاہیں تو یہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ یقینی بھی ہے۔ اور اگر ہم یہ نیت بھی کرلیں کہ ہم آپ ﷺ کی سنت پر عمل کر رہے ہیں، تو ہمارے مسائل بھی حل ہوں گے (ان شاء اللہ) اور ہمیں سنت کی پیروی کا اجر بھی ملے گا۔ یوں ہم اطاعت و اتباعِ نبوی ﷺ کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہوں گے۔

اطاعتِ نبوی ﷺ کے بارے میں فارسی کا ایک خوب صورت شعر ہے:

در دل ما عشق تو هست، در زبان ماذکر تو
اطاعت تو رامی کنیم، ای سرورما، نبی اکرم

(ہمارے دل میں آپ ﷺ کی محبت ہے، ہماری زبان پر آپ ﷺ کا ذکر ہے، ہم آپ ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں، اے ہمارے آقا، نبی اکرم ﷺ!)

***

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے بنیادی اصول و قوانین

پچھلے صفحات میں ہم نے نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے تین اہم پہلوؤں پر بات کی تھی۔

پہلا اللہ کے کلمے کی سربلندی: آپ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنا تھا۔

دوسرا دعوت کے ذرائع: آپ ﷺ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے خود لوگوں تک پیغام پہنچایا، سفیر بھیجے، خطوط لکھے، وفود کا استقبال کیا، اور ہر وہ ممکنہ ذریعہ استعمال کیا جس سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا جا سکتا تھا۔

تیسرا جنگ اور اس کے اصول: جب حالات ناگزیر ہوئے اور جنگ سے گریز ممکن نہ رہا، تو آپ ﷺ نے جنگ بھی کی اور اس کے اصول و ضوابط بھی بیان فرمائے۔

اب ان تینوں پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بیان کیا جائے گا کہ نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر کس طرزِ عمل کو اختیار کیا، کس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے احکامات اور اپنی کہی ہوئی باتوں پر عمل کیا، اور کیسے مخالفین سے جنگیں بھی لڑیں اور معاہدے بھی کیے۔ یہ جاننا بھی بے حد ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی ان تمام کوششوں کے نتیجے میں جزیرہ نما عرب میں کس طرح ایک خوب صورت، پرامن، اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے والا، مالی طور پر مستحکم اور خوشحال معاشرہ تشکیل پایا۔ یہ ایک ایسی ریاست تھی جو ارد گرد کے

ممالک سے دوستانہ تعلقات رکھتی تھی اور سب سے بڑھ کر ایک ایسی مثال بن گئی جو رہتی دنیا تک کے لیے ایک ماڈل ہے۔

نبی کریم ﷺ کی دعوتِ حق اور اس کی حکمتِ عملی

یہاں ایک نہایت اہم نکتہ قابلِ غور ہے، جو نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری سے جڑا ہوا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کسی ریاست سے وابستہ ہوتی ہے، ریاست ہی اسے ترتیب دیتی ہے اور پروان چڑھاتی ہے۔ یہ بات درست ہے اور میں بھی اس سے متفق ہوں۔ تاہم، میں یہاں خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو نبی کریم ﷺ کے اس مبارک دور سے بھی جوڑنا چاہتا ہوں جب آپ ﷺ نے ابھی مدینہ کی ریاست کی بنیاد نہیں رکھی تھی۔

میرے خیال میں جس دن آپ ﷺ نے مکہ میں یہ اعلان کیا کہ: ''میں نبی ہوں، میرا رب اللہ ہے، میں اس کا بندہ ہوں، میں اس کی اطاعت کا پابند ہوں، وہ مجھ پر وحی نازل کرتا ہے، اور میں تمام لوگوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں'' اسی لمحے سے نہ صرف مکہ بلکہ پورے جزیرہ نما عرب میں آپ ﷺ نے اپنی ایک ریاست کا اعلان کر دیا تھا۔ اس ریاست کے چیدہ چیدہ شہری آپ ﷺ کے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو گئے، آپ ﷺ اس کے سربراہ تھے، اور آپ ﷺ نے باطل کی بالادستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

دو ریاستوں کا قیام

اب ایک طرف آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی تھے، اور دوسری طرف مشرکین، عیسائی، مجوسی، یہودی، اور کفارِ مکہ تھے۔ بظاہر شہر ایک ہی تھا، مگر اس میں دو نظریاتی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نبی

کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا آغاز اسی دن سے کرتا ہوں جس دن آپ ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تھا۔

اسی دور میں آپ ﷺ نے معاہدے بھی کیے، جن میں سب سے اہم بیعتِ عقبہ کے معاہدے تھے۔ اسی دور میں آپ ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے ربط و تعلق قائم کیا اور اپنے کچھ ساتھیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی۔ لہٰذا، میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی بنیاد اسی دن رکھ دی گئی تھی جس دن آپ ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔

آپ ﷺ اور قریشِ مکہ

جب نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے قریبی افراد سے اس کا ذکر کیا۔ ان میں سب سے اہم آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ تھیں، جنھوں نے نہ صرف آپ ﷺ کی بات پر مکمل یقین کیا بلکہ آپ ﷺ کو تسلی دی اور آپ کی بھرپور حمایت بھی کی۔ ابتدائی تین سال تک آپ ﷺ نے اپنے پیغام کو محدود رکھا اور قریبی حلقے میں ہی دعوت دیتے رہے۔ پھر اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچائیں۔ اس بارے میں چند آیات قرآن مجید میں نازل ہوئیں، جن میں واضح طور پر آپ ﷺ کو لوگوں کو اللہ کے دین کی دعوت دینے کا حکم دیا گیا۔

اس حکم کے بعد، آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے قبیلے قریش کو توحید کی دعوت دی۔ ابتدا میں آپ ﷺ نے لوگوں کو صرف ایک اللہ کی عبادت اور اخلاقی اصلاح کی طرف بلایا۔ آپ ﷺ نے انھیں بت پرستی، ناانصافی، اور غیر اخلاقی طور طریقوں کو ترک کرنے کی تلقین کی اور ایک پاکیزہ اور منصفانہ زندگی گزارنے کی دعوت دی۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے جو رحمان ور حیم ہے

يٰۤاَيُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۔ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۔ (مدثر ۷۴: ۱تا۳)

اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے۔ اٹھو اور خبر دار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔

سید مودودی لکھتے ہیں کہ پہلی وحی کے بعد یہ وہ ابتدائی آیات ہیں جن میں آپ ﷺ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بات عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے کہا گیا ہے۔اسی طرح کا حکم سورۃ الحجر میں بھی ملتا ہے؛

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۔ اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ ۔ الَّذِيۡنَ يَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ‌ ۚ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ ۔ وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ ۔ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَكُنۡ مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ ۔ وَاعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰى يَاۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ ۔ (الحجر ۱۵: ۹۴-۹۹)

پس اے نبیؐ، جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمھاری طرف سے ہم اُن مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمھارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ۔

اور اُس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔

اسی طرح کا ایک واضح حکم ہمیں سورۃ الاعراف میں بھی ملتا ہے؛

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (الاعراف۷:۱۵۸)

اے محمدؐ، کہو کہ ''اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔''

قرآنِ مجید میں ہمیں کئی مقامات پر ایسی آیات ملتی ہیں، جو نبی کریم ﷺ کی بعثت اور دعوتِ دین کے حوالے سے رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ جب آپ ﷺ کو کھلے عام تبلیغ کا حکم ملا، تو آپ ﷺ نے اس فریضے کو کس طرح نبھایا؟ یہ ایک تفصیلی موضوع ہے، جس پر آئندہ صفحات میں گفتگو کی جائے گی۔

یہ مکی دور کے وہ دس سال ہیں، جب آپ ﷺ کو کھلے عام اسلام کی دعوت دینے کا حکم ملا۔ (مکی دور کل تیرہ سال پر محیط تھا، جس میں ابتدائی تین سال دعوتِ اسلام پوشیدہ رکھی گئی، جبکہ اس کے بعد کے دس سال علانیہ تبلیغ کی گئی)۔ اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، جس کا تفصیلی ذکر آگے کیا جائے گا۔

قریش مکہ کا ملا جلا ردِ عمل

جب نبی اکرم ﷺ نے کھلے عام اسلام کی دعوت دینی شروع کی، تو قریش کے اکثر سرداروں اور بااثر لوگوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنے آبائی دین اور روایات پر قائم رہنے پر بضد تھے، اور آپ ﷺ کی تعلیمات کو اپنے اقتدار اور مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔

تاہم، قریش میں ایسے لوگ بھی موجود تھے، جنھوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد ابتدا میں کم تھی، مگر وہ سچے دل سے آپ ﷺ کے پیغام پر ایمان لائے۔

قریش کے اکثر لوگ خود کو دینِ ابراہیمی کے پیروکار سمجھتے تھے، لیکن حقیقت میں انھوں نے اس میں بے شمار بدعات اور شرکیہ رسومات شامل کر لی تھیں۔ قرآنِ مجید میں ان لوگوں کو "مشرکین" کہا گیا، جیسا کہ سورۃ الحجر میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہی مشرکینِ مکہ، جو اپنے آباؤ اجداد کے دین پر قائم رہنے کے دعوے دار تھے، نبی کریم ﷺ کی دعوت کے سب سے بڑے مخالف بن کر سامنے آئے اور آپ ﷺ کی تبلیغ کو روکنے کے لیے سخت رویہ اپنایا۔

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (الحجر ۱۵: ۹۴)

پس اے نبیؐ، جس چیز کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو[32]۔

---

32 مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے؛ لہذا جس بات کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے اسے علی الاعلان لوگوں کو سنا دو، اور جو لوگ (پھر بھی) شرک کریں، ان کی پرواہ مت کرو۔

قریشِ مکہ کی سخت مخالفت—وجوہات کا تجزیہ

جب نبی کریم ﷺ نے اسلام کی دعوت دی، تو قریشِ مکہ نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا۔ اس مخالفت کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، لیکن میرے نزدیک اس کی پانچ بڑی وجوہات یہ تھیں:

1. **سماجی حیثیت اور مذہبی اتھارٹی کا خوف:** قریشِ مکہ، بطورِ متولیانِ خانہ کعبہ، پورے جزیرۃ العرب میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ ایک طاقتور قبیلہ تھے اور مذہبی پیشوائی کے باعث عزت اور اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوتِ توحید نے نہ صرف ان کے عقائد بلکہ ان کی مذہبی قیادت کو بھی چیلنج کیا۔ انھیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر لوگ آپ ﷺ کی بات مان لیں گے، تو وہ اپنا سماجی رتبہ کھو بیٹھیں گے۔

2. **معاشی مفادات اور تجارتی خدشات:** مکہ ایک بڑا تجارتی مرکز تھا اور یہاں ہر سال عرب کے مختلف قبائل حج اور زیارت کے لیے آتے، جس سے قریش کو بے شمار اقتصادی فوائد حاصل ہوتے تھے۔ خانہ کعبہ میں رکھے گئے بتوں کی پرستش کی وجہ سے بھی مکہ کی معیشت پروان چڑھ رہی تھی۔ قریشِ مکہ کو خدشہ تھا کہ اگر لوگ اسلام قبول کر لیں اور بت پرستی چھوڑ دیں، تو ان کا مذہبی، تجارتی اور اقتصادی نظام تباہ ہو جائے گا، اور وہ اپنی مالی برتری کھو بیٹھیں گے۔

3. **جابرانہ سماجی نظام کو خطرہ:** بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت مکہ میں شدید سماجی نابرابری، غلامی، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی اور کمزوروں پر ظلم عام تھا۔ قریش کے سردار اپنے جبر اور استحصال کے عادی ہو چکے تھے اور کوئی بھی ان کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے جب ان تمام مظالم کے خلاف آواز بلند

کی اور سماجی مساوات، عدل اور حقوق کی بات کی، تو قریشِ مکہ کی اشرافیہ نے اسے اپنے اقتدار اور استحصال کے لیے ایک خطرہ سمجھا۔

4. مذہبی عقائد پر حملے کا احساس: مکہ کے لوگ صدیوں سے مشرکانہ عقائد پر عمل پیرا تھے اور متعدد بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے انھیں اللہ کی وحدانیت کی دعوت دی، بت پرستی کو باطل قرار دیا، اور انھیں توحید کی راہ اپنانے کا حکم دیا، تو انھوں نے اسے اپنے مذہبی عقائد پر ایک براہِ راست حملہ سمجھا۔

5. سیاسی اجارہ داری کا خاتمہ: قریشِ مکہ کا پورے شہر پر مکمل کنڑول تھا۔ وہ اپنی سیاسی اور قبائلی اجارہ داری کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ انھیں یہ خوف تھا کہ اگر لوگ اسلام قبول کر لیں گے، تو اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا، اور وہ اپنی برتری کھو دیں گے۔ اس لیے انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی دعوت کو ایک بھیانک خطرہ سمجھا اور ہر ممکن طریقے سے اسے دبانے کی کوشش کی۔

یہ وہ چند بنیادی وجوہات تھیں جن کی بنا پر مکہ معظمہ میں بسنے والے مشرکینِ مکہ اور ان کے حلیف قبائل نے مل کر نبی اکرم ﷺ کی شدید مخالفت شروع کی۔ ممکن ہے کہ اس کے علاوہ بھی ہوں، جو میں سمجھ سکا وہ میں نے بیان کر دیا ہے۔ ابتدا میں قریشِ مکہ کے اکثر لوگوں نے محض زبانی مخالفت کی اور آپ ﷺ کی دعوت کو جھٹلانے کی کوشش کی، لیکن جب انھیں محسوس ہوا کہ اسلام کا پیغام لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہا ہے، تو انھوں نے ظلم و ستم کی راہ اختیار کر لی۔ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کو سخت اذیتیں دی گئیں، سماجی بائیکاٹ کیا گیا، اور ہر ممکن طریقے سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ ان مظالم کے

نتیجے میں پہلے کچھ صحابہ کرامؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، اور بعد میں نبی اکرم ﷺ اور ان کے ساتھی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

مکی دور میں اسلام کی پیش رفت

مکی دور میں، باوجود شدید مزاحمت کے، نبی اکرم ﷺ کی دعوت خاموشی سے دلوں میں جگہ بناتی رہی۔ اگرچہ ابتدائی طور پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کم تھی، لیکن یہ وہی لوگ تھے جو بعد میں اسلامی ریاست کے قیام کی بنیاد بنے۔ ان میں آپ ﷺ کے قریبی ساتھی، رشتہ دار، اور دیگر اہلِ مکہ شامل تھے۔

یہ تھا ایک مختصر جائزہ اس ردِ عمل کا جو قریشِ مکہ کی طرف سے آیا۔ لیکن اس پورے عرصے میں نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف دعوتِ دین کا کام جاری رکھا بلکہ ایک مؤثر خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اصول بھی مرتب کیے، جس نے آگے چل کر اسلام کی عظیم کامیابیوں کی راہ ہموار کی۔

***

نبوت کے پہلے تین سال؛ انفرادی دعوت کا دور

سیرت کی بیشتر کتب میں یہ مذکور ہے کہ جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ سب سے پہلے گھر تشریف لائے اور اس واقعے کا ذکر اپنی اہلیہ حضرت خدیجہؓ سے کیا۔ بعد ازاں، آپ ﷺ نے اپنے چند قریبی عزیزوں سے بھی اس بارے میں گفتگو کی۔

علامہ شبلی نعمانی اور سید سلمان ندوی نے اپنی تصنیف میں نبوت کے ابتدائی تین سالوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے حضرت علیؓ، جو آپ ﷺ کی آغوش میں تربیت پا رہے تھے، ایمان لائے۔ ان کے ساتھ حضرت زیدؓ، جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور نہایت قریبی ساتھی تھے، اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسلام قبول کیا، جن کی دعوت پر حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہؓ اور دیگر کئی افراد مسلمان ہوئے۔

یہاں ان شخصیات کے قبولِ اسلام کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ نے ابتدائی تین سال کس حکمتِ عملی کے تحت گزارے؟ اس دوران آپ ﷺ نے کھلے عام دعوت دینے کے بجائے انفرادی طور پر مخصوص افراد تک پیغام پہنچایا۔

رازدارانہ دعوت: حکمتِ عملی کا پہلا مرحلہ

یہ تین سال، جن میں چالیس سے پچاس افراد نے اسلام قبول کیا، رازداری کے ساتھ دعوت دینے کا زمانہ تھا۔ اس دوران صرف وہ لوگ مسلمان ہوئے جو پہلے ہی

مشرکانہ عقائد سے نالاں تھے اور حق کی تلاش میں تھے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بھی ابھی کھلے عام تبلیغ کا حکم نہیں دیا تھا، اور آپ ﷺ نے صبر و حکمت کے ساتھ اپنی دعوت کا دائرہ بڑھایا۔ پھر جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حکم آیا تو آپ ﷺ کوہِ صفا پر چڑھے اور قریش کے لوگوں کو پکارا، انھیں توحید کا پیغام دیا اور انھیں آگاہ کیا کہ وہ باطل راستے پر گامزن ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب آپ ﷺ نے کھلے عام تبلیغ کا آغاز کیا، جو بعد میں ایک تحریک میں تبدیل ہو گئی۔

ایک نیا نقطۂ نظر: اولین سفارت کاری

میرے نزدیک، یہ نبی اکرم ﷺ کی پہلی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری تھی، جو آپ ﷺ نے نبوت کے اعلان کے بعد اختیار کی۔ ایک طرف مشرکینِ مکہ تھے، جن کے سردار ابو جہل، ابو لہب اور دیگر بااثر شخصیات تھیں، جبکہ دوسری طرف آپ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ تھے۔

دونوں گروہ اپنے نظریات کے پھیلاؤ اور بالادستی کے لیے سرگرم تھے۔ جب مسلمانوں کو ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا، تو آپ ﷺ نے اپنے کچھ ساتھیوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دی، تاکہ وہ وہاں محفوظ رہ سکیں اور اسلامی تحریک کو زندہ رکھ سکیں۔ مسلمانوں کی ہجرت کے جواب میں قریشِ مکہ نے بھی حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں اپنا مقدمہ پیش کیا، تاکہ مسلمانوں کو وہاں سے واپس بلایا جا سکے۔

یہ تمام عوامل ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ مکہ میں گویا دو ریاستیں وجود میں آچکی تھیں: ایک باطل نظریے پر قائم قریشِ مکہ کی قیادت، اور دوسری نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں ایک نیا ابھرتا ہوا نظریہ، جو آخر کار پوری دنیا میں پھیلنے والا تھا۔

اسلامی جماعت کی تشکیل: ایک حکمتِ عملی

نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا آغاز ایک منظم اور تدریجی حکمتِ عملی کے ساتھ ہوا۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے اپنے گھر کے افراد کو دعوت دی، اور حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، اور حضرت زیدؓ نے بلا جھجک اسے قبول کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے سب سے قریبی دوست حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اس کا ذکر کیا، جنھوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اپنی کوششوں سے کئی اور اہم شخصیات کو بھی دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔ اس تدریجی حکمتِ عملی کا مقصد ایک ایسی مضبوط بنیاد رکھنا تھا جو مستقبل میں ایک بڑی تحریک کی شکل اختیار کر سکے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے دن ہی کھل کر دعوت نہیں دی، اور نہ ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فوری طور پر یہ حکم دیا کہ سب کو اکٹھا کر کے اسلام کی دعوت دی جائے۔ بلکہ، آپ ﷺ نے پہلے تین سال خاموشی اور رازداری کے ساتھ کام کیا اور ایک چھوٹی لیکن پُرعزم جماعت تشکیل دی، جس کی تعداد چالیس سے پچاس کے درمیان تھی۔

کوہِ صفا: کھلی دعوت کا آغاز

جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حکم نازل ہوا، تب آپ ﷺ کھلے عام تبلیغ کے لیے آگے بڑھے۔ آپ ﷺ کوہِ صفا پر چڑھے، قریش کو جمع کیا اور بلند آواز میں اپنی دعوت پیش کی۔ یہ واقعہ اسلامی تاریخ میں ایک اہم موڑ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اسی لمحے سے مسلمانوں کی جماعت کا کھلا ظہور ہوا۔ یہ ایک نہایت ہی اہم فیصلہ تھا کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ مشرکین مکہ کی طرف سے سخت ردِ عمل آ سکتا ہے۔ اس کے باوجود، آپؐ نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور حق بات کہنے میں کسی خوف کو آڑے نہیں آنے دیا۔

کوہِ صفا کا یہ اعلان صرف ایک تقریر نہیں تھی، بلکہ یہ ایک نئی انقلابی تحریک کی بنیاد تھی۔ اسی مقام سے قریش کی کھلی مخالفت کا آغاز ہوا، مگر ساتھ ہی ساتھ اسلام کے پھیلاؤ کا ایک نیا دور بھی شروع ہوا۔ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے عزم، قیادت، اور بے خوفی کی روشن مثال ہے۔ آپ ﷺ نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنی دعوت کا پیغام پہنچایا، جس کے اثرات صرف عرب تک محدود نہیں رہے، بلکہ تاریخ میں ایک زبردست تبدیلی کا پیش خیمہ بنے۔

حکمتِ نبوی ﷺ اور اس سے اخذ کردہ اسباق

رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں حکمت، تدبر اور صبر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ نے اسلامی جماعت کی تشکیل میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اقدامات کیے، جن سے آج بھی کئی اہم اسباق اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

1. **مناسب وقت تک پوشیدہ دعوت:** سب سے پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ جب تک کسی تحریک یا پیغام کے پیروکاروں کی مناسب تعداد اور طاقت نہ ہو، اس وقت تک حکمتِ عملی کے تحت خاموشی سے کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور پہلے تین سال تک اپنی دعوت کو پوشیدہ رکھا۔

2. **قبائلی نظام میں سرکردہ افراد کی اہمیت:** رسول اللہ ﷺ نے ابتدا میں جو جماعت بنائی، اس میں معاشرے کے معزز اور بااثر افراد شامل تھے۔ ان میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ اور دیگر نمایاں شخصیات شامل تھیں۔ یہ افراد اپنے قبائل میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے مسلمان ہونے کا براہِ راست اثر ان کے قبائل پر پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کیا تو کئی قبائل نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے سے گریز کیا، کیونکہ ان کے اپنے قبیلے کے کچھ لوگ بھی اسلام قبول کر چکے تھے۔ اس سے یہ

حکمتِ عملی واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی تحریک کو مضبوط کرنا ہو تو معاشرتی طور پر مؤثر افراد کو ساتھ ملانا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔

اس کی بہترین مثال حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ ہے، جو صحیح بخاری میں موجود ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رات کے اندھیرے میں نبی کریم ﷺ سے ملاقات کی اور اسلام قبول کیا۔ آپ ﷺ نے انھیں فوراً اپنے ایمان کو ظاہر کرنے سے منع کیا، مگر ان کے اصرار پر اجازت دے دی۔ جب انھوں نے حرم میں کھل کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو مشرکین مکہ نے ان پر تشدد کیا۔ حضرت عباسؓ نے قریش کو متنبہ کیا کہ قبیلہ غفار ہمارے تجارتی راستے پر واقع ہے، اگر اس قبیلے نے ہمارا راستہ بند کر دیا تو ہماری معیشت تباہ ہو جائے گی۔ قریش نے معاشی نقصان کے خوف سے حضرت ابوذر غفاریؓ کو چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ قبائلی تعلقات اور معیشت کا اسلامی دعوت پر کس قدر اثر تھا، اور آپ ﷺ نے ان عوامل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک جامع حکمتِ عملی ترتیب دی۔

3. **کمزور اور پسے ہوئے طبقے کی شمولیت:** اگرچہ آپ ﷺ نے سماج کے سرکردہ افراد کو اپنی جماعت میں شامل کیا، لیکن آپ ﷺ نے پسے ہوئے اور محروم طبقات کو بھی اپنی تحریک کا حصہ بنایا۔

حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت خبیب بن عدیؓ، حضرت بلال حبشیؓ، دیگر غلام اور کئی دیگر مظلوم افراد، یہ وہ افراد تھے جنھیں قریش معاشرتی لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے، لیکن اسلام نے انھیں عزت دی اور ایک نئی زندگی دی۔ یہی وجہ تھی کہ غریب اور غلام بڑی تعداد میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ جڑ گئے۔

مشرکین مکہ ان کمزور مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے تھے، اور قرآن میں بھی ان کے اس رویے کا ذکر آیا ہے:

''اور جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہے؟'' (سورۃ الانعام ٦: ٥٣)

یہ واقعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی بھی تحریک کو مضبوط کرنے کے لیے طاقتور اور کمزور دونوں طبقات کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی دعوتی حکمتِ عملی سے ہمیں درج ذیل چار اہم سبق ملتے ہیں:

پہلے مرحلے میں خاموشی سے کام کریں جب تک کہ جماعت مستحکم نہ ہو جائے۔ دوسرے مرحلے میں معاشرتی اور قبائلی طور پر مؤثر افراد کو شامل کرنے سے تحریک کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ کمزور اور پسے ہوئے طبقات کو ساتھ لے کر چلنا ہر تحریک کے استحکام کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ چوتھی بات جو مجھے نظر آتی ہے وہ یہ کہ ان تین سالوں میں آپ ﷺ نے جہاں ایک طرف رازداری سے اپنی جماعت کو منظم کیا۔ وہاں دوسری طرف آپ ﷺ نے علانیہ دعوت کی طرف بھی توجہ دینی شروع کر دی۔

***

اسلام کی دعوت کے علانیہ ابلاغ کی شروعات

آپ ﷺ کی بعثت کے بعد دینِ اسلام کی دعوت کا مرحلہ تدریجاً مختلف مراحل سے گزرا۔ آغاز میں یہ دعوت مخصوص اور قریبی حلقے تک محدود رہی۔ تین سال کے عرصے کے بعد اس کا دائرہ عام لوگوں تک وسیع کر دیا گیا۔ آپ ﷺ نے عوام تک بات پہنچانے کا یہ مرحلہ نہایت حکمت و بصیرت کے ساتھ ترتیب دیا گیا۔ اس کام کو کرتے ہوئے آپ ﷺ معاشرتی، ثقافتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو ہمیشہ مد نظر رکھا گیا۔

یہ بھی اسلامی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تین سالوں میں نبی اکرم ﷺ نے ابتدا میں خاموشی کے ساتھ ان افراد کو دعوت دی، جو فطرتِ سلیم کے حامل اور سچائی کے متلاشی تھے۔ آپ ﷺ کی تبلیغ کے نتیجے میں جب ایک مناسب تعداد میں افراد دینِ اسلام قبول کر چکے، تو اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے عوامی سطح پر تبلیغ کا آغاز کیا گیا۔ اس مرحلے میں آپ ﷺ نے مکہ کے مختلف اجتماعات، بازاروں اور حج کے مواقع پر قبائل کو براہِ راست مخاطب کیا، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ دینِ حق سے روشناس ہو سکیں۔ یہی وہ دور ہے جب مشرکین نے آپ ﷺ کی مخالفت شروع کیا اور ظلم وستم کا بازار گرم کیا۔ اس دور میں مشکلات اور مخالفت کے باوجود، نبی اکرم ﷺ نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی دعوت کو احسن انداز میں جاری رکھا۔

بعثت نبوی کے تین سال بعد جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ حکم آتا ہے؛

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ (الشعراء ۲۶: ۲۱۴)

اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں بیان کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کے ذریعے ایک بنیادی اصول واضح کیا ہے، جو انسانی کامیابی اور نجات کے لیے نہایت اہم ہے۔ اس اصول کے مطابق، اللہ کے ہاں نسبی تعلق کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ ہر فرد کا اپنا عقیدہ اور عمل ہی اس کے انجام کا تعین کرے گا۔

اسی اصول کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ سب سے پہلے اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو دینِ اسلام کی دعوت دیں اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دیں کہ اگر ان کا اپنا عقیدہ اور طرزِ عمل درست نہ ہوا، تو رسول اللہ ﷺ سے قرابت داری بھی انھیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکے گی۔ یہ تعلیم اسلامی تصورِ عدل اور ذمہ داری کو اجاگر کرتی ہے، جہاں ہر فرد کو اپنے ایمان اور اعمال کی بنیاد پر ہی جواب دہ ٹھہرایا جائے گا، نہ کہ خاندانی نسبت یا حسب و نسب کی بنیاد پر۔

سید مودودی اس آیت کی تشریح میں مزید لکھتے ہیں:

> "معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار کر صاف صاف کہہ دیا کہ یا بنی عبد المطلب، یا عباس، یا صفیة عمة رسول الله، یا فاطمة بنت محمد، انقذوا انفسکم من النار، فانی لا املك لکم من الله شیئاً، سلونی من مالی ما شئتم۔ "اے بنی عبد المطلب، اے عباس، اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ محمد ﷺ کی بیٹی، تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو"۔

صفی الرحمن مبارکپوریؒ نے اس آیت کے نزول کے بعد چند واقعات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں؛

بہر حال اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام یہ کیا کہ بنی ہاشم کو جمع کیا، ان کے ساتھ بنی مطلب بن عبد مناف کی بھی ایک جماعت تھی۔ کل پینتالیس آدمی تھے، لیکن ابو لہب نے بات لپک لی اور بولا: دیکھو یہ تمہارے چچا اور چچیرے بھائی ہیں۔ بات کرو لیکن نادانی چھوڑ دو اور یہ سمجھ لو کہ تمہارا خاندان سارے عرب سے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا۔ اور میں سب سے زیادہ حق دار ہوں کہ تمہیں پکڑ لوں۔ پس تمہارے لیے تمہارے باپ کا خانوادہ ہی کافی ہے۔ اور اگر تم اپنی بات پر قائم رہے تو یہ بہت آسان ہو گا کہ قریش کے سارے قبائل تم پر ٹوٹ پڑیں اور بقیہ عرب بھی ان کی امداد کریں، پھر میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص اپنے باپ کے خانوادے کے لیے تم سے بڑھ کر شر (اور تباہی) کا باعث ہو گا۔

اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کر لی اور اس مجلس میں کوئی گفتگو نہ کی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دوبارہ جمع کیا اور ارشاد فرمایا: ”ساری حمد اللہ کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں۔ اور اس سے مدد چاہتا ہوں۔ اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ تنہا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہنما اپنے گھر کے لوگوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود

نہیں میں تمہاری طرف خصوصاً اور لوگوں کی طرف عموماً اللہ کا رسول (فرستادہ) ہوں۔ بخدا! تم لوگ اسی طرح موت سے دوچار ہوگے جیسے سو جاتے ہو اور اسی طرح اٹھائے جاؤ گے جس طرح سو کر جاگتے ہو۔ پھر جو کچھ تم کرتے ہو اس کا تم سے حساب لیا جائے گا۔ اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہے یا ہمیشہ کے لیے جہنم۔ اس پر ابو طالب نے کہا (نہ پوچھو) ہمیں تمہاری معاونت کس قدر پسند ہے۔! تمہاری نصیحت کس قدر قابل قبول ہے۔! اور ہم تمہاری بات کس قدر سچی مانتے جانتے ہیں۔! اور یہ تمہارے والد کا خانوادہ جمع ہے۔ اور میں بھی ان کا ایک فرد ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میں تمہاری پسند کی تکمیل کے لیے ان سب سے پیش پیش ہوں، لہذا تمہیں جس بات کا حکم ہوا ہے اسے انجام دو۔ بخدا! میں تمہاری مسلسل حفاظت و اعانت کرتا رہوں گا۔ البتہ میری طبیعت عبد المطلب کا دین چھوڑنے پر راضی نہیں ہے۔ ابو لہب نے کہا: خدا کی قسم یہ برائی ہے۔ اس کے ہاتھ دوسروں سے پہلے تم لوگ خود ہی پکڑ لوگے۔ اس پر ابو طالب نے کہا: خدا کی قسم جب تک جان میں جان ہے۔ ہم ان کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے مکہ معظمہ میں واقع ایک بلند مقام، صفا پہاڑی پر چڑھ کر وہاں کے مختلف قبائل کو نام لے کر مخاطب کیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے عربوں کے روایتی اندازِ خطاب کو اپنایا، تاکہ لوگ توجہ سے سنیں اور ان کے دلوں پر زیادہ گہرا اثر ہو۔

اس تاریخی واقعے کی تفصیلات متعدد احادیث میں بیان کی گئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے پیغام کو حکمت اور فصاحت کے ساتھ پیش

کیا، اور اہلِ مکہ کو ان کے عقائد، اعمال اور آخرت کی جواب دہی کے بارے میں خبر دار کیا۔ اس خطاب کا مقصد نہ صرف انھیں دینِ اسلام کی دعوت دینا تھا، بلکہ اس حقیقت کو بھی اجاگر کرنا تھا کہ دنیاوی نسبتیں اور قبائلی رشتے، اگر ایمان اور نیک اعمال کے بغیر ہوں، تو وہ کسی کے لیے نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ اس بارے ایک حدیث صحیح بخاری میں بھی بیان ہوئی ہے؛

(مرفوع) حدثنا یوسف بن موسی، حدثنا ابو اسامة، حدثنا الاعمش، حدثنا عمرو بن مرة، عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس رضی الله عنهما، قال: لما نزلت وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ (سورة الشعراء آیة 214)، ورهطك منهم المخلصین خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی صعد الصفا فهتف یا صباحاه، فقالوا: من هذا؟ فاجتمعوا إلیه، فقال: "ارایتم إن اخبرتکم ان خیلا تخرج من سفح هذا الجبل، اکنتم مصدقی؟" قالوا: ما جربنا علیك کذبا، قال: "فإني نذیر لکم بین یدي عذاب شدید"، قال ابو لهب: تبا لك ما جمعتنا إلا لهذا، ثم قام، فنزلت تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ (سورة المسد آیة 1)، وقد تب هکذا قراها الاعمش یومئذ. (صحیح بخاری ح نمبر: ۴۹۷۱)

ہم سے یوسف بن موسیٰ نے بیان کیا، کہا ہم سے ابواسامہ نے بیان کیا، کہا ہم سے اعمش نے بیان کیا، ان سے عمرو بن مرہ نے بیان کیا، ان سے سعید بن جبیر نے اور ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے اور اپنے گروہ کے ان لوگوں کو ڈرائیے جو مخلصین ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا پہاڑی پر چڑھ گئے اور پکارا: یاصباحاہ! قریش نے کہا یہ کون ہے، پھر وہاں سب آکر جمع ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ ایک لشکر اس پہاڑ کے پیچھے سے آنے والا ہے، تو کیا تم مجھ کو سچا نہیں سمجھو گے؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں جھوٹ کا آپ سے

تجربہ کبھی بھی نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر میں تمھیں اس سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمھارے سامنے آرہا ہے۔ یہ سن کر ابو لہب بولا: تو تباہ ہو، کیا تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا؟ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے چلے آئے اور آپ پر یہ سورت نازل ہوئی تبت یدا أبي لهب وتب الخ یعنی دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے ابو لہب کے اور وہ برباد ہو گیا۔

سید مودودی اسی آیات کی تشریح بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں؛

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگو! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ سب نے کہا ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔ آپ نے فرمایا: "اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبر دار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمدؐ، مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا۔" (اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت زہیر بن عمرو اور حضرت قبیصہ بن مخارق سے مروی ہیں)۔

نبی ﷺ کے تبلیغی اصول اور سفارتی بصیرت

مکہ میں دعوتِ اسلام: حکمت، تدبر اور سفارتی حکمتِ عملی

رسول اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تبلیغِ اسلام کے لیے نہایت حکمت، تدبر اور دانش مندی سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے مکہ کے قبائلی ڈھانچے، روایات اور انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی دعوت کو عام لوگوں تک پہنچایا، جو ایک مؤثر سفارتی حکمتِ عملی کی عکاسی کرتا ہے۔

1. قبائلی روایات کے مطابق دعوت کا آغاز: عرب معاشرے میں کسی اہم پیغام کو عام کرنے کے لیے روایتی طور پر ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی روایت کو اپناتے ہوئے کوہِ صفا پر چڑھ کر مکہ کے مختلف قبائل کو بلایا۔ یہ اقدام اسلامی تاریخ میں عوامی دعوت کے پہلے منظم مرحلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل آپ ﷺ نے دو مرتبہ اپنے قبیلے، بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب، کو خصوصی طور پر دعوت دی تھی۔

اس دعوت کے دوران بعض افراد نے سخت مخالفت کا اظہار کیا، جبکہ حضرت ابو طالب نے اپنی حمایت کا یقین دلایا اور فرمایا کہ جب تک وہ زندہ ہیں، آپ ﷺ کی حفاظت کریں گے۔ یہ حمایت سیاسی اور قبائلی اعتبار سے ایک بڑی کامیابی تھی، کیونکہ اس سے مکہ کے دیگر قبائل کو یہ پیغام ملا کہ نبی کریم ﷺ کو بنی ہاشم کی پشت پناہی حاصل ہے، جس نے قریش کو کھلی دشمنی سے وقتی طور پر باز رکھا۔

2. قبائل کو نام لے کر پکارنا: ایک مؤثر سفارتی حکمتِ عملی: عرب معاشرت میں قبیلے کی شناخت اور اس کا اجتماعی تشخص نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ کسی معاملے میں قبیلے

کا براہِ راست ذکر کرنا، ان کے لیے عزت و فخر کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی اصول کو اپناتے ہوئے قبائل کو نام لے کر مخاطب کیا، جس کے نتیجے میں لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ یہ ایک منفرد سفارتی حکمتِ عملی تھی، کیونکہ اس طریقے سے ہر قبیلہ خود کو اس دعوت میں شامل محسوس کرنے لگا اور اس پر توجہ دینے پر مجبور ہوا۔

3. عوامی نفسیات کا مدبرانہ استعمال: جب لوگ جمع ہو گئے تو نبی اکرم ﷺ نے ایک نفسیاتی حکمت عملی استعمال کرتے ہوئے ان سے ایک سوال کیا:

”اگر میں تمہیں خبردار کروں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے، تو کیا تم میری بات مانو گے؟“

یہ سوال اس پس منظر میں نہایت اہمیت کا حامل تھا کہ پہاڑ زیادہ بلند نہ تھا اور لوگ بخوبی دیکھ سکتے تھے کہ وہاں کوئی لشکر موجود نہیں۔ اس کے باوجود اہلِ مکہ نے متفقہ طور پر جواب دیا:

”ہاں، ہم آپ کی بات کو ضرور سچ مانیں گے، کیونکہ ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔“

یہاں نبی کریم ﷺ نے اپنی سچائی اور دیانت داری کو بطور دلیل پیش کیا، کیونکہ اہلِ مکہ پہلے ہی آپ ﷺ کی راست بازی کا اعتراف کر چکے تھے۔ اس حکمتِ عملی نے ایک مضبوط ذہنی بنیاد قائم کر دی، جس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کو اللہ کے دین کی دعوت دی:

”میں تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمہیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔“

یہ حکمتِ عملی ایک منطقی ترتیب کی حامل تھی، جس میں سب سے پہلے لوگوں کی تصدیق حاصل کی گئی، پھر انھیں دینِ حق کی طرف متوجہ کیا گیا۔

4. سفارت کاری اور دعوتِ دین کی حکمت: یہ واقعہ سفارت کاری اور حکمتِ عملی کی ایک شاندار مثال پیش کرتا ہے، جہاں نبی اکرم ﷺ نے دعوت کے لیے مکہ کے سماجی ڈھانچے اور قبائلی اصولوں کو بروئے کار لایا۔ اس دعوت میں درج ذیل سفارتی پہلو نمایاں تھے:

رائج سماجی و قبائلی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پیغام کی ترسیل: عرب معاشرت میں قبیلے کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں براہِ راست مخاطب کرنا۔ عوامی نفسیات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنی سچائی کو پہلے ثابت کرنا، پھر پیغام دینا۔

یہی اصول آج کے دور میں بھی کامیاب سفارت کاری، عوامی تعلقات اور مؤثر گفتگو کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس واقعے سے درج ذیل بنیادی نکات اخذ کیے جا سکتے ہیں:

دعوت یا نظریہ پیش کرتے وقت مخاطبین کی ثقافت اور روایات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

کسی بھی پیغام کی قبولیت کے لیے انسانی نفسیات کے مؤثر استعمال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سچائی اور دیانت داری وہ بنیادی عناصر ہیں جو کسی بھی دعوت یا نظریے کو استحکام بخشتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے مکہ کے رائج طریقوں، قبائلی اصولوں اور انسانی نفسیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جس انداز میں دعوت کا آغاز کیا، وہ آج کے دور میں بھی مؤثر سفارت کاری اور سماجی تعلقات کی ایک اعلیٰ مثال کے طور پر موجود ہے۔

***

مشرکین مکہ کے مظالم اور نبی کریمؐ کی حکمتِ عملی

جب نبی کریم ﷺ نے نبوت کے تیسرے سال کھلے عام دعوتِ توحید کا آغاز فرمایا تو مشرکین مکہ نے مختلف حربے آزمائے۔ ابتدا میں، انھوں نے آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا مذاق اڑایا (نعوذ باللہ) تاکہ اس دعوت کو بے وقعت ثابت کر سکیں۔ جب اس طریقے سے انھیں کامیابی نہ ملی تو انھوں نے ظلم و ستم کا راستہ اختیار کیا اور مسلمانوں پر بے پناہ تشدد کیا۔ جب اس سے بھی ان کا مقصد پورا نہ ہوا تو آخر میں، انھوں نے مصالحت کی پیش کش کی، تاکہ کسی طرح نبی کریم ﷺ کو اپنی دعوت سے باز رکھا جا سکے۔

ایک اور حدیث میں مشرکین مکہ کے مظالم کا ذکر ملتا ہے صحیح بخاری (۳۱۸۵)

حدثنا عبدان بن عثمان، قال: اخبرنی ابی، عن شعبة، عن ابی إسحاق، عن عمرو بن میمون، عن عبد الله رضی الله عنه، قال: بینا رسول الله صلی الله علیه وسلم ساجد وحوله ناس من قریش من المشرکین إذ جاء عقبة بن ابی معیط بسلی جزور فقذفه علی ظهر النبی صلی الله علیه وسلم فلم یرفع راسه حتی جاءت فاطمة علیها السلام فاخذت من ظهره ودعت علی من صنع ذلك، فقال النبی صلی الله علیه وسلم: " اللهم علیك الملا من قریش، اللهم علیك ابا جهل بن هشام وعتبة بن ربیعة وشیبة بن ربیعة وعقبة بن ابی معیط وامیة بن خلف او ابی بن خلف، فلقد رایتهم قتلوا یوم بدر فالقوا فی بئر غیر امیة او ابی، فإنه كان رجلا ضخما فلما جروه تقطعت اوصاله قبل ان یلقی فی البئر.

ہم سے عبدان بن عثمان نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ

نے خبر دی، انھیں شعبہ نے، انھیں ابواسحاق نے، انھیں عمرو بن میمون نے اور ان سے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ مکہ میں (شروع اسلام کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے اور قریب ہی قریش کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر عقبہ بن ابی معیط اونٹ کی اوجھڑی لایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر اسے ڈال دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدے سے اپنا سر نہ اٹھا سکے۔ آخر فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر سے اس اوجھڑی کو ہٹایا اور جس نے یہ حرکت کی تھی اسے برا بھلا کہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بددعا کی کہ اے اللہ! قریش کی اس جماعت کو پکڑ۔ اے اللہ! ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، عقبہ بن ابی معیط، امیہ بن خلف یا ابی بن خلف کو برباد کر۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ سب بدر کی لڑائی میں قتل کر دیے گئے۔ اور ایک کنویں میں انھیں ڈال دیا گیا تھا۔ سوائے امیہ یا ابی کے کہ یہ شخص بہت بھاری بھر کم تھا۔ جب اسے صحابہ نے کھینچا تو کنویں میں ڈالنے سے پہلے ہی اس کے جوڑ جوڑ الگ ہو گئے۔

آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ پر ظلم و ستم کا یہ سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا۔ اس دوران مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی تھی، بلکہ صبر اور استقامت کا حکم تھا۔ تاہم، اس زمانے کے حالات اور مشرکین مکہ کے مظالم کے حوالے سے قرآن مجید میں کئی آیات نازل ہوئیں۔

اس دور میں نازل ہونے والی آیات میں پانچ طرح کے احکامات نمایاں طور پر ملتے ہیں:

- توحید: اللہ کی واحدانیت پر مضبوط یقین رکھنا اور ہر قسم کے شرک سے اجتناب کرنا۔
- صبر: مشکلات، ظلم اور تکالیف کے باوجود ثابت قدمی اختیار کرنا۔
- سماجی انصاف اور اخلاقی تعلیمات: اعلیٰ اخلاق، عدل وانصاف اور حق گوئی کو فروغ دینا۔
- نماز: عبادت اور روحانی قوت کے ذریعے صبر واستقامت کو تقویت دینا۔
- استقامت: حق کی راہ پر ہر حال میں مضبوطی سے قائم رہنا۔

ان احکامات کی روشنی میں، نبی کریم ﷺ نے مشرکین مکہ کے رویے کا حکمت اور تدبر کے ساتھ سامنا کیا اور اپنی حکمت عملی، یعنی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری، انھی اصولوں کی بنیاد پر ترتیب دی۔ اس بارے چند آیات درج ذیل ہیں۔

سورۃ اخلاص میں فرمایا گیا[33]:

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ۔ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔

کہو، وہ اللہ ہے، یکتا (۱) اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں (۲) نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد (۳) اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے (۴)

یہ بھی قرآن مجید میں کہا گیا کہ یہ پہلی بار نہیں ہوا کہ ہم نے آپ ﷺ کو بھیجا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم مختلف قوموں کی طرف اپنے رسول بھیج چکے ہیں۔ اس سے قرآن مجید انبیاء کا مشن واضح کرتا ہے۔

---

[33] بقول ڈاکٹر طاہر القادری: اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ سورہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور بعض کے نزدیک مدینہ طیبہ میں۔ کتب حدیث میں دونوں قسم کی روایات موجود ہیں۔
https://www.irfan-ul-quran.com/urdu/Surah-al-Ikhlas-with-urdu-translation

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔ سورہ الانبیاء ۲۱:۷

اور اے محمدؐ، تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔

اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اہلِ کتاب (یہودی اور عیسائی) بھی موجود تھے۔ اسی لیے مشرکین مکہ سے کہا گیا کہ آپ ﷺ پہلے نبی نہیں ہیں۔ آپ ﷺ سے پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔ مکی دور میں جب آپ ﷺ پر ظلم و ستم ہو رہا تھا، اسی دور کے بارے میں سورۃ المزمل میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ایک فرمان ملتا ہے؛

يٰۤاَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ۔ قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۔ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۔ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ۔ اِنَّا سَنُلۡقِىۡ عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيۡلًا ۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِىَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا ۔ اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا ۔ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ اِلَيۡهِ تَبۡتِيۡلًا ۔ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا ۔ وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا ۔ وَذَرۡنِىۡ وَالۡمُكَذِّبِيۡنَ اُولِى النَّعۡمَةِ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِيۡلًا ۔

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو، ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں، در حقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے، دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں، اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو، وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا اُسی کو اپنا وکیل بنالو، اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ

اُن سے الگ ہو جاؤ، اِن جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انھیں ذرا کچھ دیر اسی حالت پر رہنے دو۔

اسی طرح کا حکم ہمیں سورہ عنکبوت میں بھی ملتا ہے؛

الٓمّٓ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ۔ (العنکبوت ۲۹: ۱تا۱۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا، حالاں کہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون، اور کیا وہ لوگ جو بُری حرکتیں کر رہے ہیں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں. جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے، اور اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا، اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز

ہے اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے اُن کی برائیاں ہم ان سے دُور کر دیں گے اور انھیں اُن کے بہترین اعمال کی جزادیں گے۔ ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبُود) کو شریک ٹھیرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے، پھر میں تم کو بتادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو،اور جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے اُن کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے،لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ میں ایمان لایا اللہ پر مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ ”ہم تو تمہارے ساتھ تھے" کیا دنیاوالوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے؟اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون۔

ان آیات کے علاوہ بھی قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی رہنمائی فرمائی کہ مشرکین مکہ کے ساتھ کس طرح معاملات کیے جائیں۔ انھی الہامی ہدایات کی روشنی میں آپ ﷺ نے اپنی حکمت عملی وضع کی اور اگلے دس سال (بعثتِ نبوی کے ابتدائی تین سال نکال کر) اسی پر عمل پیرا رہے۔

ان واقعات کو بیان کرنے کا بنیادی مقصد نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو سمجھنا ہے، جو آج بھی ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

***

دعوتِ اسلام کے ابلاغ میں نبیؐ کی حکمت و بصیرت

اعلانِ نبوت کے تیسرے سال سے لے کر تیرہویں سال تک کئی اہم واقعات اور چیلنجز پیش آئے۔ اس دوران نبی کریم ﷺ نے ان مشکلات کا سامنا کس حکمت عملی سے کیا اور اپنی دعوت کو کس طرح مؤثر انداز میں لوگوں تک پہنچایا، اس پر اگلے صفحات میں تفصیل سے گفتگو ہو گی۔ یہی موضوع اس مقالے کے بنیادی نکات میں سے ایک ہے۔

اس دور کے مطالعے سے جو نکات سامنے آتے ہیں، میں انھیں دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں:

جب مشرکینِ مکہ نے آپ ﷺ کی مخالفت میں اقدامات کیے تو آپ ﷺ نے ان کا کیا جواب دیا؟

اس دوران آپ ﷺ نے وہ کون سے اہم اقدامات کیے جنھیں آپ ﷺ نے اپنی دعوت کے فروغ کے لیے ضروری سمجھا؟

قریشِ مکہ کا ملا جلا ردِ عمل

جب آپ ﷺ نے کھلے عام اسلام کی دعوت دی تو قریش کے بیشتر سربراہوں کی طرف سے سخت مزاحمت دیکھنے میں آئی۔ اس کے باوجود، قریش میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جنھوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا، اگرچہ ان کی تعداد مخالفین کے مقابلے میں کم تھی۔ اس وقت مکہ میں بسنے والے اکثر لوگ خود کو دینِ ابراہیمی کے پیروکار سمجھتے تھے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے دین میں بے شمار نئی بدعات اور گمراہ کن عقائد شامل کر لیے تھے۔ اسی وجہ سے انھیں ""مشرکین"" کہا جاتا تھا۔ سورۃ الحجر میں بھی ان کے لیے یہی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

مشرکینِ مکہ نے آپ ﷺ کی دعوت کا سختی سے مقابلہ کیا اور آپ ﷺ کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۔ (الحجر ۱۵: ۹۴)

پس اے نبی، جس چیز کا تمھیں حکم دیا جارہا ہے، اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروانہ کرو۔

قریشِ مکہ نے سخت رویہ کیوں اپنایا؟

قریشِ مکہ کی شدید مخالفت کے پیچھے کئی وجوہات تھیں، جن میں سے پانچ اہم ترین کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ ممکن ہے کہ دیگر وجوہات بھی ہوں، لیکن ان بنیادی نکات کی بنا پر مکہ میں بسنے والے مشرکین اور ان کے حلیف قبائل نے مل کر آپ ﷺ کی مخالفت شروع کی۔

ابتدا میں قریش نے محض زبانی مخالفت پر اکتفا کیا، لیکن جب ان کا یہ حربہ ناکام رہا تو انھوں نے ظلم و ستم کا راستہ اختیار کیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ پر شدید مظالم ڈھائے گئے۔ اسی ظلم و ستم کے نتیجے میں پہلے مسلمانوں نے حبشہ اور بعد میں مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ مکی دور میں، آپ ﷺ کے قریبی ساتھیوں اور چند دیگر افراد کے علاوہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد محدود رہی۔

یہ مختصر تذکرہ تھا اس ردِ عمل کا جو مشرکینِ مکہ کی طرف سے سامنے آیا۔ لیکن اس تیرہ سالہ جدوجہد میں آپ ﷺ نے کس طرح ایک بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ترتیب دی، اور ان سخت حالات میں بھی اپنی دعوت کے کام کو جاری رکھا، اس کا تفصیلی ذکر سیرت کی مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب سیرت سرورِ عالم میں اس دور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مشرکینِ مکہ کے مظالم پر آپ ﷺ کا طرزِ عمل

جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے سخت مخالفت، ظلم و ستم، اور بے جا سختیوں کا سامنا کرنا پڑا تو آپ ﷺ نے صبر، درگزر اور ثابت قدمی کے ساتھ ان تمام مشکلات کو جھیلا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف ان تمام مظالم کو برداشت کیا، بلکہ اپنے اخلاق، رحم دلی اور بردباری سے لوگوں کے دلوں کو جیتنے کی کوشش جاری رکھی۔ آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل کے چند نمایاں پہلو درج ذیل ہیں:

صبر و تحمل کا بے مثال مظاہرہ: آپ ﷺ نے زبانی اور جسمانی اذیتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا، بدلے میں کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا۔

باوجود اس کے کہ دشمن آپ ﷺ کی جان کے درپے تھے، آپ ﷺ نے اپنے مشن میں استقامت دکھائی اور دعوتِ اسلام کو مسلسل پھیلانے میں لگے رہے۔

معافی اور شفقت پر مبنی طرزِ عمل: آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے بدلہ نہ لیا، بلکہ ہمیشہ درگزر سے کام لیا۔

دشمنی اور نفرت کا جواب محبت اور مہربانی سے دیا، جو اسلامی تعلیمات کا ایک بنیادی اصول ہے۔

دعاؤں اور امید کا سہارا: آپ ﷺ نے ہمیشہ اپنے مخالفین کے لیے دعا فرمائی، حتیٰ کہ طائف میں ظلم سہنے کے بعد بھی ان کے لیے ہدایت کی دعا کی۔

آپ ﷺ کو یقین تھا کہ اگر آج نہیں تو کل ان ہی لوگوں یا ان کی اولاد میں سے کئی لوگ اسلام قبول کریں گے، جو بعد میں صحیح ثابت بھی ہوا۔

حکمت اور بصیرت کے ساتھ دعوت کا کام جاری رکھا: توحید، سماجی انصاف، اور اخلاقی درستی جیسے بنیادی اسلامی اصولوں کی تبلیغ کسی بھی موقع پر ترک نہ کی۔

مشرکین کی سخت مزاحمت کے باوجود میل ملاقات، مکالمے، اور تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے۔

دیانت اور اخلاقی برتری پر ثابت قدمی: آپ ﷺ نے ہمیشہ سچائی، دیانت اور ایمانداری پر کاربند رہتے ہوئے اسلام کا پیغام پہنچایا۔

آپ ﷺ کی قیادت اور اخلاقی برتری آج بھی دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

ہجرت کا فیصلہ

جب مشرکین کے مظالم حد سے بڑھ گئے اور مسلمانوں کی جانوں کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تو آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے صحابہ کرام کو مدینہ ہجرت کی اجازت دی۔

یہ ہجرت اسلامی ریاست کے قیام اور دعوت کے تسلسل کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ یہ تمام واقعات اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مشرکینِ مکہ کے سخت رویے کا جواب صبر، درگزر، اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ذریعے دیا۔ آپ ﷺ نے ہر موقع پر امن، مفاہمت، سچائی اور راست بازی کا مظاہرہ کیا اور یہی طرزِ عمل ہر اس مسلمان کے لیے مشعلِ راہ ہے جو چاہتا ہے کہ اسلام کا پیغام ہر انسان تک پہنچے۔

یہ تھا آپ ﷺ کا مشرکینِ مکہ کے رویے کے خلاف ردِ عمل۔ اب، میں ان کوششوں کا ذکر کروں گا جو آپ ﷺ نے اسلام کی ترویج کے لیے کیں۔ تمام واقعات کا احاطہ ممکن نہیں، تاہم چند اہم واقعات کو زمانی ترتیب کے لحاظ سے بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

حضرت ابو طالب اور مشرکینِ مکہ کے مکالمے

سیرت ابن ہشام میں حضرت ابو طالب اور مشرکینِ مکہ کے درمیان ہونے والی تین اہم ملاقاتوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ان مکالموں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو روکنے کے لیے مختلف طریقے آزمائے۔ابتدا میں، انھوں نے آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اختیار کیا۔جب اس سے انھیں کوئی فائدہ نہ ہوا تو جسمانی اور معاشرتی تشدد کا راستہ اپنایا۔اس کے بعد، جب یہ حربہ بھی ناکام ثابت ہوا، توانھوں نے لالچ اور دباؤ ڈالنے کی حکمتِ عملی اختیار کی۔

یہ وہ وقت تھا جب حضرت ابو طالب بقیدِ حیات تھے اور آپ ﷺ کو ان کی مکمل حمایت حاصل تھی۔چونکہ وہ بنی ہاشم کے سردار تھے، اس لیے مشرکینِ مکہ نے ان سے گفت وشنید کرنے کا فیصلہ کیا۔ابن ہشام نے ان ملاقاتوں کی تفصیل بیان کی ہے، تاہم یہاں میں ان مذاکرات کے دوران آپ ﷺ کی حکمتِ عملی پر روشنی ڈالنے کے لیے اس ایک واقعے کا مختصر خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔

مشرکینِ مکہ کے وفود اور ان کے مطالبات

ابن ہشام کے مطابق، مشرکینِ مکہ کے سردار تین مرتبہ حضرت ابو طالب کے پاس وفد کی صورت میں آئے۔انھوں نے حضرت ابو طالب سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے ابو طالب! آپ ہمارے قبیلے میں معزز ترین شخصیت ہیں، ہم سب آپ کی عزت کرتے ہیں اور آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ہم نے کئی بار آپ سے کہا ہے کہ آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے دین کے خلاف بولنے سے روکیں۔وہ ہمارے معبودوں کی بے حرمتی کرتا ہے، ہمارے آباؤ

اجداد کے عقائد کو رد کرتا ہے اور ہمارے مذہب کی مخالفت کرتا ہے، جو ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔ لیکن آپ نے ہماری کوئی بات نہیں سنی اور نہ ہی انھیں روکنے کی کوشش کی۔ اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے، اور خدا کی قسم! ہم اپنے معبودوں کی توہین، اپنے آباؤ اجداد کے دین کی مخالفت، اور اپنے عقائد کی بے عزتی ہر گز برداشت نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے انھیں نہ روکا تو ہم آپ سے، آپ کے بھتیجے سے، اور ان کے ساتھیوں سے جنگ کریں گے، یہاں تک کہ یا تو ہم فنا ہو جائیں گے یا تم!"

مشرکینِ مکہ کی دھمکیوں کے بعد، حضرت ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ سے بات کی۔ آپ ﷺ نے نہایت حوصلے اور عزم کے ساتھ اپنے چچا سے فرمایا:

"چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں، تب بھی میں اللہ کے پیغام کو پہنچانے سے باز نہیں آؤں گا۔ میں اپنی آخری سانس تک اپنا مشن جاری رکھوں گا، چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے!"

یہ سن کر حضرت ابو طالب نے کہا:

"خدا کی قسم! میں تمہاری حمایت کبھی نہیں چھوڑوں گا، اور نہ ہی تمہیں کسی قسم کی تکلیف پہنچنے دوں گا!"

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکافرون نازل فرمائی، جس میں دو ٹوک الفاظ میں واضح کر دیا گیا کہ حق اور باطل کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔

یہ آیات ایک حتمی اعلان تھیں کہ اسلام اور شرک کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی، اور نبی کریم ﷺ اپنی دعوت سے ہر گز پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۔ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔

کہہ دو کہ اے کافرو، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو، اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں، اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے، اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

مشرکینِ مکہ کی ناکام حکمتِ عملی اور نظریاتی جنگ

نبی کریم ﷺ نے مشرکینِ مکہ پر یہ بات بالکل واضح کر دی تھی کہ حق اور باطل کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی، اور نظریات پر کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن نہیں۔ اسے ہم کسی بھی ریاست کی نظریاتی سرحدوں کے دفاع کے مترادف کہہ سکتے ہیں۔ جب مشرکینِ مکہ نے تشدد اور ظلم و ستم کے باوجود آپ ﷺ کو اپنے مشن سے روکنے میں ناکامی دیکھی، تو انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا—لالچ اور مراعات کی پیشکش۔ انھوں نے آپ ﷺ کو مال و دولت، سرداری، اور کسی بھی عورت سے شادی کی پیشکش کی، لیکن ان کے تمام حربے ناکام رہے۔ حضرت ابو طالب کا شاندار جواب بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک موقع پر مشرکینِ مکہ نے حضرت ابو طالب سے کہا: "ہم اپنا ایک نوجوان تمہیں دے دیتے ہیں، تم اسے اپنی سرپرستی میں لے لو، اور اس کے بدلے میں تم محمد (ﷺ) کو ہمارے حوالے کر دو!"

حضرت ابو طالب نے اس پر انتہائی خوب صورت اور دوٹوک جواب دیا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے بیٹے کو پالوں اور تم میرے بھتیجے کو قتل کر دو؟ خدا کی قسم! ایسا کبھی نہیں ہو گا!''

یہ جواب مشرکینِ مکہ کے لیے ایک واضح پیغام تھا کہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت بنی ہاشم کے لیے کسی بھی قیمت پر قابل سودے بازی نہیں تھی۔

شعبِ ابی طالب اور بنی ہاشم کا مقاطعہ

ابن ہشام کے مطابق، اس واقعے کے بعد مشرکینِ مکہ کی دشمنی صرف نبی کریم ﷺ تک محدود نہ رہی، بلکہ انھوں نے بنی ہاشم کے پورے قبیلے کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ انھوں نے بنی ہاشم کے خلاف سماجی اور معاشی مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا اور انھیں شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا۔ جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا، اس دور میں مکہ میں دو متحارب گروہ سامنے آ چکے تھے۔ ایک گروہ کی قیادت نبی کریمؐ فرما رہے تھے، جبکہ دوسرے گروہ میں مشرکینِ مکہ کے مختلف سردار شامل تھے، جن میں کوئی ایک لیڈر نمایاں نہیں تھا۔

ظاہری طور پر یہ دو گروہ تھے، لیکن ان کی طاقت میں واضح فرق تھا۔ مشرکینِ مکہ کو عددی برتری، مال و دولت اور سماجی اثر ورسوخ حاصل تھا، جبکہ نبی کریمؐ اور آپ کے ساتھیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کے باوجود، ان کا ایمان، صبر، استقامت، اور نظریاتی مضبوطی ہی وہ اصل طاقت تھی جس نے بالآخر حق کو غالب کر دیا۔

مشرکین کی ریاست اور اسلامی ریاست

ہر ریاست کی دو سرحدیں ہوتی ہیں: ایک جغرافیائی اور دوسری نظریاتی۔ اسی طرح مکہ معظمہ میں بھی دو نظریاتی ریاستیں موجود تھیں، جن کی دونوں فریق اپنی اپنی سطح پر حفاظت کر رہے تھے۔ البتہ جغرافیائی لحاظ سے ایک ریاست غالب تھی، جبکہ دوسری کے پاس اپنا کوئی مستقل خطہ نہیں تھا۔ وہ بھی اسی شہر میں رہ رہے تھے۔ ان کی جدوجہد کا مقصد اس شہر پر حقِ حکمرانی حاصل کرنا تھا، جو مشرکینِ مکہ کو کسی صورت قبول نہ تھا۔ مشرکین مکہ کے ساتھ مذاکرات کے دوران آپ ﷺ نے اپنی نظریاتی سرحدوں کا پوری ثابت قدمی کے ساتھ دفاع کیا اور یہ واضح کیا کہ اگر کسی ریاست کا نظریہ کمزور پڑ جائے تو اس کی بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ریاست کے لیے اس کا نظریہ اس کے جغرافیے سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

ریاست کی نظریاتی سرحدوں کا تحفظ کیوں ضروری ہے؟

کسی بھی ریاست کی نظریاتی سرحدوں کا تحفظ متعدد وجوہات کی بنا پر انتہائی اہمیت رکھتا ہے، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

ریاست کا وجود اس کے نظریے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

ایک ریاست کا نظریہ اس کی اقدار، عقائد اور اصولوں کی وضاحت کرتا ہے، جو اس کے شہریوں کو یکجا رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی ریاست کی اولین ذمہ داری اپنے نظریے کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی جھلک ہمیں اس گفتگو میں نظر آتی ہے جو آپ ﷺ نے حضرت ابو طالب سے کی۔

معاشرتی ہم آہنگی اور استحکام: کسی ریاست کا نظریہ معاشرے میں مشترکہ اصولوں اور اقدار کو فروغ دیتا ہے، جو سماجی ہم آہنگی کے قیام میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہی نظریہ تنازعات کے حل اور امن و استحکام کے فروغ میں بھی مدد دیتا ہے۔

قومی سلامتی اور تحفظ: نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ ریاست خود کو بیرونی اثرات، نظریاتی حملوں، پروپیگنڈے اور بغاوت جیسے خطرات سے محفوظ رکھ سکے۔ اس کی عملی مثال ہمیں ان تیرہ سالوں میں ملتی ہے جب کوئی بھی صحابی کسی بھی قسم کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔

مضبوط نظریاتی ریاست کی بنیاد: آپ ﷺ نے اپنے نظریے کا دفاع جس استقلال کے ساتھ کیا اور کسی بھی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا، اسی استقامت نے ایک مضبوط نظریاتی ریاست کے قیام کی بنیاد رکھی۔

نظریاتی ریاست کی جغرافیائی تحدید: یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکہ میں آپ ﷺ کی نظریاتی ریاست کو کوئی جغرافیائی برتری حاصل نہیں تھی۔ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھی صرف چند گھروں تک محدود تھے، جن میں سب سے اہم حضرت ارقم کا گھر تھا، جسے آج ہم "دارِ ارقم" کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی وہ مقام تھا جہاں ابتدائی اسلامی تعلیمات دی جاتی تھیں اور تحریکِ اسلام کے بنیادی اصول مرتب کیے گئے۔

مکہ میں دو ریاستوں کا قیام

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، مکہ میں دو ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ ایک ریاست کو افرادی قوت اور مالی وسائل میں برتری حاصل تھی، اور اس میں مختلف قبیلوں کے نمایاں افراد بھی شامل تھے۔ دوسری جانب، مسلمانوں کا گروہ تھا، جس کی تعداد محض چالیس کے قریب تھی۔ اس میں غریب اور کمزور افراد بھی شامل تھے اور کچھ بااثر شخصیات بھی۔ اس نازک صورت حال میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے

مکہ کے اندر کچھ مقامات کو اپنی تحریک کے لیے منتخب فرمایا۔ ان میں سب سے اہم حضرت ارقمؓ کا گھر تھا، جو اسلام کے ابتدائی دور میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

پروفیسر محمد اکرم ورک اپنے مضمون میں مکہ معظمہ کے ان اہم مقامات کا ذکر کرتے ہیں جہاں آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ قیام فرمایا کرتے تھے۔ ان کے مطابق، دارِ ارقم حضرت ارقم بن ابی ارقمؓ کا مکان تھا، جو اولین مسلمانوں میں شامل تھے۔ یہ مکان کوہِ صفا کے دامن میں واقع تھا، جہاں کئی افراد نے اسلام قبول کیا۔ بعد میں، اسی مقام کی یادگار کے طور پر بابِ علیؓ کے قریب ایک دروازے کو "بابِ ارقم" کا نام دیا گیا[34]۔

میں اس گھر کو محض ایک عام مکان نہیں سمجھتا، بلکہ میں اسے اُس وقت کی اسلامی ریاست کا مرکز قرار دوں گا، جسے ہم ایک صدر مقام بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہیں پر آپ ﷺ اپنے ساتھیوں سے مشاورت فرمایا کرتے، درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے اور اہم فیصلے صادر فرماتے۔ اس لحاظ سے دارِ ارقم، اسلام کی پہلی درسگاہ اور ایک محفوظ پناہ گاہ بھی تھا، جہاں مشکل حالات میں مسلمان پناہ لیتے تھے۔ پروفیسر ورک کے مطابق، مکہ میں کچھ دیگر مقامات بھی اسلامی تحریک کے مراکز کے طور پر استعمال ہوتے رہے، مگر سب سے زیادہ اہمیت دارِ ارقم کو حاصل تھی۔

دارِ ارقم کی تاریخی اہمیت اس واقعے سے بھی واضح ہوتی ہے کہ یہیں حضرت ابوذر غفاریؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میرے علم کے مطابق (اور ممکن ہے کہ کوئی اور بھی ہو)، حضرت ابوذر غفاریؓ وہ پہلے شخص تھے جو مکہ سے باہر آباد کسی قبیلے کی طرف سے آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہوئے۔ وہ حضرت علیؓ کی رہنمائی میں، رات کے اندھیرے میں آپ ﷺ سے ملاقات کے لیے پہنچے اور

---

[34] مکی عہد نبوت کے اہم دعوتی و تبلیغی مراکز، پروفیسر محمد اکرم ورک اشریعہ اکادمی، جلد ۱۴۔

اسلام قبول کیا۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ تھا کیونکہ یہ مشرکینِ مکہ سے باہر کسی اور قبیلے کے فرد سے آپ ﷺ کا پہلا براہِ راست سفارتی رابطہ تھا۔

یہ آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور سفارت کاری کا ایک نمایاں پہلو تھا کہ آپ ﷺ نے دوسرے قبائل کے افراد کو نہایت محبت و اخلاص سے خوش آمدید کہا اور انھیں اپنی جماعت میں شامل فرمایا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی اسلام قبولیت کے بعد، ان کی تبلیغی کوششوں سے ان کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

دارِ ارقم — نظریاتی ریاست کی بنیاد

میں جس نکتے کو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر ریاست کی جغرافیائی حدود ہوتی ہیں۔ مکہ معظمہ میں، آپ ﷺ نے دارِ ارقم کی شکل میں ایک گھر کو اپنی ریاست کا مرکز قرار دیا اور وہیں سے اپنی تحریک کی قیادت کی۔ اس گھر پر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کو مکمل اختیار حاصل تھا، اس لیے یہ محض ایک گھر نہیں تھا، بلکہ اسلامی نظریے پر قائم ہونے والی پہلی ریاست کا ابتدائی مرکز تھا۔

میری رائے میں، دارِ ارقم کا قیام آپ ﷺ کی بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا نمایاں ثبوت ہے۔ جب آپ ﷺ نے اس مخصوص مقام کو اپنا مرکز بنایا، تو جزیرۃ العرب میں یہ پیغام دے دیا کہ مکہ میں مشرکین کے مقابلے میں ایک نئی نظریاتی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اس گھر میں حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے مہمانوں کا استقبال کر کے، آپ ﷺ نے اہلِ عرب پر یہ واضح کر دیا کہ اسلام ایک مستقل اور علیحدہ تشخص رکھنے والی ریاست بننے جا رہا ہے، جو مشرکینِ مکہ کے تسلط سے آزاد ہو گی۔

آپ ﷺ عبادت کے لیے حرم میں تشریف لے جاتے تھے، جو ایک اہم علامتی پیغام تھا کہ حرم پر مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ اگر دارِ ارقم جیسا مرکز نہ ہوتا، تو

حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے افراد کا استقبال اور ان سے خفیہ ملاقات ممکن نہ ہوتی۔ یہ انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ان کا پورا قبیلہ، بنو غفار، مسلمان ہو گیا[35]۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بنو غفار وہی قبیلہ تھا جو اس تجارتی راستے پر آباد تھا، جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس لحاظ سے، یہ خطہ مکہ کے مشرکین کے لیے ایک معاشی شاہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا، اور بنو غفار کا اسلام قبول کرنا ان کے لیے ایک بڑا دھچکا ثابت ہوا[36]۔

دارِ ارقم کے انتخاب میں ایک اور حکمت یہ تھی کہ یہ مکہ کے ایک بااثر خاندان کا گھر تھا۔ حضرت ارقمؓ کا خاندان ایک قابلِ احترام اور مؤثر خاندان تھا، اس لیے مشرکین مکہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس گھر پر براہِ راست حملہ کرتے۔ یہ آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور دانشمندی تھی کہ آپ ﷺ نے ایک ایسا محفوظ اور موزوں مقام منتخب کیا، جو دشمنوں کے حملے سے محفوظ تھا اور جہاں سے تحریکِ اسلام کو منظم انداز میں پروان چڑھایا جا سکتا تھا۔

***

35 حافظ ادریس صاحب کی ایک تحریر بحوالہ البدایۃ والنہایۃ، ج ۱، طبع دار ابن حزم، بیروت، ص ۴۷۶)
https://dunya.com.pk/index.php/author/hafiz-muhammad-idreess/2016-08-16/16495/70005146

36 بنو غفار ایک عرب قبیلہ تھا جس کا تعلق بنو دمرہ ابن بکر سے تھا، جو عرب کے حجاز کے علاقے میں بڑے کنانہ قبیلے کی ایک شاخ ہے۔

ہجرت حبشہ

آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا شاہکار

مکہ کے مشرکین کے ظلم و ستم سے تنگ آکر، آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ سیرت کی تمام کتابوں میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے، لیکن یہاں میں اسے خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے زاویے سے دیکھنا چاہتا ہوں۔

یہ امر نہایت قابلِ غور ہے کہ ایک مشکل ترین وقت میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ایک عیسائی ریاست میں پناہ لینے کے لیے بھیجا—نہ صرف ایک بار بلکہ دو مرتبہ۔ پہلی ہجرت میں محض گیارہ مرد اور چار خواتین شامل تھے، جبکہ دوسری ہجرت میں ۸۵ مرد اور ۱۷ خواتین نے حبشہ کی طرف رخ کیا۔ حبشہ میں قیام کے دوران، یہ مہاجرین پرامن زندگی بسر کرتے رہے۔ مشرکینِ مکہ نے ان کے خلاف حبشہ کے دربار میں شکایات بھی کیں، لیکن نجاشی (حبشہ کے بادشاہ) نے ان کی بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد، ان میں سے اکثر مہاجرین مدینہ واپس آگئے۔

سیرت کے اس اہم واقعے کو سمجھنے کے لیے، ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں:

آپ ﷺ کی حبشہ کے انتخاب کی حکمت کیا تھی؟

1. یہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے لحاظ سے کیوں اہم ہے؟
2. کیا حبشہ کا انتخاب کسی تاریخی پسِ منظر کا حصہ تھا؟
3. آپ ﷺ کا حبشہ کے حکمران نجاشی سے ربط و تعلق کیسے قائم ہوا؟

یہ ہجرت، آپ ﷺ کے پہلے غیر عرب حکمران سے سفارتی رابطے کا آغاز بھی تھی۔ یہ محض ایک پناہ گزینی کا واقعہ نہیں تھا، بلکہ ایک گہری حکمتِ عملی کا حصہ تھا، جس نے بعد میں اسلامی ریاست کی بنیادوں کو مزید مضبوط کیا۔

آیئے اب اس ہجرت کے اسباب، حکمتِ عملی، اور اس کے اثرات پر تفصیلی بات کرتے ہیں۔

حبشہ کی طرف ہجرت—وجوہات اور حکمتِ عملی

اس واقعے کی تفصیلات حضرت عروہ بن زبیرؓ کی کتاب مغازی رسول اللہ ﷺ میں موجود ہیں[37]۔ ان کے مطابق، جب مکہ میں مشرکین کا ظلم انتہا کو پہنچ گیا اور مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو گئی، تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی۔

یہ ہجرت دو مرتبہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ نبوت کے پانچویں سال میں، جب چند صحابہؓ نے حبشہ کی طرف رخ کیا۔ بعد میں، مشرکینِ مکہ نے حبشہ کے بادشاہ (نجاشی) کے دربار میں مسلمانوں کے خلاف شکایات پیش کیں، مگر بادشاہ نے ان کے دلائل کو مسترد کر دیا اور مسلمانوں کو اپنی ریاست میں امن و سکون سے رہنے کی اجازت دی۔

سیرت کی کتب میں اس واقعے کی تمام جزئیات تفصیل سے موجود ہیں، لیکن یہاں میں اس واقعے کے پسِ پردہ عوامل پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ نے حبشہ کا انتخاب کن وجوہات کی بنیاد پر کیا، اس فیصلے کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اور یہ کیسے آپ ﷺ کی بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک عملی مظہر تھا؟

---

[37] مغازی رسول اللہ، مولف حضرت عروہ بن زبیرؓ، مقدمہ و تحقیق ڈاکٹر محمد مصطفےٰ الاعظمی، اردو ترجمہ محمد سعید الرحمان علوی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۸۷ء

حبشہ کا عیسائی حکمران

اس وقت حبشہ پر ایک نیک دل عیسائی شخص حکمران تھا، جسے نجاشی کہا جاتا تھا۔ نجاشی در حقیقت ان بادشاہوں کا لقب تھا، نام تو کچھ اور ہو گا۔ قریش حبشہ کی زمین سے واقف بھی تھے۔ ایک مدت سے حبشہ ان کی تجارتی منڈی تھی۔ تجارت کی غرض سے قریشِ مکہ اکثر حبشہ جاتے تھے۔ اس لیے مکہ کے لوگ حبشہ کے بارے میں مناسب معلومات رکھتے تھے۔ مکہ اور حبشہ کے درمیان میں بحرِ احمر سمندر بھی واقع ہے، جسے ریڈ سی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ بحرِ احمر کوئی ۲۲۵۰ کلومیٹر طویل اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین سو کلومیٹر چوڑا ہے۔ اس کے مشرق میں عرب اور یمن واقع ہیں جبکہ مغرب میں مصر، سوڈان، ایتھوپیا اور کئی دیگر افریقی ممالک موجود ہیں۔ عرب اور افریقہ کے درمیان سمندر بھی موجود تھا۔ سمندر پار کر کے عرب افریقہ آتے جاتے رہتے تھے۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی بارے میں لوگوں کی ایک اچھی رائے تھی کہ وہ ایک عادل حکمران ہے اور ایک آزاد ملک کا بادشاہ ہے اور مشرکین مکہ کے دباؤ سے بھی آزاد تھا۔ اب اس پر بات کریں گے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر کس طرح کی حکمت عملی اختیار کی کہ یہ ہجرت ایک کامیاب ہجرت ثابت ہوئی[38]۔

---

[38] افریقہ کے مشرقی علاقوں میں اریٹیریا، دیبوچی ایتھوپیا واقع ہیں۔ ایتھوپیا سے الگ ہونے والا ایک ملک صومالی لینڈ بھی یہیں پر ہے۔ جو میں نے سمجھا اس کے مطابق اس دور میں عرب اس علاقے کو حبشہ کہتے تھے اور بڑی دیر تک اسے ابی سینیا کا نام بھی دیا گیا۔ بعد میں جب اس علاقے میں نئے ملک بنے، تو ان کے مختلف نام رکھے گئے۔ مورخین میں سے اکثریت یہ کہتی ہے کہ موجودہ ایتھوپیا ہی وہ جگہ تھی جہاں پر صحابہ کرام ہجرت کر کے گئے تھے۔ حال ہی میں ترکی نے نجاشی بادشاہ کے دربار کی تزئین و آرائش کا کام شروع کیا ہے۔ ان کے مطابق نجاشی بادشاہ کا مزار ایتھوپیا کے صدر مقام عدیس ا- بابا سے دور نجاش شہر میں واقع ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس طرح کی سرحد بندی نہیں تھی جیسی اب ہے۔ آبادی میں بہت کم تھی۔

حبشہ ہی کیوں؟

سیرت ابن ہشام کے مطابق، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حبشہ کا بادشاہ نیک دل اور منصف مزاج ہے، اور وہاں مسلمان امن کے ساتھ رہ سکیں گے۔ یہی اصل وجہ تھی جو آپ ﷺ نے بیان فرمائی۔اس موضوع پر مختلف اہلِ علم نے تحقیق کی ہے، جن میں جعفر سبحانی بھی شامل ہیں[39]۔ان کے مطابق، ہجرتِ حبشہ کے درج ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:

1. **جزیرۃالعرب میں پناہ ممکن نہ تھی:** مشرکینِ مکہ کے اثر ورسوخ کے باعث کسی بھی عرب قبیلے نے مسلمانوں کو پناہ دینے سے گریز کیا۔قریش سے بگاڑ کی صورت میں قبائل کو مکہ آنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔

2. **مذہبی اور سماجی تعصبات:** عرب اپنی آبائی روایات اور دین سے شدید

میں نے اپنے صومالی لینڈ کے دورے میں یہ جانا کہ صومالی لینڈ میں ایک جگہ موجود ہے جہاں پر ایک مسجد واقعہ ہے جس میں دو محراب ہیں۔اس مسجد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد اس وقت یہاں موجود تھی جب مہاجرین تھے۔جب قبلے کی تبدیلی کا حکم آیا تو یہاں بھی اسی طرح سے قبلے کی تبدیلی کی گئی اس وجہ سے اس مسجد میں دو محراب ہیں۔یہ مسجد صومالی لینڈ کے ایک علاقے میں واقع ہے۔یہ سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور کے انھی چار ملکوں کے علاقے میں مہاجرین رہ رہے تھے۔اس وقت وہ کون سا شہر تھا کون سا علاقہ تھا انھیں اس کا بہت صحیح اندازہ شاید مشکل ہو۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تلاشِ روزگار کے لیے کئی شہروں میں آباد ہوں۔واللہ اعلم بالصواب

https://madainproject.com/masjid_qiblatayn_(somalia

39 Ja'far Subhani, *The Message*, publisher: Islamic Seminary Publications P O Box 5425 Karachi, Pakistan

وابستگی رکھتے تھے، اس لیے وہ کسی نئے مذہب کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔عیسائی اور یہودی بھی مسلمانوں کی میزبانی کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ وہ اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔

3. **یمن اور شام مسلمانوں کے لیے محفوظ نہ تھے:** یمن ایرانی سلطنت کے زیر اثر تھا،اور ایرانی آتش پرست مسلمانوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس کی مثال خسرو پرویز کا وہ حکم ہے، جس میں اس نے یمن کے گورنر کو آپؐ کو گرفتار کرنے کا کہا۔شام کافی دور تھا اور رومیوں کے زیرِ تسلط تھا، جو عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور ممکنہ طور پر مسلمانوں کی پناہ کے خلاف ہوتے۔یمن اور شام قریش کے تجارتی مراکز بھی تھے،اور مشرکینِ مکہ وہاں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر سکتے تھے، جیسا کہ انھوں نے حبشہ کے بادشاہ سے بھی مسلمانوں کو نکالنے کی درخواست کی تھی۔

میرے خیال میں ان عمومی وجوہات کے علاوہ، درج ذیل حکمتیں بھی کارفرما تھیں:

1. **اسلام کے عالمی ہونے کا پیغام:** مسلمانوں کا عرب سے باہر جانا ایک پیغام تھا کہ اسلام صرف جزیرۃ العرب تک محدود نہیں۔ مشرکینِ مکہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اسلام کو دبالیں گے، مگر یہ ہجرت اس دعوے کی تردید تھی۔

2. **نئی بین الاقوامی سفارت کاری:** اس وقت ایران اور روم دو بڑی طاقتیں تھیں، مگر آپ ﷺ نے ایک تیسری طاقت (حبشہ) سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے یہ ثابت کیا کہ مسلمان بھی عالمی سیاست میں کردار ادا کر سکتے ہیں۔

3. **مشرکینِ مکہ کے لیے حبشہ تک رسائی مشکل تھی:** حبشہ کا راستہ سمندر کے

ذریعے تھا، جو مشرکینِ مکہ کے لیے ایک بڑی رکاوٹ تھا۔ اگر وہ وہاں پہنچ بھی جاتے، تو غیر ملکی سرزمین پر مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرنا آسان نہ ہوتا۔

4. مشرکینِ مکہ کے لیے بڑا دھچکا: کئی نامور خاندانوں کے افراد حبشہ چلے گئے، جو مشرکین کے لیے ایک بڑی شکست تھی۔ ابو سفیان کی بیٹی، امِ حبیبہؓ، بھی ہجرت کرنے والوں میں شامل تھیں، جو قریش کے لیے ایک سخت بغاوت کے مترادف تھا۔

ہجرتِ حبشہ اور آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری

ہجرتِ حبشہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے ایک عارضی پناہ ثابت ہوئی بلکہ یہ نبی کریم ﷺ کی کامیاب خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک شاندار نمونہ بھی تھا۔ آپ ﷺ کی حکمتِ عملی کے چیدہ نکات درج ذیل ہیں:

ایک نئی عالمی طاقت سے تعلقات: آپ ﷺ نے ایک ایسی ریاست کا انتخاب کیا جو اس وقت کی دو بڑی سلطنتوں (روم اور فارس) کے زیرِ اثر نہ تھی اور مشرکینِ مکہ بھی وہاں کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ نے اسلام کی سفارت کاری کو ایک نئی سمت دی اور ایک تیسری عالمی طاقت سے تعلقات استوار کیے۔

دو مرحلوں میں ہجرت: محتاط حکمتِ عملی: پہلے ایک مختصر گروہ بھیجا گیا، تاکہ حالات کا جائزہ لیا جا سکے اور اگر خطرہ محسوس ہو تو واپسی ممکن ہو۔ جب پہلا گروہ وہاں محفوظ رہا تو ایک بڑے گروہ کو بھیجا گیا۔ یہ ایک بہترین سفارتی حکمتِ عملی تھی، جس نے ثابت کیا کہ آپ ﷺ نہ صرف مکہ میں، بلکہ بیرونِ ملک بھی اپنے ساتھیوں کے تحفظ کے لیے عملی تدابیر اختیار کرتے تھے۔

حبشہ کے بادشاہ سے براہِ راست تعلق: آپ ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ (نجاشی) کے ساتھ ذاتی تعلقات استوار کیے۔ اس کی ایک بہترین مثال آپ ﷺ کا نکاح ہے، جس کا حق مہر خود نجاشی نے ادا کیا۔

مشرکینِ مکہ کا سفارتی دباؤ اور اس کا ناکام ہونا: جب مشرکینِ مکہ نے حبشہ کے دربار میں مسلمانوں کے خلاف الزامات لگائے تو نجاشی نے ایک کھلی سماعت (public hearing) کا اہتمام کیا۔ یہ ایک سفارتی جنگ تھی جس میں دونوں فریق اپنے نظریے کے دفاع میں دلائل دے رہے تھے۔

جعفر بن ابی طالبؓ کی مدلل گفتگو اور قرآن کی تلاوت نے نجاشی کے دل پر اثر کیا اور اس نے مشرکینِ مکہ کی درخواست مسترد کر دی۔

ایک تاریخی سفارتی کامیابی: مسلمان تقریباً پندرہ سال تک حبشہ میں پرامن طور پر رہے۔ یہ اسلام کی ابتدائی سفارت کاری کی سب سے بڑی کامیابی تھی، جس نے ثابت کیا کہ آپ ﷺ صرف ایک مذہبی رہنما نہیں، بلکہ ایک عظیم مدبر، حکمتِ عملی کے ماہر اور کامیاب سفارت کار بھی تھے۔

ہجرتِ حبشہ: ہمارے لیے ایک رہنما اصول

ہجرتِ حبشہ نبی کریم ﷺ کی حکمتِ عملی، خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک عملی نمونہ ہے، جو آج بھی اقلیتوں کے لیے قابلِ تقلید رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس واقعے سے درج ذیل اہم اسباق اخذ کیے جا سکتے ہیں:

1. **اپنے نظریے پر ثابت قدمی:** کسی بھی قوم یا ریاست کے لیے اپنے نظریے پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے، چاہے اس کے لیے ہجرت جیسا سخت فیصلہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مہاجرینِ حبشہ نے اپنے دین اور عقیدے کی حفاظت کے لیے مشکلات برداشت کیں لیکن اپنے اصولوں سے انحراف نہ کیا۔

2. طاقت کا مقابلہ حکمت و دلیل سے کرنا: اگر دشمن طاقتور ہو تو براہِ راست تصادم کے بجائے حکمت، دلیل اور معقولیت سے اپنی بات رکھنی چاہیے۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے نجاشی کے دربار میں قرآن کی آیات پیش کر کے اسلامی تعلیمات کا ایسا تعارف کروایا کہ بادشاہ خود متاثر ہو گیا۔

3. میزبان ملک کے وفادار اور خیر خواہ بن کر رہنا: جس ملک میں پناہ لی جائے، وہاں امن و خیر خواہی کے اصولوں پر عمل کیا جائے اور مقامی حکمرانوں کے ساتھ مثبت تعلقات قائم کیے جائیں۔ مہاجرینِ حبشہ نے نجاشی اور اہلِ حبشہ کے ساتھ وفاداری نبھائی اور ان کے لیے کسی قسم کی مشکلات پیدا نہیں کیں۔

4. میزبان ملک کے قوانین اور نظام کی پابندی: جس ریاست میں اقلیت کے طور پر رہائش ہو، وہاں کے قوانین کا احترام اور نظام میں رہتے ہوئے تحفظ کی کوشش ضروری ہے۔

مہاجرینِ حبشہ نے نجاشی کی سلطنت میں امن پسند شہری بن کر زندگی گزاری اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو وہاں کے استحکام کے لیے خطرہ بن سکتا ہو۔

5. ایک منظم کمیونٹی اور قیادت کا قیام: اقلیتوں کو چاہیے کہ وہ بے نظم وضبط نہ ہوں، بلکہ ایک تنظیمی ڈھانچے میں رہیں۔ حبشہ میں مہاجرین نے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کو اپنا امیر مقرر کیا، جس سے ان کی قیادت میں اتحاد اور یکجہتی برقرار رہی۔

6. اپنے نظریے کو عمل سے ثابت کرنا: اپنی زندگی اور کردار سے اپنے نظریے کی سچائی ثابت کریں۔ مہاجرینِ حبشہ نے اپنے حسنِ سلوک اور کردار سے اہلِ حبشہ کو یہ یقین دلا دیا کہ وہ ایک پر امن اور باوقار قوم ہیں۔

7. میزبان ملک کے مذہب اور ثقافت کا احترام: جہاں پناہ لی ہو، وہاں کے رہن سہن، مذہب اور ثقافت کو سمجھنا اور ان کے جذبات کا احترام کرنا ضروری

ہے۔ مسلمانوں نے حبشہ میں رہتے ہوئے نجاشی اور عیسائی معاشرت کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کی جو کشیدگی کا باعث بنتی۔

8. مشکلات پر صبر واستقلال: ہجرت ہمیشہ آسان نہیں ہوتی، لیکن صبر و تحمل، عزم اور استقلال سے ہر آزمائش پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ حبشہ میں قیام کے دوران کئی مہاجرین کو مشکلات پیش آئیں، لیکن انھوں نے جلد بازی، جذباتیت یا بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

9. خود کفالت اور محنت پر انحصار: اقلیت کو چاہیے کہ اپنے میزبان ملک پر بوجھ نہ بنے، بلکہ محنت و مشقت کے ذریعے اپنے اخراجات خود پورے کرے۔ مہاجرینِ حبشہ نے وہاں جا کر اپنا روزگار اختیار کیا اور کسی پر انحصار نہیں کیا۔

***

بین القبائلی تعلقات اور مکہ میں منعقد ہونے والی تجارتی و ثقافتی سرگرمیاں

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں یہ بیان کیا تھا کہ آپ ﷺ کی قیادت میں مکہ معظمہ میں ایک ریاست وجود میں آچکی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنی ریاست کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ترتیب دیتے ہوئے جزیرۃ العرب میں بسنے والے دیگر قبائل کے ساتھ رابطے کے لیے مکہ معظمہ کے قریب منعقد ہونے والے تجارتی اور ثقافتی میلوں کے ساتھ ساتھ حج کے مواقع کو بہتر انداز سے استعمال کیا۔ ان مواقع پر ایک بڑی تعداد میں جب جزیرۃ العرب کے آباد مختلف قبائل کے لوگ مکہ معظمہ آتے تھے۔ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر اور اس کے علاوہ بھی کئی میلے لگتے تھے۔ جن میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ ان میلوں میں تجارت کے ساتھ شعر و شاعری کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ ان کا ذکر صحیح بخاری کے باب کتاب الحج سے بھی ملتا ہے۔

حدثنا عثمان بن الهيثم، اخبرنا ابن جريج، قال عمرو بن دينار، قال ابن عباس رضى الله عنهما: " كان ذو المجاز وعكاظ متجر الناس فى الجاهلية، فلما جاء الإسلام كانهم كرهوا ذلك، حتى نزلت: ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم

ہم سے عثمان بن ہیثم نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہم کو ابن جریج نے خبر دی، ان سے عمرو بن دینار نے بیان کیا اور ان سے عبداللہ بن عباس

رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ذوالمجاز اور عکاظ عہد جاہلیت کے بازار تھے جب اسلام آیا تو گویا لوگوں نے (جاہلیت کے ان بازاروں میں) خرید و فروخت کو برا خیال کیا اس پر (سورۃ البقرہ کی) یہ آیت نازل ہوئی: تمہارے لیے کوئی حرج نہیں اگر تم اپنے رب کے فضل کی تلاش کرو، یہ حج کے زمانے کے لیے تھا۔

یہ امر ثابت ہے کہ اسلام سے قبل مکہ معظمہ کے نواح میں تجارتی اور ثقافتی میلے منعقد ہوتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان میلوں کو مختلف قبائل سے روابط کے لیے ایک سنہری موقع جانا۔ چنانچہ، آپ ﷺ وہاں تشریف لے جاتے اور جہاں ممکن ہوتا، حکمت و بصیرت کے ساتھ لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے۔ کئی مؤرخین اور اہلِ علم نے اپنی تحریروں میں آپ ﷺ کی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے۔

آپ ﷺ کی ان تبلیغی مساعی پر ڈاکٹر فضل الٰہی کی کتاب دعوت کہاں دی جائے؟ میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی [40]۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کس طرح ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پیغام کی ترویج کے لیے ہر ممکن حکمتِ عملی اپنائی۔ میں یہاں ایک اہم واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا اور اس کے تناظر میں اس امر پر روشنی ڈالوں گا کہ آپ ﷺ نے کس طرح اپنی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مکہ معظمہ سے باہر مختلف قبائل تک اپنا پیغام پہنچایا۔

یہ کتاب یہ بھی واضح کرتی ہے کہ جہاں آپ ﷺ حق کی دعوت پیش کر رہے تھے، وہیں مشرکینِ مکہ کے نمائندے بھی سرگرم تھے اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے

[40] Ja'far Subhani, *The Message*, publisher: Islamic Seminary Publications P O Box 5425 Karachi, Pakistan

سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ڈاکٹر فضل الٰہی نے اس حوالے سے متعدد احادیث نقل کی ہیں، جن میں سے ایک امام احمد کی روایت کردہ حدیث ہے، جو حضرت ربیعہ بن عباد دیلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ربیعہ ابتدا میں مشرک تھے، بعد میں اسلام لے آئے۔وہ بیان کرتے ہیں:

"رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم بَصَرَ عَيْنَيَّ بِسُوْقِ ذِيْ الْمَجَازِ يَقُوْلُ: "يَاأَيُّهَا النَّاسُ! قُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، تُفْلِحُوْا۔"

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دونوں آنکھوں سے سوق ذوالمجاز میں دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: "اے لوگو تم! لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کہو فلاح پالو گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے چھوٹے راستوں میں داخل ہوتے اور لوگ آپ پر ازراہِ تعجب جمع ہو رہے تھے۔ میں نے کسی کو کچھ (بھی) کہتے ہوئے نہیں سنا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل کہہ رہے تھے:

أَيُّهَا النَّاسُ! قُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، تُفْلِحُوْا۔

اے لوگو! تم [لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ] کہو فلاح پالو گے۔

البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک بھینگا، روشن رو، مینڈھوں والا شخص کہہ رہا تھا:

"إِنَّهُ صَابِئٌ كَاذِبٌ۔" ۔معاذالله۔۔

بے شک وہ (معاذاللہ) دین سے منحرف جھوٹا شخص ہے۔

میں نے پوچھا: مَنْ هٰذَا؟ یہ کون ہے؟ انھوں (لوگوں) نے جواب دیا:

مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَهُوَ يَذْكُرُ النُّبُوَّةَ۔

محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا:

مَنْ هٰذَا الَّذِيْ يُكَذِّبُهُ۔

"اسے جھٹلانے والا شخص کون ہے؟"

انھوں نے بتلایا: عَمُّهُ أَبُوْ لَهَبٍ۔ "[41] اس کا چچا ابو لہب ہے۔

مندرجہ بالا عبارت ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کی تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے اس کے علاوہ بھی کئی دیگر واقعات کا ذکر کیا ہے۔ سیرت النبی ﷺ میں اسی نوعیت کے ایک اور واقعے کا حوالہ ملتا ہے۔ ابنِ سعد نے بھی اس واقعے کو نقل کیا ہے[42]۔

ابنِ سعد کے مطابق، آپ ﷺ بنی عامر بن صعصعہ، محارب بن خصفہ، فزارہ، غسان، مرہ، حنیف، سلیم، عبس بن نصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، اور حضارمہ قبائل کے پاس تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے تھے، تاہم ان میں سے کسی بھی قبیلے نے آپ ﷺ کی دعوت قبول نہ کی۔ علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی) سیرت النبی ﷺ میں بھی اسی طرح کے ایک واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔

سید مودودی نے بھی (سرورِ عالم ﷺ) میں اس دور کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ان سولہ قبائل کی فہرست دی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ تمام قبائل اپنے اثر ورسوخ اور طاقت کے لحاظ سے انتہائی اہم تھے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی قبیلہ آپ ﷺ کی دعوت قبول کر لیتا، تو یہ اسلام کے لیے بڑی

---

[41] المسند، جزء من رقم الحدیث ۱۶۰۲۳، ۲۵/۴۰۴-۴۰۵۔ شیخ ارناؤوط اور ان کے رفقاء نے اسے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: ہامش المسند ۲۵/۴۰۵)۔

[42] طبقات ابنِ سعد، حصہ اول اخبار النبی ﷺ، ترجمہ: علامہ عبد اللہ العمادی نفیس اکیڈیمی کراچی

تقویت کا باعث ہوتا۔ تاہم، بحیثیت مجموعی، کسی بھی قبیلے نے اسلام قبول نہیں کیا، البتہ چند افراد ضرور ایمان لے آئے۔ میرے نزدیک، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی قبیلہ قریشِ مکہ کی دشمنی مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

میں ان واقعات کی تفصیل میں زیادہ نہیں جانا چاہتا کیونکہ یہ میرے مقالے کے اصل موضوع سے قدرے ہٹ کر ہے۔ یہاں جس بات پر میں روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، وہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری سے متعلق ہے۔

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا، مکہ معظمہ میں درحقیقت دو متحارب قوتیں موجود تھیں۔ عرب کے تجارتی اور ثقافتی میلوں کو جزیرۃ العرب کے مختلف قبائل تک اپنی دعوت پہنچانے کا بہترین موقع سمجھتے ہوئے، آپ ﷺ نے ان مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جب مشرکینِ مکہ کو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ لوگوں سے رابطہ کر رہے ہیں اور انھیں اپنے پیغام سے آگاہ کر رہے ہیں، تو انھوں نے بھی اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے قبائل سے روابط بڑھا دیے، تاکہ کہیں لوگ ان سے متنفر نہ ہو جائیں۔ ان اجتماعات کے دوران آپ ﷺ کی دعوت سے کئی افراد مشرف بہ اسلام ہوئے، اور انھی میں مدینہ منورہ کے چند افراد سے آپ ﷺ کی پہلی ملاقات بھی شامل تھی، جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

میں نے آپ ﷺ کی ان کوششوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے چند نمایاں فوائد کی فہرست مرتب کی ہے، جو درج ذیل ہیں:

وسیع پیمانے پر سامعین تک رسائی: آپ ﷺ کو ایک بڑی تعداد میں سامعین میسر آئے جو عرب کے مختلف خطوں اور قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ ایک مؤثر پلیٹ فارم تھا جہاں جزیرۃ

العرب کے بااثر اور اہلِ علم افراد جمع ہوتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، آپ ﷺ نے بیک وقت بڑی تعداد میں لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔

تجارتی اور ثقافتی میلوں سے استفادہ: ان میلوں میں مختلف قبائل کے درمیان تجارت کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے مقابلے بھی منعقد ہوتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان مواقع کی مناسبت سے لوگوں کو توحید، اخلاقی اقدار اور سماجی اصلاحات کی تعلیم دی۔ اس کے ساتھ، آپ ﷺ نے بت پرستی کے مروجہ طریقوں، قبائلی عصبیت، اور سماجی ناانصافیوں کو بھی چیلنج کیا۔ یہ درحقیقت آپ ﷺ کی قائم کردہ ریاست کی ابتدائی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی حکمت عملی تھی۔

ایمان کی بنیاد پر اتحاد کی دعوت: ان مواقع پر آپ ﷺ نے قبائلی اور معاشرتی امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک نظریے کی بنیاد پر اتحاد کی اہمیت پر زور دیا۔ یہ جزیرۃ العرب میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ لوگ محض قبیلے کی وابستگی کی بجائے ایک نظریاتی اصول کے تحت متحد ہو رہے تھے۔

اسلامی تعلیمات اور غلط فہمیوں کا ازالہ: ان اجتماعات کے دوران، آپ ﷺ نے مشرکینِ مکہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا اور اسلام کی حقیقی تصویر کو واضح کیا۔ آپ ﷺ نے مذہبی عقائد، اخلاقیات، اور سماجی طرزِ عمل کے بارے میں رہنمائی فراہم کی، تاکہ لوگ دینِ اسلام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔

پرامن تبلیغ اور دلیل کی بنیاد پر دعوت: ان مواقع پر آپ ﷺ نے تبلیغ کے ذریعے یہ پیغام دیا کہ اسلام، دوسروں کے ساتھ پرامن مذاکرات اور مکالمے کو ترجیح دیتا ہے اور کسی بھی قسم کی زبردستی کا قائل نہیں۔ اسلام عقلی دلائل اور اخلاقی بنیادوں پر قائل کرنے کا درس دیتا ہے، نہ کہ جبر و تشدد کا۔

اسلام کے پیغام کی وسیع پیمانے پر اشاعت: ان میلوں اور اجتماعات کے ذریعے، اسلام کا پیغام مکہ سے نکل کر پورے جزیرۃ العرب کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ اس نے عرب میں اسلام کے فروغ کی بنیاد رکھی اور خطے کی ثقافتی، سماجی،

اور سیاسی ساخت پر گہرے اثرات مرتب کیے، جو بعد میں اسلامی ریاست کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

یہ تمام حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی یہ حکمتِ عملی، جو آپ ﷺ کے مکہ معظمہ میں قیام کے دوران مستقل جاری رہی، اسلام کی دعوت کو وسیع پیمانے پر پھیلانے میں ایک بنیادی عنصر ثابت ہوئی۔ یہی سفارتی اور تبلیغی کوششیں بعد میں جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ کا سبب بنیں۔

آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا یہ پہلو ہمارے لیے بھی نہایت اہم سبق رکھتا ہے۔ مکی دور، جو تقریباً تیرہ سال پر مشتمل تھا، اس دوران آپ ﷺ نے کبھی ظلم و ستم کا جواب طاقت سے نہیں دیا بلکہ ہمیشہ صبر اور حکمت کے ساتھ دعوتِ دین میں مشغول رہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب تک ایک مضبوط بنیاد اور مقابلہ کرنے کی صلاحیت حاصل نہ ہو، تب تک صبر، حکمت، اور علمی و فکری میدان میں اپنی طاقت کو بڑھانا ہی بہترین حکمتِ عملی ہوتی ہے۔

***

مکہ معظمہ سے باہر آباد قبائل اور آپ ﷺ کی دعوت کے دیرپا سیاسی، معاشرتی اور سماجی اثرات

جب آپ ﷺ کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہو گیا کہ مشرکینِ مکہ آپؐ کی دعوت پر مثبت رد عمل ظاہر نہیں کر رہے، تو آپ ﷺ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو مکہ معظمہ سے باہر دیگر قبائل تک وسعت دینے کا عزم کیا۔ ان میں سب سے نمایاں طائف کا سفر تھا، جو جزیرۃ العرب کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ اس کے علاوہ، آپؐ نے کئی دیگر قریبی قبائل کا بھی دورہ کیا اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ ان تبلیغی دوروں کی تفصیلات مختلف سیرت کی کتب میں محفوظ ہیں، لیکن مجھے سب سے زیادہ جامع معلومات سیرت انسائیکلوپیڈیا، جلد سوم میں ملی ہیں۔

سیرت انسائیکلوپیڈیا میں ان تمام افراد اور قبائل کا ذکر موجود ہے جن سے آپ ﷺ نے ملاقات کی، جنھوں نے اسلام قبول کیا، اور اس دوران پیش آنے والے اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ میں نے ان کا خلاصہ درج ذیل فہرست کی صورت میں مرتب کیا ہے، جس کے تمام حوالے "سیرت انسائیکلوپیڈیا" میں درج ہیں۔

مکی دور کے اہم دعوتی واقعات:

1. حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ کا مکہ میں آنا، اسلام قبول کرنا، اور اپنی قوم کے لیے کوئی نشانی طلب کرنا، جس پر آپ ﷺ نے قبیلہ دوس کے لیے دعا فرمائی۔
2. سیدنا ابوذر غفاریؓ کا آپ ﷺ سے ملاقات کے لیے مکہ آنا اور مسلمان ہونا۔

3. عثمان بن ثعلبہؓ کا ایمان لانا، جو قبیلہ ازدشنوء سے تعلق رکھتے تھے۔
4. سوید بن صامت سے آپ ﷺ کی گفتگو اور انھیں دعوت دینا۔
5. ایاس بن معاذ سے آپ ﷺ کی ملاقات اور دعوتِ دین دینا۔
6. قبیلہ ہمدان کے ایک فرد سے آپ ﷺ کی تبلیغی گفتگو۔
7. قیس بن حطیم کا آپ ﷺ سے ملاقات کرنا اور اگلے سال دوبارہ آنے کا وعدہ کرنا۔
8. عداسؓ (جو عتبہ اور شیبہ کا غلام تھا) کا اسلام قبول کرنا۔
9. مطعم بن عدی کی پناہ حاصل کرنا اور ان کے حسنِ سلوک کی قدردانی کرنا۔

بنو کندہ کے قبیلے کو تبلیغ

1. بنو بکر بن وائل کو اسلام کی دعوت دینا۔
2. بنو شیبان بن ثعلبہ کے سرداروں سے ملاقات۔
3. مثنیٰ ابن حارثہ سے تبلیغی مکالمہ۔
4. بنو عامر بن صعصعہ کے قبیلے کو اسلام کی دعوت۔
5. بنو کلب کے سرداروں سے گفتگو۔
6. ابو حنیفہ کی بدزبانی کے باوجود آپ ﷺ کا صبر و تحمل۔
7. بنو محارب کے ایک بزرگ کی ہٹ دھرمی کے باوجود حکمت و دانائی کے ساتھ بات چیت۔
8. میسرہ بن مسروق عبسی کا اسلام قبول کرنا۔
9. بنو غسان کی قیام گاہوں کا دورہ اور تبلیغ۔

طائف کا سفر — آپ ﷺ کی زندگی کا مشکل ترین دن

مکی دور کے اہم ترین واقعات میں طائف کا سفر نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سفر

آزمائشوں سے بھرا ہوا تھا اور آپ ﷺ کے لیے انتہائی مشکل ثابت ہوا۔ اس کی تفصیلات صحیح مسلم میں درج ایک حدیث میں بھی موجود ہیں۔

یہ وہ وقت تھا جب مکہ میں تبلیغ کے دروازے بند ہو چکے تھے، اور آپ ﷺ نے طائف کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے وہاں کا سفر کیا۔ تاہم، انھیں بھی ہدایت نصیب نہ ہوئی اور انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ نہایت سنگ دلانہ سلوک کیا۔ اس کے باوجود، آپ ﷺ نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسا رکھا۔

یہ تمام واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ مکی دور میں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور سفارت کاری نے اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جس کے اثرات آگے چل کر مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کرنے کا باعث بنے۔

وحدثني ابو الطاهر احمد بن عمرو بن سرح، وحرملة بن يحيى، وعمرو بن سواد العامري، والفاظهم متقاربة , قالوا: حدثنا ابن وهب، قال: اخبرني يونس، عن ابن شهاب، حدثني عروة بن الزبير، ان عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم حدثته انها، قالت لرسول الله صلى الله عليه وسلم: " يا رسول الله، هل اتى عليك يوم كان اشد من يوم أُحد؟، فقال: لقد لقيت من قومك وكان اشد ما لقيت منهم يوم العقبة، إذ عرضت نفسي على ابن عبد ياليل بن عبد كلال، فلم يجبني إلى ما اردت، فانطلقت وانا مهموم على وجهي، فلم استفق إلا بقرن الثعالب فرفعت راسي، فإذا انا بسحابة قد اظلتني، فنظرت فإذا فيها جبريل، فناداني، فقال: إن الله عز وجل قد سمع قول قومك لك، وما ردوا عليك وقد بعث إليك ملك الجبال لتامره بما شئت فيهم، قال: فناداني ملك الجبال وسلم علي، ثم قال: يا محمد إن الله قد سمع قول قومك لك وانا ملك الجبال، وقد بعثني ربك إليك لتامرني

بأمرك فما شئت، إن شئت ان اطبق عليهم الاخشبين، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: بل ارجو ان يخرج الله من اصلابهم من يعبد الله وحده لا يشرك به شيئا ".

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حدیث بیان کی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا آپ پر کوئی ایسا دن بھی آیا جو اُحد کے دن سے زیادہ شدید ہو؟ آپ نے فرمایا: ''مجھے تمہاری قوم سے بہت تکلیف پہنچی، جب میں خود کو ابن عبد یالیل بن عبد کلال کے سامنے لے گیا (یعنی اس کو دعوتِ اسلام دی) لیکن جو میں چاہتا تھا اس نے میری بات نہ مانی، میں غمزدہ ہو کر چل پڑا اور قرن ثعالب پر پہنچ کر ہی میری حالت بہتر ہوئی، میں نے سر اٹھایا تو مجھے ایک بادل نظر آیا، اس نے مجھ پر سایہ کیا ہوا تھا، میں نے دیکھا تو اس میں جبرائیل علیہ السلام تھے، انھوں نے مجھے آواز دے کر کہا: اللہ عزوجل نے جو کچھ آپ نے اپنی قوم سے کہا وہ اور انھوں نے جو آپ کو جواب دیا وہ سب سن لیا، اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا فرشتہ آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ آپ ان کفار کے متعلق اس کو جو چاہیں حکم دیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر مجھے پہاڑوں کے فرشتے نے آواز دی اور سلام کیا، پھر کہا: اے محمد! اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کی طرف سے آپ کو دیا گیا جواب سن لیا، میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں اور مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ مجھے جو چاہیں حکم دیں، اگر آپ چاہیں تو میں ان

دونوں سنگلاخ پہاڑوں کو (اٹھا کر) ان کے اوپر رکھ دوں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: بلکہ میں یہ امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ نکالے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

طائف کا سفر — ایک حکمتِ عملی پر مبنی تاریخی اقدام

حضرت عروہ بن زبیرؒ (مغازی رسول اللہ) نے طائف کے سفر کی مکمل تفصیلات بیان کی ہیں۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا تبلیغ کی خاطر مکہ سے کسی دور دراز شہر کا پہلا سفر تھا۔ طائف مکہ سے تقریباً نوّے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا اور اس وقت عرب کا دوسرا بڑا شہر شمار ہوتا تھا۔

آپ ﷺ نے طائف کے انتخاب میں خاص حکمت عملی اختیار کی تھی، کیونکہ:

1. قبیلہ ثقیف اور قریش کے قریبی تعلقات: قبیلہ ثقیف قریش کا حلیف تھا اور عرب کے قبائل اپنے اتحادیوں کے دفاع میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اگر قبیلہ ثقیف نے آپ ﷺ کی حمایت قبول کر لی ہوتی تو اس سے قریش کو شدید سیاسی نقصان پہنچتا، کیونکہ وہ اپنے ایک اہم اتحادی سے محروم ہو جاتے۔
2. طائف کی جغرافیائی اہمیت: طائف ایک اہم تجارتی اور مذہبی مرکز تھا۔ اہلِ طائف کا بت ''لات'' خانہ کعبہ میں رکھا گیا تھا، جس سے وہ خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ، طائف اور مکہ کے قبائل میں خاندانی رشتے بھی قائم تھے، جس کی وجہ سے یہ شہر تبلیغِ اسلام کے لیے ایک اہم مقام تھا۔

3. قبیلہ ثقیف کے سرداروں کو دعوت: حضرت عروہ بن زبیرؓ کے مطابق، آپ ﷺ نے قبیلہ ثقیف کے سردار عمر بن عمیر کے تینوں بیٹوں کو خصوصی طور پر دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ تینوں افراد قریش کے حلیف تھے، اور اگر وہ اسلام قبول کر لیتے تو قریش کی سیاسی قوت کمزور ہو سکتی تھی۔

4. سفر کی خفیہ نوعیت: تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر ایک ماہ سے زائد عرصے پر محیط تھا، اور آپ ﷺ نے یہ طویل فاصلہ پیدل طے کیا۔ اس دوران، آپ ﷺ نے راستے میں موجود دیگر قبائل تک بھی اسلام کی دعوت پہنچائی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس سفر کو مکمل طور پر خفیہ رکھا۔ اس حکمت عملی کے پسِ پردہ کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک خاص وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قریش اور طائف کے سردار آپس میں مضبوط اتحادی تھے، اگر قریش کو پیشگی اطلاع مل جاتی تو وہ طائف کے سرداروں کو آپؐ کے خلاف بھڑکا سکتے تھے اور تبلیغی کوششوں کو ناکام بنانے کی سازش کر سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اگر مشرکینِ مکہ کو اس سفر کا علم ہو جاتا تو وہ نہ صرف راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتے تھے، بلکہ طائف کے قبائل کو بھی آپ ﷺ کی مخالفت پر آمادہ کر سکتے تھے، جس سے یہ تبلیغی مہم شدید مشکلات کا شکار ہو جاتی۔

سیاسی حکمتِ عملی اور خارجہ پالیسی—ایک منفرد سبق

طائف کا سفر نبی کریم ﷺ کی سفارتی بصیرت کا ایک نمایاں باب ہے، جو آج بھی سیاسی اور سفارتی حکمت عملی کے حوالے سے اہم سبق فراہم کرتا ہے:

دشمن کے اتحادی سے رابطہ: آپ ﷺ نے قریش کے ایک اہم حلیف قبیلے سے براہِ راست مذاکرات کیے، تاکہ قریش کو اس کے اتحادیوں سے محروم کر کے اس کی طاقت کو کمزور کیا جا سکے۔ یہ ایک مدبرانہ سفارتی چال تھی، جو مستقبل میں اسلامی دعوت کے لیے راہ ہموار کر سکتی تھی۔

نئے مواقع کی تلاش: کسی بھی تحریک یا جدوجہد میں، اگر ایک دروازہ بند ہو جائے تو متبادل امکانات تلاش کرنا دانشمندی کی علامت ہے۔ آپ ﷺ نے مکہ میں شدید مزاحمت کے باوجود، طائف کے امکانات کو آزمایا اور اسلام کے پیغام کو مزید وسعت دینے کی کوشش کی۔

سفارت کاری میں تدبر اور رازداری: بعض اوقات، خفیہ سفارتی روابط ناگزیر ہوتے ہیں، تاکہ دشمن کو پیشگی اطلاع نہ ملے اور منصوبہ بندی متاثر نہ ہو۔ آپ ﷺ کی حکمت عملی نے اس اصول کو عملی طور پر ثابت کیا۔

ابن ہشام کی روایت اور طائف کا پسِ منظر

سیرت النبی ﷺ کے مشہور سوانح نگار ابن ہشام نے بھی اس واقعے کو تفصیل سے بیان کیا ہے[43]۔ ان کے مطابق:

> جب حضرت ابو طالب کا انتقال ہوا تو مشرکینِ مکہ کے حوصلے مزید بڑھ گئے اور انھوں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ ایسے سنگین حالات میں، آپ ﷺ نے بنو ثقیف سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور طائف کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت بنو ثقیف میں تین بھائی قبیلے کے نمایاں سردار تھے، جن میں سے ایک کی بیوی قریش کے خاندان سے تھی۔ اس تعلق سے یہ ظاہر

---

[43] طبقات ابنِ سعد، حصہ اول اخبار النبی ﷺ، ترجمہ: علامہ عبداللہ العمادی، نفیس اکیڈیمی، کراچی

ہوتا ہے کہ بنو ثقیف اور قریش کے درمیان نہ صرف سیاسی بلکہ ازدواجی رشتہ بھی تھا۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ ﷺ نے بنو ثقیف سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش اس لیے کی کہ وہ قریش کے ایک سسرالی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے؟ ممکن ہے کہ اس پہلو کو بھی مدنظر رکھا گیا ہو، مگر بنو ثقیف کے سرداروں نے اس تعلق کو کوئی اہمیت نہ دی اور نہ ہی کسی بھلائی کا مظاہرہ کیا۔ ابن ہشام کے مطابق، طائف میں آپ ﷺ کی اس قریشی خاتون سے ملاقات بھی ہوئی، اور آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا:

"دیکھو، تمہارے سسرال نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے!"

یہی وہ موقع تھا جب آپ ﷺ نے ایک نہایت دلگداز دعا فرمائی، جسے ابن ہشام نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔ اس دعا میں آپ ﷺ نے اپنی بے بسی اور کمزوری کو اللہ کے حضور پیش کرتے ہوئے التجا کی کہ:

"اے اللہ! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں، میں تیرے سوا کسی کی پناہ نہیں چاہتا۔ تُو ہی میرا سہارا ہے، تُو ہی میری مدد فرما، میں تجھی کی رضا کا طلبگار ہوں۔"

یہ دعا اس بات کی علامت ہے کہ آپ ﷺ نے ہر حال میں اللہ پر کامل بھروسہ رکھا اور مشکلات کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

طائف کا سفر نہ صرف تبلیغی مشن کا حصہ تھا بلکہ یہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارتی حکمت عملی کا بھی ایک نمایاں پہلو تھا۔ اس سفر سے ہمیں کئی اہم اسباق ملتے ہیں، جو رہتی دنیا تک رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

ان حقائق اور واقعات کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سفر محض ایک تبلیغی مہم نہیں تھا، بلکہ نبی کریم ﷺ کی سیاسی حکمتِ عملی اور سفارتی بصیرت کا ایک منفرد نمونہ تھا۔ اس سفر کے ذریعے آپ ﷺ نے دشمن کے حلیف قبائل سے تعلقات استوار کرنے اور اسلام کی دعوت کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی۔ اس سے ہمیں یہ سیکھنے کو ملتا ہے کہ کسی بھی جدوجہد میں حکمت، صبر، اور تدبر بنیادی عناصر ہوتے ہیں، جو بالآخر کامیابی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

طائف کا سفر ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی بھی تحریک میں صبر، تدبر، اور حکمت عملی بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ یہی اصول آج بھی سیاسی و سفارتی حکمت عملی میں کارآمد ہیں اور رہتی دنیا تک رہنمائی فراہم کرتے رہیں گے۔

***

نبی کریم ﷺ کے مکی دور میں سفارت کاری اور تعلقاتِ عامہ کی حکمتِ عملی

نبی کریم ﷺ نے مکہ معظمہ میں دس سال تک قریبی قبائل کو دعوتِ اسلام دی۔ اس عرصے میں بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، جبکہ کئی دیگر کے دل نرم پڑ گئے۔ اس دور میں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی صبر، حکمت اور مسلسل دعوت پر مبنی تھی۔ چونکہ اس وقت مسلمان اقلیت میں تھے اور عسکری و معاشی لحاظ سے کمزور تھے، اس لیے جنگ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس وقت کے تناظر میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے بنیادی اصول درج ذیل تھے:

1. **صبر اور عدمِ تصادم کی حکمتِ عملی:** چونکہ مسلمان تعداد میں کم اور دفاعی لحاظ سے کمزور تھے، اس لیے آپ ﷺ نے مکمل صبر کا مظاہرہ کیا اور کسی سے انتقام نہیں لیا۔ مشرکینِ مکہ کی ظلم و زیادتی کے باوجود، آپ ﷺ نے کسی کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی اور نہ ہی کسی محاذ آرائی میں پہل کی۔

2. **مسلسل دعوتِ اسلام:** آپ ﷺ نے ہر ممکن موقع پر لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی۔ جہاں بھی کوئی بااثر شخصیت یا لوگوں کا مجمع ملتا، آپ ﷺ فوراً دینِ اسلام کی بنیادی تعلیمات پیش فرماتے۔ آپ ﷺ کی دعوت درج ذیل نکات پر مشتمل ہوتی:

- اللہ پر ایمان اور توحید کی دعوت
- شرک سے اجتناب کی تاکید
- اخلاقی و سماجی برائیوں سے روکنا
- عدل، مساوات اور حق پرستی کی ترغیب

یہ دعوت ہر فرد، قبیلے اور قوم تک پہنچانے کی کوشش کی گئی، خواہ وہ معاشرتی لحاظ سے کمزور ہوں یا طاقتور۔

3. **مشرکین مکہ کے اتحادی قبائل سے روابط:** آپ ﷺ نے مکہ کے باہر موجود قبائل کو اپنی دعوت کے لیے چنا، خاص طور پر وہ قبائل جو قریش کے حلیف تھے۔ اس حکمتِ عملی کا مقصد قریش کو اس کے اتحادیوں سے محروم کرنا اور ان میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا تھا۔ یہ سفارتی حکمتِ عملی آج بھی کسی بھی تحریک یا مشن کے لیے ایک اہم سبق ہے۔

4. **مسلمانوں کو ظلم و ستم سے محفوظ رکھنے کی تدبیر:** چونکہ مکہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم بڑھ رہا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر ایک محفوظ پناہ گاہ تلاش کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی حکمتِ عملی کے تحت آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی کے انصاف پر بھروسہ کیا، کیونکہ وہ ایک عادل حکمران تھا۔ یہ ہجرت مسلمانوں کے تحفظ اور دعوتِ اسلام کے فروغ کے لیے ایک اہم اقدام ثابت ہوئی۔

5. **محفوظ ٹھکانے کی تلاش – یثرب (مدینہ) کی طرف سفارتی کوششیں:**
آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ مکہ میں اسلام کی دعوت کو کھل کر پھیلانے کے لیے سازگار ماحول موجود نہیں، اس لیے آپ ﷺ نے مکہ سے باہر کسی ممکنہ پناہ گاہ کی تلاش شروع کی۔ مختلف قبائل سے رابطے کیے تاکہ کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں مسلمان آزادی سے زندگی گزار سکیں۔ یثرب (مدینہ) کے قبائل سے روابط قائم کیے، جو بعد میں بیعتِ عقبہ کا سبب بنے۔ جب مدینہ کے بعض قبائل نے اسلام قبول کر لیا اور مدد کی پیشکش کی، تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مدینہ ہجرت کی اجازت دی، تاکہ وہ ایک محفوظ اور مستحکم ماحول میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ سکیں۔

مکی دور میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری مکمل طور پر حکمت، صبر اور تدبر پر مبنی تھی۔ اس دوران آپ ﷺ نے تصادم سے گریز کرتے ہوئے تبلیغی اور سفارتی حکمتِ عملی اپنائی۔ مشرکین مکہ کے اتحادیوں سے روابط قائم کر کے انھیں نرم کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کو ظلم سے بچانے کے لیے محفوظ پناہ گاہیں تلاش کیں۔ بالآخر مدینہ کی طرف ہجرت کی راہ ہموار ہوئی، جہاں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔

یہ حکمتِ عملی آج بھی قیادت، سفارت کاری، اور کامیاب تحریکوں کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے، جو بتاتی ہے کہ صبر، حکمت اور تدبر کے ساتھ کسی بھی مقصد کو کامیابی سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے۔

مکی دور میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اثرات

نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارتی حکمتِ عملی کے اثرات دور رس اور گہرے ثابت ہوئے۔ یہ حکمتِ عملی نہ صرف اسلام کی دعوت کے فروغ کا ذریعہ بنی بلکہ مشرکینِ مکہ کی سیاسی تنہائی اور اسلامی ریاست کے قیام کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ اس پالیسی کے کچھ نمایاں اثرات درج ذیل ہیں:

1. **قبائل کا محتاط رویہ اور مشرکینِ مکہ کی تنہائی:** مکہ کے آس پاس بسنے والے قبائل مشرکینِ مکہ کے زیرِ اثر تھے اور ان سے خوفزدہ بھی رہتے تھے۔ وہ کسی بھی صورت قریش کی دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے، اسی لیے کسی بھی قبیلے نے اجتماعی طور پر آپ ﷺ کو پناہ یا دعوت نہیں دی۔ تاہم، کئی قبائل کے افراد نے انفرادی طور پر اسلام قبول کیا۔ کسی قبیلے نے قریش کی حمایت میں آپ ﷺ یا صحابہ پر ظلم و ستم نہیں کیا (سوائے طائف کے واقعے کے)۔ اس حکمتِ عملی کے نتیجے میں مشرکینِ مکہ رفتہ رفتہ سیاسی طور پر تنہا ہوتے گئے، کیونکہ ان کا کوئی بھی حلیف قبیلہ ان کے ساتھ کھڑا نہ ہوا۔

4. اسلام کی دعوت جزیرۃ العرب کے ہر کونے تک پہنچ گئی۔ آپ ﷺ کی سفارتی حکمتِ عملی کے نتیجے میں اسلام کا پیغام جزیرۃ العرب کے ہر گوشے میں پہنچ گیا۔ بیشتر قبائل نے اسلام کے بارے میں سنا اور سوچنا شروع کیا۔ بہت سے لوگ حقیقت کو سمجھ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہی آپ ﷺ کا اصل مقصد تھا کہ اللہ کا دین ہر فرد تک پہنچے۔

5. **سچ اور باطل کی پہچان واضح ہو گئی:** آپ ﷺ کی سفارتی کوششوں نے جزیرۃ العرب کے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع دیا کہ کون حق پر ہے اور کون نہیں۔ قبائل کو اندازہ ہو گیا کہ قریش صرف اپنی طاقت اور مفادات کے تحفظ کے لیے اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اسلام سچائی، انصاف اور وحدانیت کا پیغام لے کر آیا ہے۔

6. **دشمنوں کے ساتھ بہترین برتاؤ اور اخلاقی برتری:** آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ طائف کے سرداروں اور عوام کے نازیبا سلوک کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا کی۔ یہی اعلیٰ اخلاق اور صبر تھا، جس کے نتیجے میں کئی ایسے افرارد افراد ایمان لائے، جنھیں اپنے آقاؤں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ دعوتِ دین میں صبر، حکمت اور اعلیٰ اخلاق بنیادی اصول ہیں۔

7. **اقلیت میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ایک عملی نمونہ:** آپ ﷺ نے ثابت کیا کہ اگر مسلمان کسی معاشرے میں اقلیت میں ہوں، تو انھیں کیا حکمتِ عملی اپنانی چاہیے۔ طاقتور دشمنوں کے خلاف جنگ میں الجھنے کے بجائے، حکمت، صبر، اور سفارتی تدبر سے اپنی دعوت کو آگے بڑھانا چاہیے۔ یہی حکمتِ عملی آج بھی اقلیت میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

8. مکہ میں ایک نیا اخلاقی اور سماجی نظام متعارف کرایا: آپ ﷺ کی سفارت کاری کے نتیجے میں، مکہ میں ایک نیا سماجی اور اخلاقی فریم ورک متعارف ہوا۔ یہ نظام انصاف، مساوات، اور سماجی بہبود پر مبنی تھا، جس نے مشرکینِ مکہ کے جابرانہ اور قبائلی اصولوں کو چیلنج کیا۔ اس نظام نے طبقاتی تفریق اور ظلم واستحصال کے خلاف آواز بلند کی، جس سے معاشرتی اقدار میں تبدیلی آئی۔

9. مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور بھائی چارہ قائم کیا: آپ ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان مضبوط بھائی چارے کی فضا پیدا کی، جس نے اسلام کی ترویج میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہی بھائی چارہ آگے چل کر اسلامی ریاست کی سیاسی و سماجی ترقی کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوا۔

10. قبائل میں سیاسی بیداری پیدا کی: آپ ﷺ کی تعلیمات نے ان قبائل میں شعور اور سیاسی بیداری پیدا کی، جو مشرکینِ مکہ کے خوف سے خاموش تھے۔ یہ بیداری اسلام کے پھیلاؤ میں ایک اہم محرک بنی، کیونکہ لوگوں نے انصاف اور مساوات پر مبنی دینِ اسلام کو قبول کرنا شروع کیا۔

11. سفارتی تعلقات اور اتحادیوں کی تلاش: آپ ﷺ نے کئی بااثر افراد اور قبائل سے اتحاد اور افہام و تفہیم کی راہیں تلاش کیں۔ یہ سفارتی تعلقات آگے چل کر مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ مشرکینِ مکہ کی سیاسی اور عسکری تنہائی مزید گہری ہو گئی، کیونکہ ان کے حلیف قبائل آہستہ آہستہ اسلام کے قریب آ گئے۔

12. پسماندہ اور محروم طبقے کو حوصلہ دیا: آپ ﷺ کی کوششوں نے ان مظلوم اور کمزور افراد کو ہمت دی، جو سماجی جبر کے باعث اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ یہی محروم طبقہ بعد میں اسلامی معاشرے میں ایک اہم ستون بنا۔

13. مستقبل کے عظیم قائدین پیدا کیے: مکی دور میں اسلام قبول کرنے والے افراد ہی مستقبل کے عظیم رہنما ثابت ہوئے۔ چاروں خلفائے راشدین (ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ) اسی دور میں اسلام لائے اور بعد میں اسلامی ریاست کی قیادت کی۔ بہت سے نامور اسلامی رہنما بھی اسی دور میں ایمان لائے، جنھوں نے مدینہ کی اسلامی ریاست کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

مکی دور میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری نے اسلامی تحریک کی کامیابی کی بنیاد رکھی۔ یہ حکمتِ عملی دشمنوں کی طاقت کو کمزور کرنے، سماجی و سیاسی شعور بیدار کرنے، اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے نہایت مؤثر ثابت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سفارت کاری، صبر، حکمت اور اعلیٰ اخلاق آج بھی قیادت، سفارت کاری، اور کامیاب تحریکوں کے لیے ایک شاندار نمونہ ہے۔ یہ تمام نکات ہمیں سکھاتے ہیں کہ دعوت، قیادت اور حکمت عملی میں کامیابی کے لیے حکمت، صبر، اعلیٰ اخلاق، اور بہترین سفارت کاری ناگزیر ہے۔

یہ سب بیان کرنے کے بعد یہ بات بھی جاننے کو ملتی ہے کہ مکی دور میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی فائدے فوری طور پر ظاہر تو نہیں ہوئے لیکن بعد میں اس دور میں اختیار کی گئی حکمتِ عملی نے اسلام کی سیاسی، علمی، معاشی اور سماجی کامیابی میں ایک قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکی دور میں ایک بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ترتیب دی جس میں آج بھی ہمارے لیے سبق ہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ قبیلۂ ثقیف عرب کا ایک طاقتور اور جنگ جو قبیلہ تھا۔ پھر ایک وقت آیا جب فتح مکہ کے بعد عرب اور دیگر علاقوں سے وفود آنے شروع ہوئے لیکن آغاز میں ہوازن اور ثقیف اس میں شامل نہ تھے بلکہ انھوں نے جنگ کا فیصلہ کیا اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان حنین کے مقام پر جنگ بھی ہوئی۔ جنگ میں

مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ پھر ایک دن آیا جب قبیلۂ ثقیف کا وفد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا اور مسلمان ہوا۔ لیکن یہ سب فتح مکہ کے بعد ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طائف کے سفر میں اہلِ طائف کا سلوک بے حد ظالمانہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زخمی بھی کیا تھا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے دعائے خیر ہی کی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد بنو ثقیف کے لوگ مدینہ حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو یہ بات یاد نہیں کروائی کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا تھا۔ یہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک شاندار کردار جس کی مثال ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیگر لوگوں سے معاملات کرتے وقت کامیابی سے ہمکنار کروایا۔

***

بیعتِ عقبہ اول و دوم اور ہجرتِ نبوی ﷺ

نبوت کے تیرہویں سال، جب قریشِ مکہ کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے، تو نبی کریم حضرت محمد مصطفی ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے ساتھیوں سمیت یثرب کی طرف ہجرت فرما گئے۔ یہی واقعہ ہجرتِ مدینہ کہلاتا ہے، اور اسی سال سے ہجری تقویم کی بنیاد رکھی گئی۔

اس سے پہلے نبی کریم ﷺ نے اپنے کچھ صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی تھی، جہاں کے بادشاہ نجاشی نے ان کا بھرپور تعاون کیا اور انھیں پناہ دی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حبشہ میں مسلمان امن و سکون کے ساتھ رہ رہے تھے اور وہاں کے حکمران کی حمایت بھی انھیں حاصل تھی، تو پھر نبی کریم ﷺ نے حبشہ کے بجائے یثرب کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے، اور اسی کا جواب تلاش کرنے کی کوشش میں، میں آپ کے سامنے وہ حکمتِ عملی اور خارجہ پالیسی رکھنا چاہتا ہوں جو نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر اختیار کی۔ اس سے پہلے کہ میں نبی کریم ﷺ کی اہلِ یثرب سے ملاقات اور ان کے ساتھ ہونے والے اہم معاہدے کی بات کروں، ضروری ہے کہ یثرب کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے تاکہ اس فیصلے کی حکمت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔

ہجرتِ مدینہ کے وقت یثرب کے معروضی حالات

سید مودودی یثرب میں آباد اوس و خزرج قبائل کی ابتدا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں یمن میں ایک شدید سیلاب آیا، جس کی وجہ

سے قوم سبا کے ایک فرد عمرو بن عامر نے اپنے خاندان کے ساتھ شمال کی طرف ہجرت کی۔ اس خاندان کا ایک حصہ شام میں آباد ہوا اور غسان کے نام سے مشہور ہوا، جبکہ دوسرے بیٹے حارثہ نے حجاز کے پہاڑوں اور بحرِ احمر کے ساحلی علاقے میں سکونت اختیار کی، جو بعد میں خزاعہ کہلایا۔ حارثہ کے دو بیٹے تھے: اوس اور خزرج، جن کی نسل بعد میں یثرب (مدینہ) میں آ کر آباد ہوئی۔ اس وقت وہاں پہلے سے یہودی قبائل موجود تھے، جو اس علاقے پر قابض تھے اور اوس و خزرج کو زرخیز زمینوں میں بسنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے[44]۔

سید مودودی مزید لکھتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک یہودی یثرب کے حکمران رہے اور اوس و خزرج کو شہر میں قدم جمانے نہ دیا۔ بعد میں اوس و خزرج نے ایک دوسرے عرب قبیلے کی مدد سے یہودیوں کے خلاف جنگ لڑی اور انھیں شہر سے نکال کر خود اس پر قابض ہو گئے۔ اس جنگ کے نتیجے میں یہودی قبائل بنی قریظہ اور بنی نضیر کو یثرب کے باہر پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا، جبکہ بنی قینقاع قبیلہ خزرج کا اتحادی بن گیا۔ اس کے ردِ عمل میں بنی قریظہ اور بنی نضیر نے اوس قبیلے کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ اس تقسیم کے بعد اوس و خزرج کے درمیان شدید دشمنی پیدا ہو گئی اور دونوں قبیلوں میں ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جنگیں جاری رہیں۔ یہودیوں نے ان جنگوں میں کبھی ایک فریق کی مدد کی اور کبھی دوسرے کی، لیکن زیادہ تر ان کا کردار مالی معاونت اور قرضے دینے تک محدود رہا، جس کی وجہ سے عرب قبائل مالی طور پر یہودیوں کے محتاج ہو چکے تھے۔

---

44 سیرت سرورِ عالم، حصہ دوم، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، پبلشر ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، (۱۹۷۸ء) بحوالہ ابن جریر کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایات اور ابو داؤد، نسائی، ابن ابی حاتم کی تحاریر۔

یثرب کی سیاسی صورتِ حال اس وقت شدید انتشار کا شکار تھی۔ اوس اور خزرج کے درمیان سو سال سے جنگیں جاری تھیں، جس نے انھیں بے حد کمزور کر دیا تھا۔ جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے قریشِ مکہ اور یہودیوں سے مدد لینے کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ عبداللہ بن ابی (جو بنی خزرج سے تھا) نے ان جنگوں میں غیر جانبدار رہنے کی پالیسی اپنائی، جس کی وجہ سے دونوں قبیلوں میں اس کا احترام تھا، اور اسے یثرب کا متفقہ سربراہ بنانے پر غور کیا جا رہا تھا۔ یثرب کے لوگ دینِ ابراہیمی کے کچھ عقائد کو مانتے تھے، اسی لیے وہ حج کی غرض سے مکہ بھی جایا کرتے تھے، تاہم وہ مشرکانہ رسومات میں بھی ملوث تھے۔

یثرب میں تین بڑے یہودی قبائل آباد تھے: بنی قینقاع (خزرج کے حلیف)، بنی نضیر (اوس کے حلیف) اور بنی قریظہ (اوس کے حلیف)۔

یہ قبائل مقامی عربوں کے ساتھ تجارتی اور مالی تعلقات رکھتے تھے، لیکن وقتاً فوقتاً سیاسی اور عسکری چالوں کے ذریعے انھیں اپنے زیرِ اثر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یثرب اس وقت داخلی کشمکش اور سیاسی عدم استحکام کا شکار تھا۔ جنگوں سے تباہ حال قبائل کو ایک مضبوط اور غیر جانبدار قیادت کی ضرورت تھی، جو ان کے درمیان امن قائم کر سکے۔ یہی وہ موقع تھا جب یثرب کے لوگ نبی کریم ﷺ کے پیغام سے متاثر ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور بعد میں آپ ﷺ کی قیادت میں یثرب اسلامی ریاست کا مرکز بن گیا۔

اہلِ یثرب سے پہلا رابطہ

یہ ایک اہم سوال ہے کہ جب پورے جزیرۃ العرب میں کوئی بھی قبیلہ نبی کریم ﷺ کی دعوت سننے کو تیار نہ تھا، تو اوس اور خزرج نے نہ صرف آپ کی بات سنی، بلکہ آپ ﷺ کو اپنے شہر یثرب آنے کی دعوت بھی دی؟ حالانکہ وہ اچھی طرح

جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے وہ قریشِ مکہ کی دشمنی مول لے لیں گے۔ پھر بھی، انھوں نے شعوری طور پر یہ فیصلہ کیا۔

سید مودودی نے اس کی تین وجوہات بیان کی ہیں:

یہود کے ساتھ رہنے کے سبب دینی تصورات سے واقفیت: یثرب کے اوس و خزرج قبائل طویل عرصے سے یہودیوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ نبی، فرشتے، وحی اور کتاب جیسے تصورات سے پہلے ہی واقف تھے۔ لہٰذا، جب انھوں نے سنا کہ مکہ معظمہ میں ایک نبی مبعوث ہوا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے، تو یہ بات ان کے لیے اجنبی نہیں تھی، بلکہ وہ پہلے سے اس کا ایک عمومی تصور رکھتے تھے۔

یہودیوں کی پیشن گوئی پر سبقت لے جانا: یہودیوں کی روایات میں مسلسل یہ ذکر تھا کہ ایک آخری نبی آنے والا ہے اور جب وہ آئے گا تو یہودی غالب ہو جائیں گے۔ اوس و خزرج کو جب معلوم ہوا کہ نبی آخر الزمان مکہ میں ظاہر ہو چکے ہیں، تو انھوں نے یہودیوں پر سبقت لے جانے کے لیے جلدی سے آپ ﷺ پر ایمان لانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح، وہ یہودیوں سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے ساتھی بننا چاہتے تھے۔

ایک ثالث اور رہنما کی تلاش: یثرب کے سیاسی حالات بدترین انتشار کا شکار تھے۔ اوس اور خزرج قبائل کے درمیان ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جنگیں جاری تھیں۔ ان کے درمیان دشمنی بے انتہا بڑھ چکی تھی اور کوئی بھی قبیلہ مکمل برتری حاصل نہیں کر سکا تھا۔ ایسے میں اہلِ یثرب کو ایک ایسے لیڈر کی ضرورت تھی، جو ثالث کا کردار ادا کر سکے اور ان میں صلح و اتحاد قائم کرے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ نبی اکرم ﷺ صرف ایک مذہبی رہنما ہی نہیں، بلکہ ایک مدبر سیاست دان اور منصف مزاج رہنما بھی ہیں، جو ان کے معاملات میں عدل و انصاف قائم کر سکتے ہیں۔

انس بن رافع کا مکہ کا سفر اور پہلا تعارف

اوس قبیلے کے سردار انس بن رافع نے قریشِ مکہ سے فوجی مدد حاصل کرنے کے لیے مکہ کا سفر کیا تاکہ وہ اپنے حریف قبیلے خزرج کو شکست دے سکے۔ مکہ میں اس کا میزبان عتبہ بن ربیعہ تھا، جو اس کا پرانا دوست تھا۔ لیکن جب انس بن رافع نے قریش سے مدد مانگی، تو عتبہ بن ربیعہ نے انکار کر دیا۔اسی دوران، یثرب کے وفد کی نبی اکرم ﷺ سے ملاقات ہوئی، جو اہلِ یثرب کے ساتھ پہلا رابطہ تھا۔ابن ہشام کے مطابق، جب یثرب کا وفد مکہ میں قیام پذیر تھا، تو نبی اکرم ﷺ نے ان سے ملاقات کی اور فرمایا[45]: کیا میں تمہیں اس چیز سے بہتر چیز نہ دوں جس کی تلاش میں تم یہاں آئے ہو؟ وفد نے پوچھا: وہ کیا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں، اس نے مجھے بندوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ میں انھیں اللہ کی عبادت کی دعوت دوں اور شرک سے روکوں۔ اس نے مجھ پر کتاب نازل کی ہے۔

یہ سن کر ایاس بن معاذؓ نے فوراً کہا: یہ تو وہی بات ہے، جو ہم یہودیوں سے سنتے آئے ہیں اور یقیناً یہ ہم سب کے لیے بہتر ہے۔

لیکن انس بن رافع کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے غصے میں مٹی اٹھا کر ایاس بن معاذ کے منہ پر مار دی اور وفد یثرب واپس چلا گیا۔ بعد میں ایاس بن معاذؓ نے اسلام قبول کر لیا، اور یہ اہلِ یثرب کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا پہلا رابطہ تھا، جو بعد میں بیعتِ عقبہ کے اہم واقعات کی بنیاد بنا۔

---

[45] سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام، تالیف محمد بن اسحاق اور ابو محمد عبد الملک، سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام، اردو ترجمہ مولوی قطب الدین احمد محمودی تسہیل ترتیب مولانا مفتی نور الاسلام، ناشر المیزان، ۲۰۱۰ء

ابن سعد کے مطابق، اسعد بن زرارہؓ اور ذکوان بن عبد قیسؓ بھی مکہ آئے اور ان کی ملاقات عتبہ بن ربیعہ سے ہوئی[46]۔ عتبہ نے ان سے کہا: "یہاں ایک شخص ہے جو نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس نے ہمیں ہمارے طور طریقوں سے روک دیا ہے۔"

یہ سن کر دونوں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جب وہ مدینہ واپس پہنچے تو اسعد بن زرارہؓ نے اسلام کا ذکر ابوالہیثم بن التیہانؓ سے کیا، جو فوراً مسلمان ہو گئے۔ یہ واقعات نبی اکرم ﷺ کے اہلِ یثرب کے ساتھ تعلقات کی ابتدائی بنیاد تھے، جو بعد میں بیعتِ عقبہ اور ہجرتِ مدینہ کی راہ ہموار کرنے کا سبب بنے۔

اوس و خزرج اور نبی کریم ﷺ کی دعوت

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمتِ عملی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یثرب کے لوگوں سے ہونے والی ملاقاتوں اور معاہدوں کا ادراک حاصل کیا جائے۔ اسی پسِ منظر میں، یثرب کے لوگوں سے پہلی ملاقات کا ایک مختصر ذکر پیشِ خدمت ہے۔

حضرت عروہ بن زبیرؒ نے اس واقعے کو "عقبہ اولیٰ" اور "عقبہ ثانیہ" کے نام سے الگ باب میں بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق، پہلی ملاقات حج کے موقع پر ہوئی، جس میں یثرب سے آٹھ افراد شریک تھے۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ نے ان کے اور ان کے قبیلے کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔ پہلی ملاقات میں نبی کریم ﷺ کا یثرب کے لوگوں سے تفصیلی تعارف ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ننھیال ہونے کی بنا پر پہلے سے بھی کچھ جان پہچان رہی ہو۔ عقبہ کی گھاٹی مکہ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی (اس

---

[46] طبقات ابنِ سعد، حصہ اول اخبار النبیؐ ص ۲۲۷، ترجمہ؛ علامہ عبداللہ العمادی، نفیس اکیڈیمی، کراچی

مقام کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں)۔ ایک قدیم روایت کے مطابق، ہر سال یثرب سے ایک گروہ مکہ آتا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق حج ادا کرتا تھا۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ لکھتے ہیں کہ پہلی ملاقات میں یثرب کے لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارے ہاں سالہا سال سے آپس میں جنگ جاری ہے، جس سے ہمیں شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی برکت سے اوس و خزرج کے درمیان یہ خونریز تصادم ختم ہو جائے گا۔ ہم واپس جا کر اپنی قوم سے بات کریں گے اور اگلے سال حج کے موقع پر آپ ﷺ سے دوبارہ ملاقات کریں گے۔ یہ وہ وقت تھا جب نبی کریم ﷺ کی بعثت کو دس سال گزر چکے تھے۔ حضرت ابو طالب، حضرت عبد المطلب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد مکہ میں کفار کے ظلم و ستم میں اضافہ ہو چکا تھا۔ قریش کو یقین تھا کہ اب نبی اکرم ﷺ کی حفاظت کے لیے کوئی مضبوط پشت پناہ موجود نہیں۔

پہلی ملاقات کے بعد اہلِ یثرب واپس چلے گئے، مگر وہاں پہنچ کر وہ خاموش نہ بیٹھے، بلکہ خفیہ طور پر دعوتِ اسلام کا کام شروع کر دیا۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ کے مطابق، یثرب میں کوئی ایسا گھر نہ تھا جہاں کم از کم ایک فرد مسلمان نہ ہوا ہو۔ جب ماحول میں خوشگوار تبدیلی دیکھی گئی تو یثرب کے مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ وہ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی کو بھیجیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو یثرب روانہ فرمایا، جو ایک بااثر قبیلے بنو عبد الدار کے فرد تھے اور بنو غنم کے علاقے میں حضرت اسعد بن زرارہؓ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔

یہاں بھی نبی کریم ﷺ کی سیاسی بصیرت نمایاں ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے یثرب میں ایک ایسے شخص کو بھیجا جو وہاں پہلے سے تعلقات رکھتا تھا اور مقامی حالات سے بخوبی واقف تھا۔ ہم یہاں سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اگر دشمن کے

علاقے میں کسی کو بھیجنا ہو، تو بہتر ہو گا کہ ایسا شخص بھیجا جائے جسے وہاں مقامی حمایت حاصل ہو۔ عربوں کے ہاں مہمان کی عزت کا بے حد خیال رکھا جاتا تھا، اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کی یثرب میں عزیزداری نے اسلام کی دعوت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغ بے حد کامیاب رہی، اور کئی اہم شخصیات نے اسلام قبول کیا، جن میں خاص طور پر حضرت سعد بن معاذؓ کا اسلام قبول کرنا مسلمانوں کے لیے ایک بڑی تقویت کا باعث بنا۔ ان کی قبولِ اسلام کی برکت سے پورا ایک قبیلہ مسلمان ہو گیا، اور یوں یثرب میں پہلا ایسا محلہ وجود میں آیا جہاں تمام افراد مسلمان ہو گئے۔ صرف ایک سال کے اندر اندر مسلمانوں کو یثرب میں ایک معزز مقام حاصل ہو گیا۔ اس دوران حضرت مصعب بن عمیرؓ مکہ واپس لوٹ آئے۔

اگلے سال حج کے موقع پر یثرب کے ستر سے زائد افراد بیت اللہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے۔ اس بار عقبہ کے مقام پر ان کی نبی اکرم ﷺ سے خفیہ ملاقات ہوئی، جسے "عقبہ ثانیہ" کہا جاتا ہے۔ اس ملاقات میں نبی اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب بھی موجود تھے۔ یثرب کے مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی، اسلام قبول کیا، اور اپنی وفاداری کا عہد کیا۔

یہاں ہمیں نبی اکرم ﷺ کی بہترین سفارت کاری اور حکمتِ عملی کا عملی نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے، جو دو قبائل کے درمیان اتحاد و یکجہتی کا ذریعہ بنی اور مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کی بنیاد ثابت ہوئی۔

آپ ﷺ اور اہلِ یثرب کے درمیان معاہدہ

بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر یہ سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ یہ بیعت نہ صرف

آپ ﷺ اور اہلِ یثرب کے درمیان ہو رہی تھی، بلکہ یہ معاہدہ مکہ اور یثرب کے دو اہم قبائل کے درمیان بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاہدے میں ہمیں دو اہم شرائط دیکھنے کو ملتی ہیں: ایک قریش سے تعلق رکھنے والے حضرت عباسؓ کی جانب سے اور دوسری حضرت ابوالہیثمؓ کی طرف سے۔

حضرت عباسؓ نے یثرب کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا پختہ عہد کریں، جس پر سب نے اتفاق کیا۔اس سے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنے خاندان کے ایک نہایت اہم فرد، حضرت عباسؓ کو ساتھ لا کر یہ واضح کیا کہ ان کا خاندان بھی اس معاہدے کا گواہ ہے۔ حضرت عباسؓ نے اہلِ یثرب سے آپ ﷺ کی مکمل حمایت اور وفاداری کا عہد لیا، جو عربوں کے لیے نہایت سنجیدہ اور بامعنی تھا کیونکہ وہ وفاداری کے اصولوں سے بخوبی واقف تھے۔

حضرت ابوالہیثمؓ نے بیعت سے پہلے ایک نہایت اہم سوال اٹھایا۔ انھوں نے آپ ﷺ سے کہا: ''یارسول اللہ! ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ ہمارے کئی دیگر قبائل کے ساتھ دوستی اور معاہدے ہیں۔ اگر ہم آپ ﷺ کی حمایت میں آگے بڑھیں تو ممکن ہے کہ ہمیں اپنے سابقہ حلیفوں سے جنگ کرنا پڑے اور وہ ہمارے دشمن بن جائیں۔ ایسی صورت میں اگر حالات ہمارے لیے مشکل ہو جائیں اور بعد میں آپ ﷺ مکہ واپس چلے جائیں، تو ہم پر کیا گزرے گی؟ کیا ہمارا تحفظ یقینی ہو گا؟''

حضرت عروہ بن زبیرؒ بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اکرم ﷺ مسکرائے اور فرمایا: ''میرے اور تمہارے خون اور قصاص یکساں ہوں گے۔ تم میرے

ہو اور میں تمہارا ہوں۔"

یہ الفاظ عرب روایت میں نہایت بڑی یقین دہانی کے مترادف تھے اور اس سے زیادہ دوستی اور اتحاد کا یقین دلانے کے لیے کوئی بہتر الفاظ ممکن نہ تھے۔ یہ سن کر اہلِ یثرب خوش ہو گئے اور سب نے اسلام قبول کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی۔

حضرت ابوالہیثمؓ، جنھوں نے یہ سوال اٹھایا تھا، وہ سب سے پہلے بولے: "اگر یہ حقیقت ہے، تو میں سب سے پہلے گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں۔"

یوں، اہلِ یثرب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مددگار بن گئے اور "انصار" کا لقب پایا۔ اس موقع پر انصار نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا کہ وہ کفارِ مکہ کے خلاف فوراً جنگ کے لیے تیار ہیں۔ تاہم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی مدبرانہ حکمتِ عملی کے تحت فرمایا: "ابھی اس کی اجازت نہیں ہے۔"

بیعت عقبہ ثانی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حکمتِ عملی

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اہلِ یثرب، دونوں نے اپنے اپنے وعدوں کی مکمل پاسداری کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مکہ سے بے حد محبت تھی، لیکن جب فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے وہاں قیام کرنا ممکن ہو گیا، تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ میں رہائش اختیار کرنے کے بجائے مدینہ واپس جانا پسند فرمایا۔ میں اس فیصلے کو بیعت عقبہ ثانی کے موقع پر انصار سے کیے گئے وعدے کی تکمیل سمجھتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ تمام مہاجرینِ مکہ نے بھی فتح مکہ کے باوجود اپنے آبائی شہر میں رہنے کے بجائے مدینہ ہی کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ نے ان تمام افراد کے نام بھی شمار کرائے ہیں جو اس بیعت میں شامل تھے اور بعد میں مدینہ کو اپنی جائے سکونت بنایا۔

یہ واقعہ ہمیں آپ ﷺ کی غیر معمولی سفارت کاری اور حکمتِ عملی کا عملی نمونہ دکھاتا ہے۔ آپ ﷺ نے دو قبائل کے درمیان ایک پائیدار معاہدہ طے کیا اور اسے بہترین طریقے سے نبھایا۔ آپ ﷺ نے اپنے قبیلے کی جانب سے ایک اہم فرد (حضرت عباس ؓ) کی گواہی اور وفاداری کا عہد شامل کر کے معاہدے کو مضبوط بنایا۔ انصار کے ساتھ ایک ایسا وعدہ کیا جسے عربوں کے نزدیک بے حد اہمیت حاصل تھی، یعنی کہ آپ ﷺ ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ یہ حکمتِ عملی آپ ﷺ کے عرب معاشرت کی روایات سے گہری واقفیت اور ان سے مثبت انداز میں کام لینے کا ثبوت ہے۔ آج بھی اگر ہم اسی تدبر اور فہم کے ساتھ اپنی بات دوسروں تک پہنچائیں، تو کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

بیعت عقبہ ثانی کے بعد آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی اور بعد میں خود بھی وہاں تشریف لے گئے۔ ہجرتِ مدینہ کی تفصیلات سیرت کی ہر مستند کتاب میں درج ہیں، لہٰذا یہاں اس پر زیادہ تفصیل میں جانے کے بجائے، میں اس امر پر توجہ مرکوز کروں گا کہ آپ ﷺ نے اہلِ یثرب سے بات چیت اور معاہدے کرتے وقت کس طرح بہترین خارجہ پالیسی ترتیب دی اور سفارت کاری کے قابل تقلید اصول قائم کیے۔

میرے نزدیک انصار کا آپ ﷺ کو یثرب آنے کی دعوت دینا محض اس لیے نہیں تھا کہ وہ آپ ﷺ سے اپنے دیرینہ قبائلی جھگڑوں کو ختم کرانے میں مدد لینا چاہتے تھے۔ بلاشبہ، یہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے، مگر سب سے بنیادی وجہ ان کا اسلام اور آپ ﷺ سے بے پناہ عشق، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی کی خواہش، اور آپ ﷺ اور صحابہ کی مدد کا جذبہ تھا۔ یہ کوئی عارضی یا وقتی جوش نہیں تھا، بلکہ ایک مستقل فیصلہ تھا، جس کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف مہاجرین کو پناہ دی، بلکہ اپنے مال میں سے بھی انھیں شریک کیا اور ہر ممکن مدد

فراہم کی۔ انصار کا یہ اقدام شجاعت، مردانگی، ایثار، اور قربانی کی ایک درخشاں مثال ہے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کہ اس فیصلے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں، انھوں نے مشرکین مکہ اوران کے حلیفوں کی دشمنی کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے، آپ ﷺ کو اپنے ہاں بلایا اور پوری محبت واخلاص کے ساتھ آپ ﷺ اور مہاجرین کا استقبال کیا۔

اس موقع پر آپ ﷺ نے بھی انصار سے کیا ہوا وعدہ مکمل وفاداری کے ساتھ نبھایا۔ باوجود اس کے کہ مکہ فتح ہو چکا تھا، آپ ﷺ نے مدینہ ہی میں رہنا پسند فرمایا۔ اسی طرح، تمام مہاجرین نے بھی آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے مکہ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کے بجائے مدینہ ہی کو اپنا مسکن بنایا۔

یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ قیادت محض حکمرانی کا نام نہیں، بلکہ اعتماد، وفاداری، اور قربانی کے اصولوں پر کاربند رہنے کا نام ہے۔ آپ ﷺ نے انصار کے اخلاص، محبت اور قربانی کی قدر کرتے ہوئے ان کے ساتھ وہی وعدہ نبھایا جو بیعت عقبہ ثانی کے موقع پر کیا تھا۔ یہ سفارت کاری، عہد کی پاسداری اور قیادت کی ایک عظیم الشان مثال ہے، جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بنی رہے گی۔

***

نبی کریم ﷺ کی ہجرت اور بین القبائلی معاہدات

پچھلے صفحات میں ہم نے آپ ﷺ کی اوس اور خزرج کے افراد سے ملاقاتوں، ان کے اسلام قبول کرنے، صحابہ کرامؓ کو مدینہ ہجرت کی اجازت دینے، اور بعد میں خود آپ ﷺ کے ہجرت فرمانے کا مختصر تذکرہ کیا۔ اب ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ وہ کون سی حکمتِ عملی تھی جسے آپ ﷺ نے اختیار کیا، جس کے نتیجے میں ایک کامیاب ہجرت ممکن ہوئی اور مدینہ منورہ میں ایک مستحکم اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔

آپ ﷺ کے پہلے سفیر حضرت مصعب بن عمیرؓ تھے، جنھیں آپ ﷺ نے مدینہ بھیجا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً تیس سال تھی، جو اس لحاظ سے نہایت موزوں تھی کہ وہ ایک مشکل وقت میں مدینہ میں رہ کر دعوتِ دین کا بوجھ اٹھانے کے قابل تھے۔ وہ نہ تو اتنی کم عمر کے تھے کہ کوئی غیر دانشمندانہ فیصلہ کر بیٹھتے، اور نہ ہی اتنے ضعیف کہ مشکلات کا سامنا نہ کر سکتے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ کے مطابق حضرت مصعب بن عمیرؓ اس سے پہلے حبشہ کا سفر بھی کر چکے تھے، جس کی وجہ سے وہ عرب کے علاوہ دیگر ممالک کی ثقافتوں اور زبانوں سے واقف تھے۔ انھیں مختلف اقوام کے لوگوں سے بات چیت کا تجربہ تھا، جو مدینہ میں ان کے مشن کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ، حضرت مصعب بن عمیرؓ کا تعلق بنی عبد الدار قبیلے سے تھا، جو خانہ کعبہ کے کلید بردار تھے۔ اس معزز خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے لوگ ان کے ساتھ معاملات کرتے وقت کسی اجنبیت کا احساس نہیں کرتے تھے۔

آپ ﷺ کا حضرت مصعبؓ کو سفیر منتخب کرنا ایک بہت بڑی حکمتِ عملی تھی۔ اس کے ذریعے اہلِ عرب کو یہ پیغام بھی دیا گیا کہ اسلام امیروں کے خلاف کسی

غریبوں کے انقلاب کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں وہ معزز اور بااثر افراد بھی شامل ہیں، جو مکہ کے صاحبِ حیثیت اور معزز خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ پہلو خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے، جنھوں نے براہِ راست آپ ﷺ سے قرآن اور اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ یہی وہ چیز تھی جس کی اہلِ مدینہ کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ اپنی نیک طبیعت، حکمت وتدبر، نرمی، اور فصاحت وبلاغت کے باعث مشہور تھے۔ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو دینِ اسلام کی مؤثر تبلیغ کے لیے ضروری تھیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر کے ایک پر تعیش زندگی کو چھوڑا اور ایک مشکل راستہ اپنایا، جو ان کے عزم وحوصلے کی ایک واضح دلیل تھی۔ ان کی شخصیت میں جو دانشمندی اور رازداری تھی، وہ مدینہ میں ان کی کامیابی کا ایک اہم عنصر بنی۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ نے اس قدر حکمت اور تدبر کے ساتھ مدینہ میں کام کیا کہ اگلے سال جب مسلمان بیعتِ عقبہ ثانی کے لیے مکہ پہنچے، تو ان کی تعداد ستر سے زائد تھی۔ اس وقت مدینہ میں کوئی ایسا گھر نہ تھا، جس میں کوئی مسلمان نہ ہو۔ یہ کامیابی نہ صرف حضرت مصعب بن عمیرؓ کی غیر معمولی کارکردگی کا نتیجہ تھی، بلکہ اس میں آپ ﷺ کے سفیروں کے بہترین انتخاب کی حکمتِ عملی بھی شامل تھی، جو آج بھی ہمارے لیے بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ حضرت مصعب بن عمیرؓ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

ہجرتِ مدینہ اور آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی وسفارت کاری

ہجرتِ مدینہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں تھا، بلکہ یہ آپ ﷺ کی دور اندیشی، حکمتِ عملی، اور سفارت کاری کی ایک شاندار مثال ہے۔ اس موقع پر ہمیں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارتی مہارت کے کئی اہم نکات سمجھنے کا موقع ملتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

1. اہلِ یثرب سے خاندانی تعلقات: اہلِ یثرب (مدینہ) سے آپ ﷺ کے خاندانی تعلقات تھے، آپ ﷺ کی والدہ کا تعلق یثرب سے تھا، جن کا عرب معاشرے میں خاص احترام کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ یثرب نے آپ ﷺ کا خیر مقدم کیا اور آپ ﷺ کو اپنے درمیان جگہ دی۔

2. یہودیوں کے ساتھ ممکنہ اتحاد: یثرب کے لوگ پہلے ہی یہودیوں کے حلیف تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آپ ﷺ اہلِ یثرب سے معاہدہ کرتے، تو یہودی بھی اس اتحاد میں شامل ہو سکتے تھے۔ اس طرح مدینہ کے مسلمان اور یہودی مل کر قریش کی طاقت کا مقابلہ کر سکتے تھے، جیسا کہ بعد میں میثاقِ مدینہ کے ذریعے ثابت ہوا۔

3. حبشہ کی ہجرت اور مدینہ کی دعوت: حبشہ کی ہجرت حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی دعوت پر نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے حکم پر ہوئی تھی۔ اس کے برعکس، اہلِ یثرب نے خود آپ ﷺ کو دعوت دی کہ آپ وہاں آکر ان کے درمیان رہیں، اور وہ آپ ﷺ کی مکمل حفاظت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار تھے۔ یہ ایک سنہری موقع تھا، جسے آپ ﷺ نے بہترین انداز میں استعمال کیا۔

4. عربی زبان اور ثقافت سے ہم آہنگی: یثرب میں رہ کر آپ ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کی تبلیغ بہتر انداز میں کر سکتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ عربی زبان، ان کی ثقافت، روایات اور معاشرتی نظام سے مکمل طور پر واقف تھے۔ اس کے مقابلے میں افریقہ (حبشہ) ایک مختلف تہذیب رکھتا تھا، جو اسلامی دعوت کے لیے زیادہ موزوں نہ تھا۔

5. اہلِ یثرب کی یہودیوں سے واقفیت: یثرب کے لوگ یہودیوں سے سن چکے تھے کہ ایک عربی نبی آنے والے ہیں، اور وہ اس کے انتظار میں ہیں۔ جب انھیں علم ہوا کہ مکہ میں نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث ہو چکے

ہیں، تو انھوں نے یہودیوں سے پہلے ایمان لانے کی خواہش ظاہر کی اور خود آپ ﷺ سے رابطہ کیا۔ آپ ﷺ نے بھی ان کی اس خواہش کا احترام کیا۔

6. مدینہ: ایک نئی ریاست کے قیام کے لیے موزوں جگہ: حبشہ میں ایک مضبوط بادشاہت پہلے سے قائم تھی، جہاں ایک نیک دل مگر خود مختار حکمران نجاشی حکمرانی کر رہا تھا۔ ایسے میں وہاں اسلامی حکومت قائم کرنا ایک مشکل امر تھا۔ اس کے برعکس، مدینہ میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی، اور اہلِ یثرب خود آپ ﷺ کو اپنا سربراہ بنانے کے لیے تیار تھے۔ اس لیے مدینہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ایک بہترین جگہ ثابت ہوا۔

7. تجارتی نُقطۂ نظر سے مدینہ کا محلِ وقوع: یثرب (مدینہ) مکہ اور شام کے تجارتی راستے کے درمیان واقع تھا۔ قریش جب تجارت کے لیے شام جاتے، تو انھیں لازمی طور پر یثرب کے قریب سے گزرنا پڑتا۔ آپ ﷺ کے مدینہ میں قیام نے قریش کے قافلوں کے لیے ایک ممکنہ خطرہ پیدا کر دیا، جس کا اثر جنگِ بدر کے موقع پر واضح طور پر نظر آیا۔

8. ہجرت کے لیے بہترین حکمتِ عملی: ہجرتِ مدینہ کے لیے بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ جیسی ملاقاتوں میں کمال درجے کی رازداری برتی گئی۔ یہ بات حیران کن ہے کہ قریش کو حج کے موقع پر ہونے والی ان ملاقاتوں کی بالکل بھی خبر نہ ہو سکی۔ جب انھیں علم ہوا، تب تک ستر سے زائد افراد جو بیعت کر چکے تھے، واپس مدینہ جا چکے تھے۔ یہ آپ ﷺ کی غیر معمولی حکمتِ عملی کا ایک شاندار نمونہ تھا۔

9. اہلِ یثرب کی داخلی کشمکش اور آپ ﷺ کی حیثیت: مدینہ میں اوس اور خزرج کے قبائل کے درمیان شدید خانہ جنگی چل رہی تھی، جس نے انھیں بے حد نقصان پہنچایا تھا۔ خاص طور پر جنگِ بعاث نے ان کی طاقت کو تباہ کر دیا تھا۔ ایسے میں انھیں ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو دونوں قبائل کے درمیان امن قائم کر سکے۔

آپ ﷺ کی امانت داری، دیانت داری اور اعلیٰ کردار نے انھیں آپ ﷺ کو اپنا سربراہ تسلیم کرنے پر آمادہ کر دیا۔

10. ہجرت اور اسلامی کیلنڈر کا آغاز: ہجرتِ مدینہ کے سال سے اسلامی ہجری کیلنڈر کا آغاز کیا گیا، جو اسلام کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھا کہ اسلام ایک باقاعدہ نظام کے تحت اپنی بنیاد رکھ چکا ہے۔

11. ایک اسلامی ریاست کا قیام: مسلمان ایک عرصے سے اپنا نظریہ رکھتے تھے، لیکن ان کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جسے وہ اپنی ریاست قرار دے سکیں۔ اگرچہ مکہ میں دارِ ارقم کو مرکز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، لیکن وہاں ایک آزاد اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہ تھا۔ مدینہ وہ پہلی جگہ تھی جہاں مسلمان آزاد ہو کر اپنی ریاست قائم کر سکتے تھے۔ یہاں آپ ﷺ نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی، جس میں فوج، عدلیہ، اور دیگر ضروری ادارے قائم کیے جا سکتے تھے۔

یہ تمام عوامل یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہجرتِ مدینہ محض ایک جغرافیائی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ ایک عظیم مقصد کی جانب سفر تھا۔ ہجرتِ مدینہ ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ اگر کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اپنے وطن کو چھوڑنا پڑے، تو یہ کوئی کمزوری نہیں بلکہ عزم اور حوصلے کی علامت ہے۔ یہ قربانی دینِ اسلام کی حفاظت اور ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کے لیے ضروری تھی۔

ہجرت ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ اگر حالات ناموافق ہوں، تو نئی جگہ جا کر اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا بہترین حکمتِ عملی ہو سکتی ہے۔ یہ صرف ایک سفر نہیں تھا، بلکہ ایک نئی زندگی اور ایک مضبوط اسلامی ریاست کے قیام کی بنیاد تھی۔

اللہ ہمیں بھی ہجرتِ مدینہ کے اسباق سے سیکھنے اور اسلام کی سربلندی کے لیے حکمت، صبر، اور قربانی کا جذبہ عطا فرمائے۔ آمین۔

***

نبی کریم ﷺ کی سفارتی حکمت عملی اور مدینہ کا نظم ونسق

میں نے پچھلے صفحات میں آپ ﷺ کی مبارک زندگی کے چند اہم واقعات بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ذکر کیا ہے۔اب میں مدینہ منورہ ہجرت کے بعد پیش آنے والے اہم واقعات کا جائزہ لوں گا اور ان مواقع پر آپ ﷺ کی حکمتِ عملی، خارجہ پالیسی،اور سفارت کاری کے نمایاں پہلوؤں کو بھی واضح کیا جائے گا۔

آپ ﷺ کے بہت سے صحابہؓ پہلے ہی یثرب (مدینہ) ہجرت کر چکے تھے،اور آخر میں خود آپ ﷺ نے بھی ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔یہاں ہجرت کی تفصیلی وضاحت مقصود نہیں،تاہم اس کا ایک مختصر ذکر ان واقعات کو سمجھنے میں مدد دے گا جو بعد میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی سے منسلک ہیں۔آپ ﷺ نے یہ سفر حضرت ابو بکرؓ کے ہمراہ کیا،اور اس دوران کئی اہم واقعات پیش آئے جن کا تفصیلی تذکرہ سیرت کی کتب میں موجود ہے۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد، آپ ﷺ نے کئی اہم اقدامات اٹھائے، جن میں سے بعض کا براہِ راست تعلق آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی سے تھا۔ ان میں خاص طور پر یثرب میں بسنے والے مختلف قبائل اور اس کے گرد و نواح میں موجود قبائل سے تعلقات استوار کرنا شامل تھا۔یہی ہمارے مطالعے کا بنیادی موضوع ہے۔

یثرب مدینہ بن گیا

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ یثرب میں آ بسے تو سب سے پہلا اہم قدم یہ اٹھایا گیا کہ اس شہر کا نام تبدیل کر دیا گیا۔ اسے ''مدینۃ النبی'' کہا جانے لگا، جو بعد میں ''مدینہ منورہ'' کے نام سے مشہور ہوا، اور اب عام طور پر ''مدینہ'' کہلاتا ہے۔ یہ نام کی تبدیلی در حقیقت اہلِ عرب کے لیے ایک واضح پیغام تھا کہ مسلمانوں کا اب ایک مستقل شہر اور مرکز موجود ہے، جو ان کی ریاست کا صدر مقام بھی ہے۔

آئندہ کے واقعات میں ہم یثرب کے بجائے مدینہ کا ہی ذکر کریں گے۔ مدینہ، مکہ معظمہ کے شمال میں تقریباً ساڑھے چار سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ (یہ فاصلہ راستے کے انتخاب کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔) میں نے پچھلے صفحات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے وقت مدینہ کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اس لیے انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ضرور بیان کرنا اہم ہے کہ آپ ﷺ کی آمد کے بعد مدینہ میں کون سے بنیادی اور اہم اقدامات کیے گئے۔

آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد مدینہ میں مسلمان دو گروہوں میں پہچانے جانے لگے: مہاجرین اور انصار۔ ''انصار'' وہ لوگ تھے جو پہلے سے یثرب میں آباد تھے اور جنھوں نے آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی، جبکہ ''مہاجرین'' وہ تھے جو مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں گروہوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کا ایک مضبوط رشتہ قائم کیا، جسے ''مواخاتِ مدینہ'' کہا جاتا ہے، اور خود ان سب کے سرپرست بنے۔

ہر ریاست کو ایک مضبوط مرکز کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں سے اس کے انتظامی، معاشرتی، اور مذہبی امور کو چلایا جا سکے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے مرکز کے قیام اور باہر سے آنے والے لوگوں کی سہولت کے لیے مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر

فرمائی۔ یہ مسجد صرف عبادت کی جگہ نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی مرکز بھی تھی، جہاں ریاست کے اہم فیصلے کیے جاتے، وفود کا خیر مقدم ہوتا، اور سفارتی امور نمٹائے جاتے۔

مدنی دور، جو تقریباً دس سال پر محیط ہے، میں کئی اہم واقعات پیش آئے، جن میں جنگیں، میثاقِ مدینہ، صلح حدیبیہ، غیر ملکی حکمرانوں کو خطوط کا ارسال، وفود کا استقبال، فتح مکہ، اور دیگر اہم واقعات شامل ہیں۔ میں ان مواقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا مطالعہ پیش کروں گا، کیونکہ انھی میں ہمارے لیے رہنمائی موجود ہے۔ آج بھی، اگر ان اصولوں پر عمل کیا جائے تو نہ صرف مسلمان بلکہ دنیا کی کوئی بھی قوم اپنے پیچیدہ مسائل حل کر سکتی ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ مدنی دور کے اہم واقعات کو زمانی ترتیب کے مطابق بیان کیا جائے۔ تاہم، بعض واقعات طویل عرصے پر محیط تھے، اس لیے بعض مقامات پر زمانی ترتیب کے بجائے ان کی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مدنی دور کے تمام واقعات کو بیان کرنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا میں نے چند اہم واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ باقی واقعات کم اہم تھے۔ میرے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کا ہر لمحہ قابلِ رشک اور ہمارے لیے مکمل رہنمائی کا ذریعہ ہے۔

مدینہ کے مقامی قبائل سے معاہدے

مدینہ منورہ میں آمد کے فوراً بعد نبی کریم ﷺ نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ مسلمانوں کی حفاظت اور اسلام کی دعوت کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مدینہ اور اس کے ارد گرد کے قبائل کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں۔ اسی کے پیشِ نظر، آپ ﷺ نے مدینہ کے قرب و جوار میں

بسنے والے قبائل سے ملاقاتوں کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں کئی قبائل کے ساتھ معاہدے طے پائے۔ ان معاہدوں کے ذریعے مسلمانوں اور پڑوسی قبائل کے درمیان ایک مضبوط اتحاد قائم ہو گیا، جو آگے چل کر مسلمانوں کے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہوا۔

ان معاہدوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب قریش نے مدینہ پر حملے کیے تو کسی بھی مقامی قبیلے نے ان کی مدد نہیں کی۔ اگر قریش کو مدینہ کے اطراف کے قبائل کی حمایت حاصل ہوتی تو جنگوں کے نتائج مختلف ہو سکتے تھے۔ یہاں ہمیں نبی کریم ﷺ کی بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی جھلک نظر آتی ہے۔ آگے ہم ابتدائی معاہدوں اور ان کے اثرات پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

مدینہ آمد اور ابتدائی قیام

نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے قباء میں قیام فرمایا، جہاں آپ ﷺ نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ (سیرت ابن ہشام، صفحہ ۴۳۱)۔ بعد ازاں، مدینہ کے مختلف قبائل نے آپ ﷺ کی میزبانی کی خواہش ظاہر کی، مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اونٹنی کو آزاد چھوڑ دیا جائے، جہاں وہ بیٹھے گی، وہی آپ ﷺ کا قیام ہو گا۔ یہ اونٹنی بنی مالک بن نجار کے محلے میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر کے قریب جا کر بیٹھی، اور اس طرح حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد، نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا آغاز فرمایا اور خود بھی تعمیراتی کام میں بھرپور حصہ لیا۔ یوں مدینہ میں ایک مستقل اسلامی مرکز بن گیا۔

مہاجرین اور انصار کے درمیان معاہدہ، نیز یہودیوں سے مصالحت

جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو یہاں چار طبقات کے لوگ آباد تھے: اوس، خزرج، مہاجر مسلمان اور یہودی۔ اوس اور خزرج کو اجتماعی طور پر انصار کہا جاتا تھا۔ یہ سب اپنی الگ شناخت رکھتے تھے اور اوس و خزرج کے درمیان دیرینہ دشمنی بھی تھی۔ دوسری طرف، یہودی بھی ایک علیحدہ سماجی اور مذہبی حیثیت رکھتے تھے اور عمومی طور پر آپ ﷺ کی آمد سے خوش نہیں تھے، کیونکہ آپ ﷺ ان کی دعوت پر نہیں، بلکہ انصار کی خواہش اور حمایت کے نتیجے میں مدینہ تشریف لائے تھے۔

اس سے قبل، حضرت مصعب بن عمیرؓ مدینہ میں تبلیغ کے لیے آئے، جس کے نتیجے میں انصار کی اکثریت شرک سے تائب ہو کر اسلام قبول کر چکی تھی، تاہم یہودیوں نے عمومی طور پر اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ادھر مہاجرین قلیل تعداد میں مدینہ پہنچے تھے۔ وہ اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ مدینہ کو اپنی دعوت اور اسلامی ریاست کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے، آپ ﷺ نے ابتدائی خطبات میں ریاست کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا۔ آپ ﷺ کے یہ دو اہم خطبے سیرت ابن ہشام میں نقل کیے گئے ہیں، جن میں حلال و حرام، انفاق فی سبیل اللہ، حق و سچ، اور توحید جیسے بنیادی موضوعات پر روشنی ڈالی گئی۔

جب ایک شہر میں مختلف طبقات کے لوگ آباد ہوں، تو ان کے درمیان کسی عمرانی معاہدے (Social Contract) کا قیام ضروری ہوتا ہے، تاکہ وہ ایک منظم ریاست کے شہری بن کر امن و استحکام کے ساتھ رہ سکیں۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں اسی اصول کے تحت ایک تاریخی معاہدہ ترتیب دیا، جسے "میثاقِ مدینہ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ معاہدہ کئی مستند تاریخی کتب میں درج ہے:

سیرت ابن ہشام میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

شبلی نعمانی (سیرت النبی ﷺ) نے اس معاہدے کی سات بنیادی شرائط بیان کی ہیں۔

رحیق المختوم میں اس کی بارہ دفعات نقل کی گئی ہیں۔

جعفر سبحانی نے اس معاہدے کے چار حصے اور ۷۳ شقیں تحریر کی ہیں[47]۔

ڈاکٹر طاہر القادری نے اس پر مکمل کتاب لکھی اور اسے میثاقِ مدینہ کا نام دیا[48]۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس معاہدے کی ۵۲ شقیں درج کی ہیں[49]۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بھی اس پر تفصیل سے لکھا ہے[50]۔

سید مودودی نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے[51]۔

یہاں میرا مقصد اس معاہدے کی مکمل تفصیلات بیان کرنا نہیں بلکہ اسے نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے تناظر میں پیش کرنا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس معاہدے کے ذریعے ریاستِ مدینہ کے استحکام کی بنیاد کیسے رکھی، اور یہ معاہدہ آج کے دور میں اقوامِ عالم کے لیے کس طرح ایک مثالی نمونہ بن سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی مدبرانہ قیادت اور سفارتی حکمتِ عملی نے نہ صرف مہاجرین اور انصار کو ایک متحد قوم میں تبدیل کیا بلکہ یہودیوں کے ساتھ بھی ایسا معاہدہ قائم کیا،

---

[47] Ja'far Subhani, *The Message*, publisher: Islamic Seminary Publications P O Box 5425 Karachi, Pakistan

[48] میثاق مدینہ، شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری، منہاجُ القرآن پبلیکیشنز، لاہور

[49] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، عبداللہ اکیڈمی، ۲۰۱۶ء

[50] محاضراتِ سیرت، ڈاکٹر محمود احمد غازی، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۰۹

[51] یہودِ یثرب اور میثاقِ مدینہ، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۱ فروری

جس میں امن، باہمی تعاون اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ یہی وہ اصول ہیں جن پر عمل کرتے ہوئے آج بھی کسی بھی قوم کو استحکام اور ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔

میثاقِ مدینہ: ریاستِ مدینہ کا دستور

ہجرتِ مدینہ پر ہم پہلے ہی تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہمارا موضوع ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ کی وہ سرگرمیاں ہیں، جن کا تعلق مدینہ میں بسنے والے قبائل کے ساتھ کیے گئے معاہدات سے ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آپ ﷺ کا پہلا معاہدہ مدینہ کے ہی باشندوں کے ساتھ ہوا، جو بیت عقبہ (اولیٰ و ثانیہ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرے نزدیک، یہی آپ ﷺ کی زندگی کا پہلا اہم سفارتی اور خارجی پالیسی کا اقدام تھا، جہاں آپ ﷺ نے مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے مدینہ کے دو بڑے قبائل، اوس اور خزرج، کے ساتھ ایک غیر تحریری معاہدہ کیا۔ اس ابتدائی معاہدے میں مدینہ کے یہودی شامل نہیں تھے۔ مدینہ منورہ آمد کے بعد، آپ ﷺ نے ایک اور جامع معاہدہ کیا، جس میں مدینہ کے تمام قبائل کو شامل کیا گیا۔ اس معاہدے کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، مگر سب سے زیادہ اسے ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے جانا اور لکھا جاتا ہے۔

میثاقِ مدینہ: ایک جدید ریاستی نظام کی بنیاد

یہ معاہدہ درحقیقت مختلف قبائل کے درمیان ایک عمرانی معاہدہ تھا، جس کی بنیاد انسانی حقوق، مساوات اور انصاف پر رکھی گئی تھی۔ اس کا بنیادی مقصد امن و استحکام قائم کرنا اور ہر فرد کو اپنے شخصی معاملات میں مکمل آزادی دینا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ، مختلف سماجی اکائیوں کو ایک مضبوط اور متحد قوم میں بدلنا بھی اس معاہدے کا ایک اہم پہلو تھا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس وقت مدینہ میں متعدد مذاہب اور مختلف نسلی و قبائلی پس منظر رکھنے والے افراد آباد تھے۔ اس لحاظ سے، مدینہ کا سماج ایک متنوع اور کثیر الثقافتی معاشرہ تھا، جس میں مشترک اقدار بہت کم تھیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ایسی مشترکہ بنیاد تلاش کی، جو تمام لوگوں کو یکجا کر سکے۔ یہ مشترکہ اقدار امن، مرکزیت، ریاست کا قیام ودفاع اور شخصی آزادی تھیں، جن پر میثاقِ مدینہ کی بنیاد رکھی گئی اور یہی اس کی کامیابی کا سبب بنیں۔

میثاقِ مدینہ: ایک جدید شہری ریاست کا قیام

میثاقِ مدینہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بنیاد مذہب، نسل یا زبان کے بجائے ''شہریت'' پر رکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاہدے میں مدینہ کے ہر باشندے کو، بلا تفریق مذہب، نسل اور زبان، ریاست کا برابر کا شہری قرار دیا گیا۔ اسے وہی حقوق حاصل تھے، جو کسی اور کو حاصل تھے۔ اس معاہدے کی رو سے قبائلی سرداروں کا فیصلہ سازی میں اختیار ختم کر دیا گیا اور یہ اختیار ریاست کو منتقل کر دیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت کسی فرد کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ خود انتقام لے یا انصاف کے نام پر اپنی عدالت لگائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عرب کی سرزمین پر ایک باقاعدہ حکومتی نظام متعارف کرایا گیا اور لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ اب وفاداری قبائل کے بجائے ریاست کے ساتھ ہونی چاہیے۔

میثاقِ مدینہ: ایک جدید ریاستی تصور

میثاقِ مدینہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ایک پرامن اور مستحکم معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ افراد کی وفاداری کسی قبیلے، برادری، نسلی یا لسانی گروہ کے بجائے ریاست سے ہو۔ یہی وہ اصول ہے جو آج کے ترقی یافتہ ممالک نے اپنایا ہے، اور وہ

شدت سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ ان کے ہاں قیادت کا انتخاب کسی قبیلے یا برادری کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ریاست سے وفاداری کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

میثاقِ مدینہ اور نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی

میثاقِ مدینہ ہمیں نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی کے ایک انتہائی اہم پہلو سے روشناس کراتا ہے۔ اس وقت دنیا میں بادشاہت کا رواج تھا، جہاں ریاست کا مرکز عوام نہیں، بلکہ بادشاہ کی ذات ہوا کرتی تھی۔ اس پس منظر میں، نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں جو ریاستی نظام قائم کیا، وہ دنیا کے لیے ایک نئی مثال تھا، کیونکہ عرب اور اس کے گرد و نواح میں اس سے قبل ایسا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔

ریاستِ مدینہ: بادشاہت کے خاتمے کی بنیاد

میثاقِ مدینہ کے بعد، عرب کے دیگر قبائل اور آس پاس کی بادشاہتوں کو یہ واضح پیغام ملا کہ اب قبائلی سرداری اور بادشاہت کا دور ختم ہو رہا ہے، اور ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہی وہ خوف تھا، جو قبائلی سرداروں اور ارد گرد کی بادشاہتوں کے حکمرانوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا، اور اسی خوف کی بنیاد پر وہ ریاستِ مدینہ کے خلاف متحد ہو گئے اور اس کے خاتمے کے درپے ہو گئے۔

میثاقِ مدینہ: جدید بین الاقوامی تعلقات کے لیے ایک مثالی نمونہ

اس مقالے کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ میثاقِ مدینہ مختلف تہذیبوں اور قوموں کے درمیان تنازعات اور تصادم کے حل کے لیے کس طرح ایک مؤثر ماڈل فراہم کرتا ہے۔ جس طرح ''صلح حدیبیہ'' نے اسلامی دعوت کو وسعت دینے اور دور دراز علاقوں تک پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا، اسی طرح ''میثاقِ مدینہ'' نے بھی ریاستِ مدینہ کے قیام، استحکام اور ایک مضبوط حکومتی

ڈھانچے کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ معاہدہ آج بھی دنیا کے لیے ایک عملی اور قابلِ تقلید مثال ہے، جو ہمیں سکھاتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات اور سماجی استحکام کے لیے مذہب، نسل اور زبان سے بالاتر ہو کر ایک متفقہ آئین اور اصولوں پر مبنی ریاستی نظام کس قدر ناگزیر ہے۔

امن انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ کی مدینہ آمد سے قبل، اوس اور خزرج قبائل کے درمیان ایک صدی سے زائد عرصے سے جنگ جاری تھی، جبکہ یہودی قبائل الگ تھلگ رہتے تھے۔ اس کے علاوہ، مجموعی طور پر بھی علاقے میں شدید بدامنی پائی جاتی تھی، جس کی سب سے بڑی وجہ ایک مرکزی حکومت کا نہ ہونا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا، آپ ﷺ کی آمد کے وقت عرب میں محض قبائلی نظام قائم تھا، اور کسی بھی قسم کی مرکزی حکمرانی کا وجود نہیں تھا۔ یہی سبب تھا کہ عرب معاشرہ انتشار اور بدامنی کی لپیٹ میں تھا۔

مدینہ پہنچنے کے بعد، آپ ﷺ نے سب سے پہلے وہاں کے مختلف قبائل کو یکجا کرنے اور ایک منظم ریاستی نظام کے تحت چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے "میثاقِ مدینہ" مرتب کیا، جسے میں امن کا معاہدہ بھی کہہ سکتا ہوں۔ ایک دوسرے کے سخت دشمن قبائل کو یکجا کرنا آسان نہ تھا، اور پھر ان میں یہودیوں کو بھی شامل کرنا ایک انتہائی مشکل امر تھا۔ اس وقت امن کا قیام بلاشبہ ایک بڑا چیلنج تھا۔

آپ ﷺ کو امن کی ضرورت کا شدید احساس تھا، کیونکہ مشرکینِ مکہ ایک بڑی طاقت کی صورت میں آپ کے خلاف صف آرا تھے، اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ وہ مدینہ میں بھی مسلمانوں کو چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ اسی لیے، آپ ﷺ نے مدینہ کے مختلف قبائل کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تاکہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ ممکنہ جنگ کی صورت میں مدینہ کے قبائل سے کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ میرے خیال میں، میثاقِ مدینہ کے پس منظر میں یہ ایک نہایت اہم پہلو تھا۔

دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اگر اوس اور خزرج، جن میں سے اکثر اسلام قبول کر چکے تھے، باہمی جنگوں میں مصروف رہتے، تو پھر اسلام کا دفاع کون کرتا؟ چنانچہ، میثاقِ مدینہ کی شرائط میں ہر ممکنہ اختلاف کا ایک منصفانہ حل موجود تھا، جس نے مدینہ میں پہلی بار ایک منظم سماجی اور سیاسی ڈھانچہ قائم کیا۔

ہجرت کے وقت مدینہ کی سماجی و سیاسی حیثیت کو سمجھنا اس معاہدے کی اہمیت کو جاننے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ درحقیقت، میثاقِ مدینہ آپ ﷺ کی عظیم قیادت اور حکمتِ عملی کی روشن مثال ہے، جو ایک زبردست تاریخی انقلاب کی بنیاد ثابت ہوئی۔ مدینہ کو قتل و غارت سے بچانے، ایک منظم ریاست کے قیام، اور ایک متفقہ آئین کی ضرورت تھی، اور آپ ﷺ نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ اس معاہدے کے بعد مدینہ کے باشندوں کے درمیان کبھی کوئی جنگ نہیں ہوئی، اور اوس و خزرج قبائل نے امن و سکون کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں میثاقِ مدینہ کو قیامِ امن کی راہ میں سب سے اہم پیش رفت سمجھتا ہوں۔

معاہدے کے مطابق، اللہ کے رسول ﷺ کو ثالث اور امیر کی حیثیت حاصل ہوئی۔ مدینہ کے قبائل نے آپ ﷺ کو اپنے تنازعات کے حل کے لیے ثالث تسلیم کیا، کیونکہ عربوں میں یہ روایت تھی کہ وہ اپنے جھگڑوں کے تصفیے کے لیے باہر سے کسی معتبر ثالث کو بلاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ پہلے ہی سے "صادق" اور "امین" کے نام سے مشہور تھے، اور یہ خطاب انھیں مکہ کے باشندوں کی طرف سے دیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ محض ایک امن معاہدہ نہیں تھا، بلکہ ایک نئے ریاستی نظام کی بنیاد بھی تھا، جو آئندہ اسلامی ریاست کے لیے ایک مثالی نمونہ ثابت ہوا۔

میثاقِ مدینہ کے اہم نکات

مشہور اسلامی مؤرخ ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق، **میثاقِ مدینہ کی کل ۵۲ دفعات** تھیں[52]۔ میرے نزدیک ان میں تین بنیادی نکات سب سے زیادہ اہم ہیں:

ریاست کا حاکم کون ہو گا اور عوام کا اس میں کیا کردار ہو گا؟

ریاست کی خارجہ پالیسی کیا ہو گی؟

ریاست کے شہریوں کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟

1. ریاست اور حکمرانی کے اصول

میثاقِ مدینہ کی ابتدائی دفعات میں یہ طے کیا گیا کہ:

- ❖ مدینہ میں رہنے والے تمام قبائل ریاستِ مدینہ کا حصہ تصور کیے جائیں گے، اور ہر باشندہ اس ریاست کا شہری ہو گا۔
- ❖ اللہ کے رسول ﷺ کو تمام معاملات میں مرکزی اتھارٹی تسلیم کیا جائے گا۔

کسی بھی جنگ یا اہم فیصلے کے لیے آپ ﷺ کی اجازت ضروری ہو گی۔

- ❖ ریاستی امور میں مشورے اور مشاورت کے عمل کو فروغ دیا جائے گا۔

2. خارجہ پالیسی اور دفاع

میثاقِ مدینہ کی دفعات میں خارجہ امور اور دفاع کے حوالے سے درج ذیل اہم نکات شامل تھے:

- ❖ مدینہ پر حملے کی صورت میں تمام قبائل مل کر اس کا دفاع کریں گے۔

---

[52] سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام نے ایک طویل تحریر لکھی ہے۔ کئی لوگوں نے اس سے اس معاہدے کی دفعات نکالی ہیں۔ سب سے زیادہ دفعات ڈاکٹر حمید اللہ نے بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، عبداللہ اکیڈمی، ۲۰۱۶ء

- ❖ کوئی بھی قبیلہ انفرادی طور پر کسی دوسری طاقت کے ساتھ امن معاہدہ نہیں کر سکے گا۔ اگر کوئی حملہ آور مدینہ پر چڑھائی کرے گا، تو تمام قبائل مل کر اس کے خلاف جنگ کریں گے۔
- ❖ قریش اور ان کے اتحادیوں کی کسی بھی صورت میں مدد نہیں کی جائے گی۔
- ❖ یہودیوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے، اور انھیں بھی مذہبی آزادی دی جائے گی۔
- ❖ یہودی، جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو سہولت فراہم کریں گے۔
- ❖ غداری اور بے وفائی کی صورت میں سخت سزا دی جائے گی۔

3. شہریوں کے حقوق و فرائض

میثاقِ مدینہ میں ریاست کے باشندوں کے حقوق اور فرائض کا بھی واضح تعین کیا گیا:

- ❖ یہودی اور مسلمان اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے میں مکمل آزاد ہوں گے۔
- ❖ معاہدے میں شامل تمام قبائل پر لازم ہوگا کہ وہ مدینہ کے دفاع میں اپنا کردار ادا کریں۔
- ❖ اختلاف کی صورت میں فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ کے رسول ﷺ کو ہوگا۔
- ❖ معاہدے میں شامل کسی بھی فریق کو قریش کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

میرے نزدیک میثاقِ مدینہ محض ایک معاہدہ نہیں تھا، بلکہ یہ پہلی اسلامی ریاست کا باقاعدہ دستور تھا۔ اس معاہدے نے ریاستِ مدینہ کو ایک متحد اور مضبوط سیاسی، سماجی، اور دفاعی نظام فراہم کیا، جس کی بنیاد امن، مساوات، اور انصاف پر رکھی گئی تھی۔

میثاقِ مدینہ کے دوررس نتائج

جب میثاقِ مدینہ لکھا جا رہا تھا، تو شاید کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس معاہدے کے کتنے وسیع اور دیرپا اثرات ہوں گے۔ تاہم، اللہ کے رسول ﷺ کو اس کے حقیقی فوائد کا مکمل علم تھا۔ میثاقِ مدینہ کے بعد حاصل ہونے والے اہم فوائد درج ذیل ہیں:

1. **شہری حقوق اور انصاف کا قیام:** یہ پہلا موقع تھا کہ مدینہ میں رہنے والے تمام افراد کے حقوق اور فرائض کو تحریری شکل دی گئی۔ ہر شہری کو تحفظ اور دفاع کی ضمانت دی گئی، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ قانون کی حکمرانی قائم ہوئی اور خانہ جنگی کی بجائے انصاف کو فروغ ملا۔ مدینہ کے قبائل کو ایک متحد سیاسی ادارہ فراہم کیا گیا۔

2. **قبائلی نظام کی جگہ ریاستی نظام کا قیام:** قبائلی انتشار کا خاتمہ کر کے مرکزی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ عرب میں پہلی بار ایک منظم ریاستی نظام متعارف کرایا گیا، جو اہلِ عرب کے لیے بالکل نیا تھا۔ مشترکہ مقاصد کے لیے ایک پرامن سیاسی حل فراہم کیا گیا، جس سے مدینہ کے قبائل کے درمیان مستقل کشمکش ختم ہو گئی۔

3. **طاقت کے مرکز کا استحکام:** ریاست کے شہریوں نے خود کو ایک اکائی کے طور پر تسلیم کیا اور باہمی انحصار کو فروغ ملا۔ قبائل نے خود کو ریاست کا حصہ سمجھنا شروع کیا، جس سے انھیں تحفظ اور خود اعتمادی حاصل ہوئی۔

4. **جدید دنیا کے لیے ایک قابل عمل ماڈل:** میثاقِ مدینہ کو آج کے عالمی تنازعات کے حل کے لیے بھی بطور مثال استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اقوامِ متحدہ (UNO) کسی حد تک اس کی شکل ہے، لیکن یہ طاقتور ممالک کے مفادات کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ اگر میثاقِ مدینہ کے اصولوں پر عمل کیا جائے، تو دنیا میں حقیقی امن قائم ہو سکتا ہے۔

5. وفاقی نظام اور مذہبی آزادی: میثاقِ مدینہ کے تحت مرکزی حکومتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا، لیکن قبائل کو داخلی خودمختاری حاصل رہی۔ ہر گروہ کو اپنے مذہب پر مکمل آزادی کے ساتھ عمل کرنے کی ضمانت دی گئی۔ ریاستی فیصلوں میں مشاورت کے اصول کو لازمی قرار دیا گیا۔

6.قریش کے خلاف حکمتِ عملی: میثاقِ مدینہ نے آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو قریش کے مظالم سے تحفظ دیا۔ مدینہ کے کسی قبیلے نے قریش کی مدد نہیں کی، جس سے مسلمانوں کو طاقت ملی۔ قریش کو مدینہ پر تین حملوں میں کوئی مقامی حمایت نہ ملی، جو مسلمانوں کی بڑی فتح تھی۔

7. قریش کو مقامی حمایت سے محروم کرنا: اگر میثاقِ مدینہ نہ ہوتا تو قریش کو مدینہ کے قبائل سے مالی اور افرادی مدد حاصل ہو سکتی تھی۔ قریش کو مکہ سے سامانِ جنگ لانا پڑا، جبکہ مسلمان اپنے ہی علاقے میں تھے، جس سے انھیں برتری حاصل رہی۔

8. خارجہ پالیسی کی کامیابی: قریبی قبائل سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا ایک دانشمندانہ حکمتِ عملی تھی۔ اس پالیسی سے امن قائم ہوا اور مدینہ کو بیرونی خطرات سے تحفظ ملا۔

9.ثالثی اور امن کا درس: میثاقِ مدینہ نے بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے ثالثی اور مذاکرات کی اہمیت اجاگر کی۔ امن اور استحکام کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے بنیادی شرط ہے۔ یہ معاہدہ اس بات کی بہترین مثال ہے کہ کس طرح سو سال سے جاری جنگوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

10. اسلامی ریاست کے سیاسی نظریے کی تشکیل: میثاقِ مدینہ کو مدینہ کی اسلامی ریاست کا پہلا آئین قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں انتظامی ڈھانچے، شہری حقوق، اور دفاعی پالیسیوں کا واضح تعین کیا گیا۔ یہ معاہدہ بین المذاہب مکالمے اور رواداری کی بنیاد بھی بنا۔

11. عربوں کے لیے ایک نیا سیاسی نظام: عرب پہلی بار ایک منظم ریاستی نظام سے متعارف ہوئے۔ ریاست کے اندرونی اور بیرونی معاملات کو منظم کرنے کا ایک مستقل طریقہ فراہم کیا گیا۔ یہ معاہدہ مذہبی رواداری کا عملی نمونہ تھا، جس سے دنیا آج بھی سبق لے سکتی ہے۔

12. میثاقِ مدینہ: ایک مثالی معاشرتی ماڈل: یہ معاہدہ تمام گروہوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ایک ایسی مثال ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ موجودہ مسلم ریاستوں کے لیے بھی اس میں سبق موجود ہے کہ کس طرح عدل، امن، اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اس سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ میثاقِ مدینہ صرف ایک معاہدہ نہیں تھا بلکہ ایک مکمل ریاستی ماڈل تھا، جس نے قانون، انصاف، اور بین المذاہب ہم آہنگی کی بنیاد رکھی۔ یہ آج بھی دنیا کے لیے ایک بہترین مثال ہے کہ کس طرح مختلف گروہوں کو متحد کر کے امن و استحکام قائم کیا جا سکتا ہے۔

***

اسلامی ریاست

رنگ و نسل سے بالاتر ایک نظریے کی بنیاد پر استوار

پچھلے صفحات میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عرب معاشرہ کسی مرکزی نظم و نسق کے تابع نہیں تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ ایک خود مختار اکائی تھا، اور ہر بڑے قبیلے کے اندر بھی بے شمار چھوٹے قبیلے موجود تھے۔ تاریخِ اسلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مدینہ میں پہلی بار ایک منظم ریاست کی بنیاد رکھی گئی، تو وہاں کے مختلف قبائل، بشمول یہودی، عیسائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے پیروکار، سب کو ایک نظام کے تحت یکجا کیا گیا۔ ریاست کے بہترین انتظام کے لیے میثاقِ مدینہ ترتیب دیا گیا، جو ایک تحریری دستور کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس معاہدے میں شہریوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا، لیکن یہ تفریق کسی فرد کے مذہب یا قبیلے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اسے ریاستِ مدینہ کا شہری تسلیم کرتے ہوئے کی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی معاشرتی نظام میں قبائلی شناخت سے بالاتر ہو کر ایک مشترکہ شہری تشخص دیا گیا۔

عرب کی سرزمین جہاں ہر قانون اور روایت قبیلے کے تابع تھی، وہاں پہلی مرتبہ ایک مرکزی حکومت کا قیام اہلِ عرب کے لیے ایک غیر معمولی تبدیلی تھی۔ یہ تصور ان کے لیے بالکل نیا اور حیران کن تھا، کیونکہ وہ صدیوں سے ایک آزاد قبائلی طرزِ زندگی کے عادی تھے۔ ایسے میں، نبی کریم ﷺ نے نہ صرف دشمن قبائل کو یکجا کیا بلکہ انھیں ایک نظریے کے تحت مربوط کر دیا، جو کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ یہ سب آپ ﷺ کی مدبرانہ قیادت، بہترین سفارت کاری اور حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا۔ اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نصرت و مدد شاملِ حال نہ ہوتی، تو یہ انقلاب برپا کرنا انسانی بس کی بات نہ تھی۔

قبیلے کی بجائے نظریہ معاشرے کی بنیادی اکائی بنا

جب اسلام کا پیغام پھیلا، تو پہلی بار عرب کے لوگ کسی قبیلے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ایک نظریے کی بنیاد پر متحد ہوئے، اور یہی اتحاد انھیں کامیابی کی منازل تک لے گیا۔ اس تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی تھی، جسے اس انداز سے مرتب کیا گیا کہ ہر قبیلہ یہ محسوس کرے کہ اس کی بقا اور ترقی کا راز ایک مضبوط مرکزی حکومت کے تحت شامل ہونے میں ہے۔

اس پالیسی کے چند اہم پہلو درج ذیل تھے:

قبائلی روایات کا احترام: آپ ﷺ نے اسلام سے متصادم نہ ہونے والی قبائلی روایات کو برقرار رکھا۔ اس سے قبائل کو یہ احساس ہوا کہ اسلامی حکومت میں شمولیت ان کی ثقافتی شناخت کے خاتمے کا سبب نہیں بنے گی۔

آزادی، عزت اور خودمختاری کا تحفظ: ریاستِ مدینہ میں شامل ہونے والے قبائل کی عزت و وقار کو یقینی بنایا گیا۔ انھیں زبردستی کسی پابندی میں جکڑنے کے بجائے سفارت کاری، امن اور صلح کے ذریعے قریب کیا گیا۔

مرکزی حکومت کو قبول کرنے کی راہ ہموار کی گئی: جو عرب پہلے کسی مرکزی طاقت کے ماتحت رہنے کے تصور سے بھی نابلد تھے، وہ رفتہ رفتہ نظریاتی وحدت کو قبول کرنے لگے، جو ان کی مستقبل کی کامیابی کی ضمانت بنی۔

اسلام رنگ و نسل سے بالاتر ایک نیا سماجی ڈھانچہ:

یہاں ایک اور اہم پہلو پر غور کرنا ضروری ہے کہ مسلمان کسی مخصوص قبیلے، نسل، زبان یا علاقے تک محدود نہ تھے۔ اسلام نے پہلی بار ایک عالمی برادری (امتِ مسلمہ) کا تصور دیا، جس کی بنیاد نسلی یا خاندانی برتری کے بجائے عقیدے اور تقویٰ پر رکھی گئی۔

یہ وہ انقلاب تھا جس نے عرب معاشرے کو بدل کر رکھ دیا۔ تاریخ میں پہلی بار، لوگ قبیلے کی شناخت سے بالاتر ہو کر ایک نظریاتی ریاست کا حصہ بنے۔ نبی کریم ﷺ اس امت کے سربراہ تھے، اور اس امت کی بنیادی خوبی یہی تھی کہ اس میں کسی کو مال و دولت یا نسب کی بنیاد پر فوقیت حاصل نہیں تھی، بلکہ برتری کا معیار صرف ایمان اور تقویٰ تھا۔

مدینہ اسلامی ریاست کا مضبوط مرکز

ریاستِ مدینہ کے قیام کے بعد، مسلمانوں کو پہلی بار ایک مضبوط مرکز ملا۔ اب اسلام قبول کرنے والوں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ دستیاب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا، اور ہجرت کا یہ سلسلہ فتحِ مکہ تک جاری رہا۔ مدینہ منورہ کا مستحکم نظام، جو آپ ﷺ کی عمدہ حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا، داخلی اور خارجی طور پر ریاست کو مضبوط کرتا چلا گیا۔

مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ:

مدینہ ایک اسلامی مرکز بننے کے بعد بڑی تعداد میں لوگ یہاں ہجرت کرنے لگے، جس سے ریاست مزید مستحکم ہوئی۔

فوجی طاقت میں اضافہ: مدینہ میں مسلمان مجتمع ہونے لگے، جس سے اسلامی ریاست کی دفاعی طاقت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ قبائل کے بارے میں معلومات:

دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے قبائل کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہونے لگیں، جس سے خارجہ پالیسی مزید بہتر بنانے میں مدد ملی۔ سفارت کاری کے مواقع:

مختلف قبائل سے تعلقات استوار کرنے اور انھیں اسلامی حکومت میں شامل کرنے کے لیے مؤثر سفارتی حکمتِ عملی اختیار کی گئی۔

اس کے بعد تاریخ یہ بتاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلوں کی بنیاد پر بٹے ہوئے معاشرے کو ایک نظریے پر متحد کیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی بار ایک مرکزی حکومت قائم ہوئی، جو رنگ و نسل سے بالاتر تھی۔ اس حکومت کا اصل محور عدل، تقویٰ، اور مساوات تھا، نہ کہ کسی قبیلے یا خاندانی برتری پر مبنی روایتی نظام۔ یہی وہ اصول تھے جن پر چل کر مسلمانوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی عظیم ترین تہذیب کی بنیاد رکھ دی۔ آج بھی، اگر ہم اسی نظریے پر عمل کریں، تو اسلامی معاشرہ دوبارہ ایک مضبوط اور متحد قوت بن سکتا ہے۔

میرے خیال میں آج بھی اگر کوئی قوم دنیا کی قیادت کے منصب پر بیٹھنا چاہتی ہے، اسے ان ہی اصولوں کو اپنانا ہوگا۔ صرف مال و دولت کی بنیاد پر قیادت کے فرائض سرانجام نہیں دیے جا سکتے۔

***

معاہدات اور قریش کے تجارتی راستے

مدینہ کا جغرافیہ دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ زیادہ تر معاہدے مغربی سمت میں ان قبائل سے کیے گئے جو سمندر کے قریب آباد تھے۔ یہ وہی علاقے تھے جہاں سے مکہ اور شام کے درمیان تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ بدر سے پہلے قریش مکہ کے تجارتی قافلے انھی راستوں سے گزرتے تھے۔ جب ابو سفیان کا قافلہ اس راستے پر تھا، تو آپ ﷺ اسے روک سکتے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر ابو سفیان نے قریش کو خبر دار کیا، جس کے نتیجے میں مشرکینِ مکہ کا لشکر بدر کے میدان میں آن پہنچا اور جنگِ بدر برپا ہوئی۔

معاہدات کی حکمت عملی اور اثرات

یہ معاہدے اس وقت کیے گئے جب نبی کریم ﷺ داخلی استحکام حاصل کر چکے تھے، یعنی میثاقِ مدینہ کے بعد۔ ان معاہدوں میں ان قبائل کو ترجیح دی گئی جو مکہ سے شام اور عراق جانے والے راستوں کے قریب آباد تھے۔ ان معاہدوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو ان علاقوں میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت ملی۔ قریشِ مکہ کو احساس ہوا کہ ان کے تجارتی راستے مسلمانوں کے زیرِ اثر آ رہے ہیں، جس سے وہ خوفزدہ ہو گئے۔ مدینہ کو مزید محفوظ بنانے اور اقتصادی لحاظ سے مستحکم کرنے میں مدد ملی۔

اہم قبائل جن سے معاہدے کیے گئے

بنی جہینہ ایک معروف عرب قبیلہ تھا جو مدینہ کے نواح میں آباد تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس قبیلے کے ساتھ امن و آشتی کا معاہدہ فرمایا۔ اسی طرح، بنی اشہل بھی ایک اہم عرب قبیلہ تھا جو مدینہ کے قریب سکونت پذیر تھا۔ آپ ﷺ نے ان

کے ساتھ بھی ایک معاہدہ کیا، جس کے تحت باہمی دوستانہ تعلقات اور قیامِ امن پر اتفاق کیا گیا۔

بنی عوف ان قبائل میں شامل تھا جن کے ساتھ آپ ﷺ نے باقاعدہ معاہدہ کیا، جس کے نتیجے میں اس قبیلے نے آپ ﷺ کی حمایت اور امن قائم رکھنے کا عہد کیا۔ اسی طرح، غزوۂ ابواء کے موقع پر آپ ﷺ نے قبیلہ بنو مررہ سے معاہدہ کیا، جبکہ غزوۂ العشیرہ کے دوران بنو مدلج کے ساتھ صلح کا معاہدہ طے پایا۔

ان کے علاوہ بھی کئی دیگر قبائل تھے جن کی جانب آپ ﷺ نے اپنے سفیروں کو بھیجا۔ بعض قبائل کے ساتھ براہ راست جنگ نہیں ہوئی، بلکہ یا تو ان سے صلح کی راہ ہموار ہوئی یا پھر انھیں یہ واضح پیغام مل گیا کہ اگر انھوں نے مشرکینِ مکہ کی حمایت کی تو انھیں مسلمانوں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ مدینہ کے ارد گرد کے قبائل کو بخوبی علم تھا کہ مکہ معظمہ کافی فاصلے پر واقع ہے، جبکہ مدینہ منورہ ان کے لیے زیادہ قریب اور محفوظ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے بیشتر قبائل نے آپ ﷺ کے ساتھ امن معاہدے کرنے کو ترجیح دی۔ ان تمام واقعات کی تفصیلات سیرت ابن ہشام، شبلی نعمانی کی سیرت النبی، الرحیق المختوم اور طبقات ابن سعد میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

یہاں میرا مقصد آپ ﷺ کی اس حکمتِ عملی کو اجاگر کرنا ہے جو آپ ﷺ نے میثاقِ مدینہ کے بعد مدینہ کے مضافاتی قبائل کے ساتھ اپنائی، تاکہ مسلمان مشرکینِ مکہ کے ظلم و ستم سے محفوظ رہ سکیں۔ میری نظر میں آپ ﷺ کی مدینہ میں ترتیب دی گئی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے نتیجے میں آٹھ اہم فوائد حاصل ہوئے، مگر اس سے قبل آپ ﷺ کی سفارتی حکمتِ عملی کے نمایاں نکات پر نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔

***

مدنی دور کے ابتدائی ماہ و سال
اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری

مدینہ میں بسنے والے انصار کی اکثریت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت پر قائم تھی، تاہم کئی قبائل نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف یہودی قبائل کھل کر اسلام کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایسے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میثاقِ مدینہ کے ذریعے ایک منظم ریاست کی بنیاد رکھی، جس کے سربراہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ اس معاہدے کی بدولت مدینہ میں داخلی استحکام پیدا ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہودیوں اور دیگر مخالف قبائل کی جانب سے کسی بڑی مزاحمت کا سامنا نہیں رہا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اصل چیلنج صرف مشرکینِ مکہ کی دشمنی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر قیادت مدینہ کے قریب قبائل سے سفارتی معاہدے

میثاقِ مدینہ کے بعد، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے آس پاس آباد مختلف قبائل کے ساتھ امن معاہدے کیے۔ یہ معاہدے نہ صرف فوجی نقطہ نظر سے اہم تھے بلکہ ان کے کئی معاشی اور سفارتی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ یہ معاہدے مدینہ کو ممکنہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے کیے گئے۔ ان قبائل کے ساتھ اچھے تعلقات کی وجہ سے، وہ کسی بھی حملے یا سازش کی پیشگی اطلاع دینے لگے، جو مدینہ کی دفاعی پوزیشن کو مزید مضبوط کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ مہاجرین میں سے کئی لوگ تجارت سے وابستہ تھے۔ قریبی قبائل کے ساتھ معاہدوں نے تجارتی راستے کھولے اور مدینہ کی معاشی ترقی میں مدد دی۔

چونکہ مکہ سے شام کی طرف جانے والے تجارتی قافلے انھی علاقوں سے گزرتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو تجارتی سرگرمیوں میں زیادہ مواقع ملنے لگے۔ان معاہدوں نے نبی کریم ﷺ کو مختلف قبائل کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار کرنے اور ایک وسیع خارجہ پالیسی مرتب کرنے کا موقع دیا۔ اس حکمتِ عملی کی تفصیلات ابن ہشام، شبلی نعمانی، الرحیق المختوم اور ابن سعد کی تحریروں میں تفصیل سے موجود ہیں۔

آپ ﷺ نے مدینہ کے گرد و نواح میں بسنے والے قبائل کے ساتھ جنگ کے بجائے صلح و مصالحت کی حکمتِ عملی اپنائی، جس کے نتیجے میں ان میں سے اکثر غیر جانبدار ہو گئے۔ یہی غیر جانبداری آپ ﷺ کے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہوئی، کیونکہ مشرکینِ مکہ کو کسی بیرونی حمایت کے بغیر تنہا کر دیا گیا۔اس کے نتیجے میں جو اہم فوائد حاصل ہوئے ان میں سے چند کا تذکرہ ضروری سمجھ کر بیان کیا جا رہا ہے۔

1. اہم تجارتی راستوں پر کنٹرول: میثاقِ مدینہ کے بعد، آپ ﷺ نے اپنی حکمتِ عملی کے تحت مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے امن معاہدے کیے، جس کا مشرکینِ مکہ کی معیشت پر فوری طور پر منفی اثر پڑا۔ مدینہ مکہ اور شام کے درمیان ایک اہم تجارتی گزرگاہ پر واقع تھا، اور بحرِ احمر کے قریب وہی راستے موجود تھے جہاں سے جزیرۃ العرب کے تجارتی قافلے شام تک جاتے تھے۔ یہی راستے مشرکینِ مکہ کے لیے بھی تجارتی لحاظ سے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب ان راستوں پر آباد قبائل سے آپ ﷺ نے مصالحت کر لی، تو گویا یہ علاقے آپ ﷺ کے زیرِ اثر آ گئے، اور مشرکینِ مکہ کے لیے ان راستوں پر محفوظ طریقے سے سفر کرنا مشکل ہو گیا۔

مشرکینِ مکہ کی معیشت کا زیادہ تر انحصار تجارت پر تھا۔ وہ گرمیوں میں شام اور سردیوں میں حبشہ کا سفر کرتے تھے، مگر ان کے لیے دونوں راستے یکساں اہم تھے۔ اب، جب شام جانے والی اہم تجارتی شاہراہ، جو مدینہ کی مغربی سمت سے گزرتی تھی، مسلمانوں کے کنٹرول میں آ گئی، تو مشرکینِ مکہ کو بڑا اقتصادی نقصان پہنچا۔ آپؐ نے

اپنے ساتھیوں کو ان علاقوں میں بھیجتا تاکہ وہاں ہونے والی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں غزوۂ بدر کا معرکہ پیش آیا، جو اسلام اور مشرکینِ مکہ کے درمیان پہلا فیصلہ کن معرکہ تھا۔

میں اسے آپ ﷺ کی بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک اہم فائدہ سمجھتا ہوں، کیونکہ اس حکمتِ عملی کی بدولت مشرکینِ مکہ کی تجارت کو ایک بڑا دھچکا لگا۔ اس کامیابی کو بلاشبہ مدینہ کی ریاست کے استحکام اور مسلمانوں کی عسکری برتری کی ایک بڑی پیش رفت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مدینہ کے ارد گرد قبائل کا غیر جانبدار ہونا: آپ ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ مکہ کے شمال میں حجاز و نجد غربی کے علاقوں میں بہت سے قبائل آباد ہیں جو مشرکین مکہ کے ہم خیال تھے اور مسلمانوں کے مخالف۔ آپ ﷺ نے ان میں سے اکثر کے ساتھ مصالحت کر لی تھی۔ جس کا دور رس فائدہ یہ ہوا ان میں سے اکثر لوگ فتح مکہ تک غیر جانب دار رہے۔ جب مشرکین مکہ نے مدینہ منورہ پر حملے کیے تو انھوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ جب مکہ معظمہ فتح ہوا تو یہ قبائل آپ ﷺ کے ساتھ مل گئے اسلامی ریاست کے وفادار بن گئے۔ ان کے غیر جانبدار رہنے سے بھی مشرکین مکہ کو نقصان ہوا۔

ایک مستحکم ریاست کا قیام: ہجرت کے بعد آپ ﷺ اور دیگر مہاجر مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت ایک محفوظ پناہ گاہ کی تھی۔ اس لحاظ سے مدینہ منورہ آپ ﷺ اور باقی لوگوں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ماحول بھی۔ اس سے آپ ﷺ کو اسلام کی تبلیغ کرنے میں بھی بے حد سہولت ہوئی۔

ایک متحد معاشرے کا قیام جو ایک نظریے پر قائم تھا: مدینہ منورہ میں یثاقِ مدینہ کے بعد ایک کثیر المذہبی ریاست قائم ہو گئی، جس میں اصل طاقت مسلمانوں کے پاس تھی۔ وہ افرادی اور فوجی قوت کے لحاظ سے سب سے اوپر تھے۔ کئی جہتیں رکھنے والے معاشرے میں بسنے والے مسلمانوں، یہودیوں اور دیگر قبائل سمیت ہر کسی کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا تھا۔ اس بندوبست نے اتحاد کی بنیاد رکھی اور اس سے ریاست کو ایک قانونی ڈھانچہ بھی میسر آیا۔

قبائل کا مشترکہ مقاصد کے لیے اتحاد: آپ ﷺ کی کوششوں سے مدینہ منورہ میں آباد مختلف قبائل پہلی بار کسی ایک شخص کو اپنا حاکم ماننے لگے۔ اس۔ طرح آپؐ نے اپنی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا بروئے کار لاتے ہوئے صدیوں سے ایک دوسرے کے جانی دشمن قبائل کو ایک صف میں لا کھڑا کیا۔ اس سے طرح سے قریب سو سال کی باہمی جنگ کے بعد مدینہ منورہ میں لوگ امن سے رہنے لگے۔ یہی امن اسلام کی ترویج کے لیے بے ضروری تھا۔

سیاسی اور فوجی پوزیشن کو مضبوط بنایا: یہ بات آپ ﷺ کو بہت خوب معلوم تھی کہ مشرکین مکہ کبھی نہ کبھی ضرور مدینہ منورہ پر حملہ کریں گے۔ ان کے مقابلے کے لیے ایک متحد اور قابلِ ذکر فوج کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی وجہ سے ایسی ایک فوج تیار ہوئی جس میں مہاجرین کے ساتھ ساتھ اوس اور خزرج بھی شامل تھے۔ یہود اور دیگر مقامی قبائل غیر جانبدار تھے۔ اس متحدہ دفاعی نظام کی وجہ سے مشرکین مکہ کا مقابلہ کیا گیا اور مشرکین مکہ کبھی بھی مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔

مدینہ منورہ کی دفاعی پوزیشن: آپ ﷺ نے مدینہ کے دفاعی جغرافیے کا بھی بے حد خوب صورت استعمال کیا۔ جنگِ خندق کے موقع پر آپ ﷺ نے شہر میں رہ کر مشرکین مکہ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت شہر کے تین اطراف میں موجود باغات

اور پہاڑیوں کی وجہ سے دشمن حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف ایک طرف ہی خندق کھودنی پڑی۔ اس طرح آپ ﷺ نے شہر کو بیرونی خطرات سے بچانے کے لیے ایک طرح کا بہترین دفاعی نظام قائم کیا۔

مشرکین مکہ اور ان کے تجارتی قافلے: آپ ﷺ نے یہ جان کر کہ مشرکین مکہ کے تجارتی قافلے مدینہ منورہ اور سمندر کے درمیان واقع راستوں سے گزریں گے۔ آپ ﷺ میثاقِ مدینہ کے بعد ان راستوں پر اپنے صحابہ اکرامؓ کو ٹولیوں کی شکل میں بھیجتے تھے۔ انھیں سرایا (سریہ کی جمع) کہا جاتا تھا۔ ان ٹولیوں کے مسلسل گشت کی وجہ سے مشرکین مکہ پر ایک مستقل خوف طاری ہو گیا۔

اقتصادی اور سماجی ترقی: آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں تجارت اور زراعت کی ترقی کے لیے کئی اقدامات کیے جس سے ایک طرف عام لوگوں کی مالی حالت اچھی ہوئی تو دوسری طرف اوس اور خزرج بھی یہودیوں کی مالی غلامی سے آزاد ہوئے۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں قائم امن کی فضاء سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، شہر کی معیشت کو نئی اسلامی حکومت کے تحت اسلام کے اصولوں کے مطابق پروان چڑھایا۔ اس کام کے لیے بازار قائم کیے گئے اور زرعی ترقی کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔

سماجی اور اصلاحی اقدامات: آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں آباد مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عام آدمی کی فلاح و بہبود کی خاطر کئی سماجی اصلاحات نافذ کیں۔ اس سے غربت کے خاتمے میں مدد ملی اور لوگوں کو انصاف بھی ملنے لگا۔ اس سے عام لوگوں کا ریاست پر اعتماد بڑھنے لگا۔

اسلام کی تبلیغ: جب مدینہ منورہ میں امن قائم ہو گیا تو آپ ﷺ نے اسلام کی ترویج کا کام شروع کیا۔ اس عرصے میں آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کے پڑوسی

قبائل اور علاقوں میں اپنے ایلچی اور مبلغ بھیجے۔اس سے اسلام کی دعوت مدینہ منورہ سے باہر جزیرۃ العرب کے دور دراز کے علاقوں تک پھیل گئی۔

سفارتی اور سیاسی تعلقات میں اضافہ: آپ ﷺ کی کوششوں سے مدینہ منورہ میں ایک مستحکم اور منظم اسلامی ریاست قائم ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی سیاسی قانونی حیثیت کو جزیرۃ العرب میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔اس سے آپ ﷺ کی ریاست کو دوسرے قبائل اور ریاستوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا اختیار حاصل ہوا۔

اوپر بیان کی گئی باتوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کے مدینہ منورہ آنے کے بعد جو فوائد حاصل ہوئے، اس میں سب سے اہم ایک مضبوط، متحد اور پائیدار اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ ساتھ ساتھ بے شمار سیاسی، عسکری، اقتصادی، سماجی اور مذہبی مفادات بھی حاصل ہوئے۔ اس کے بعد ہی جزیرہ نما عرب اور اس کے بعد میں اسلام کی دعوت پہنچی اور مسلمان دنیا کے ایک کامیاب لیڈر بننے میں کامیاب ہوئے۔

***

مکہ کے کفار کے ساتھ جنگیں اور نبی کریم ﷺ کی مدبرانہ حکمتِ عملی

فتحِ مکہ سے قبل مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان تین بڑی جنگیں ہوئیں۔ اگرچہ اس مقالے کا مقصد ان جنگوں کی تفصیلی تاریخ بیان کرنا نہیں، لیکن ان جنگوں کے دوران آپ ﷺ کی غیر معمولی حکمتِ عملی، سفارتی مہارت، اور خونریزی سے گریز کی پالیسی کو سمجھنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ انھی اصولوں پر چلتے ہوئے آپ ﷺ نے کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ جنگیں آپ ﷺ کی وسیع تر سفارتی حکمتِ عملی اور خارجہ پالیسی کا حصہ بھی تھیں۔ آپ ﷺ نے جنگ کو ہمیشہ آخری حل کے طور پر استعمال کیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ لوگوں کو جسمانی فتح کے بجائے روحانی طور پر جیتا جائے۔

سیرت کی بے شمار کتب میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ معروف اسلامی مؤرخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ میں ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کی جنگی حکمتِ عملی محض دشمن کو تباہ کرنا نہیں بلکہ اسے جنگ ترک کرنے اور مذاکرات پر مجبور کرنا تھی[53]۔ آپ ﷺ کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی کہ خونریزی سے بچتے ہوئے معاملات کو امن اور افہام و تفہیم کے ذریعے حل کیا جائے۔

اس مقالے کے اس حصے میں، میں چند اہم تاریخی واقعات پر روشنی ڈالوں گا تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ آپ ﷺ نے اپنی بہترین خارجہ پالیسی اور سفارتی مہارت کو بروئے کار لا کر کس طرح لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس مقصد کے لیے، میں مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی تین بڑی جنگوں—

---

[53] عہدِ نبوی کے میدان جنگ، محمد حمید اللہ، ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۲

جنگِ بدر، جنگِ اُحد، اور جنگِ خندق—کا جائزہ لوں گا، جو فتحِ مکہ سے پہلے کے اہم معرکے تھے۔ میری تحقیق اور مطالعے کے مطابق، ان جنگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمتِ عملی ہمیشہ امن کو ترجیح دینے پر مبنی رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھتے تھے کہ اللہ کی دعوت کو پھیلانے کے لیے پرامن ماحول سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

اس حصے میں، میں نہ صرف ان جنگوں کا تاریخی احوال بیان کروں گا بلکہ یہ بھی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا کہ کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفارت کاری اور دانشمندی کے ذریعے ان جنگوں میں حصہ لیا اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ دشمن کی بھی ممکنہ حد تک جانی و مالی نقصان سے حفاظت کی تدابیر اختیار کیں۔

جنگِ بدر: حق و باطل کا معرکہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگی حکمتِ عملی

یہاں جنگِ بدر کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ میں اس جنگ سے پہلے، دورانِ جنگ، اور بعد کے واقعات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمتِ عملی اور سفارتی بصیرت پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہترین سفارت کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیگر قبائل کے ساتھ اس انداز میں معاملات طے کیے کہ جنگِ بدر نے نہ صرف کفارِ مکہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا بلکہ عرب میں اسلام کی ترویج کے دروازے بھی کھول دیے۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں سے اسلام ایک طاقت بن کر ابھرا اور جزیرۃ العرب میں اس کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔

ہجرت کے پہلے ہی سال سے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے دفاع اور ممکنہ خطرات کی نگرانی کے لیے فوجی دستے بھیجنے کا آغاز کر دیا تھا۔ کئی معرکوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی شرکت فرمائی، جیسے غزوۂ سفوان، جسے غزوۂ بدر اولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا

تفصیلی ذکر سیرت ابنِ ہشام (جلد دوم) میں موجود ہے۔اسی دوران ایک اور اہم واقعہ پیش آیا جس کا ذکر تاریخ ابنِ کثیر میں بھی ملتا ہے[54]۔

یہ واقعہ قریش کی جانب سے مسلسل خطرات اور ان کی نگرانی کے سلسلے میں پیش آیا۔ مشرکینِ مکہ ہجرتِ مدینہ پر سخت برہم تھے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے، آپ ﷺ نے سن ۲ ہجری، ماہِ رجب میں حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی قیادت میں ایک جماعت کو وادیٔ نخلہ کی جانب روانہ کیا۔ آپ ﷺ نے روانگی سے قبل ان کے لیے سفر کی سمت متعین کی اور ایک سربمہر خط ان کے حوالے کیا۔ آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ یہ خط دو دن کے سفر کے بعد کھولا جائے۔ جب حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کے ساتھیوں نے خط کھولا، تو اس میں لکھا تھا کہ:

> طائف اور مکہ کے درمیان وادیٔ نخلہ میں قیام کرو، قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں اور حاصل شدہ معلومات ہمیں پہنچاؤ۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور سب نے اس خفیہ مہم پر عمل کرنے پر اتفاق کیا۔ چنانچہ یہ جماعت وادیٔ نخلہ کی جانب روانہ ہوئی۔ وادیٔ نخلہ میں، حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کے ساتھیوں کا سامنا قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہوا، جس کی قیادت عمرو بن الحضرمی کر رہا تھا۔ اس قافلے میں تین دیگر افراد بھی موجود تھے اور ان کے پاس کافی مقدار میں سامانِ تجارت تھا۔ یہ واقعہ ماہِ رجب میں پیش آیا، جو عرب میں حرمت کے مہینوں میں شمار ہوتا تھا، اور ان مہینوں میں جنگ و

---

[54] البدایہ و النہایہ، اردو ترجمہ: تاریخ ابنِ کثیر، مصنف عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضو بن کثیر قرشی دمشقی شافعی المعروف ابن کثیر، مترجم پروفیسر کوکب شادانی، جلد دوم صفحہ ۲۵۶، ناشر نفیس اکیڈیمی کراچی، ۱۹۸۷

جدل ممنوع تھا۔ صحابہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر یہ قافلہ حدودِ حرم میں داخل ہو گیا تو اس پر حملہ کرنا جائز نہ ہو گا، اور اگر اسے جانے دیا گیا تو شاید یہ فرار ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور قافلے کے ایک فرد کو قتل کر دیا، دو کو قیدی بنا لیا، جبکہ ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ اپنے ساتھیوں، مالِ غنیمت اور قیدیوں کو لے کر مدینہ واپس پہنچے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس پر آپ ﷺ کا ردِ عمل حکمت اور اصولوں پر مبنی تھا۔ جب آپ ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع ملی، تو آپ ﷺ نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: میں نے تمھیں حرمت والے مہینے میں جنگ کی اجازت نہیں دی تھی، بلکہ صرف قریش کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کا حکم دیا تھا۔

آپ ﷺ نے مالِ غنیمت لینے سے انکار کر دیا اور قیدیوں کے معاملے کو بھی فی الحال ملتوی کر دیا۔ دوسری جانب، مشرکینِ مکہ نے اس واقعے کو مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے حرمت والے مہینے میں جنگ کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اسی عرصے میں سورۃ بقرہ آیت ۲۱۷ اتری:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اِس میں لڑنا بہت برا ہے، مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر اُن کا بس چلے، تو تمھیں اِس دین سے پھرا لے جائیں (اور یہ خوب سمجھ لو کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا، اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔

اس آیتِ مبارکہ کی تشریح سید مودودی نے تفہیم القرآن میں کچھ اس طرح کی ہے؛

یہ بات ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ رجب سن ۲ ہجری میں نبی ﷺ نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ نَخلہ کی طرف بھیجا تھا (جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے) اور اس کو ہدایت فرمادی تھی کہ قریش کی نقل و حرکت اور ان کے آئندہ ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ جنگ کی کوئی اجازت آپ ﷺ نے نہیں دی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو راستے میں قریش کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ ملا اور اس پر انھوں نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں کو ان کے مال سمیت گرفتار کر کے مدینے لے آئے۔ یہ کارروائی ایسے وقت ہوئی، جب کہ رجب ختم

اور شعبان شروع ہو رہا تھا اور یہ امر مشتبہ تھا کہ آیا حملہ رجب (یعنی ماہ حرام) ہی میں ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن قریش نے، اور ان سے درپردہ ملے ہوئے یہودیوں اور منافقین مدینہ نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے اس واقعے کو خوب شہرت دی اور سخت اعتراضات شروع کر دیے کہ یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر اور حال یہ ہے کہ ماہ حرام تک میں خونریزی سے نہیں چوکتے۔ انھی اعتراضات کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ ماہ حرام میں لڑنا بڑی بری حرکت ہے، مگر اس پر اعتراض کرنا ان لوگوں کے منہ کو تو زیب نہیں دیتا، جنھوں نے تیرہ برس مسلسل اپنے سینکڑوں بھائیوں پر صرف اس لیے ظلم توڑے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے تھے، پھر ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ وہ جلا وطن ہونے پر مجبور ہو گئے، پھر اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور اپنے ان بھائیوں کے لیے مسجد حرام تک جانے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ حالانکہ مسجد حرام کسی کی مملوکہ جائداد نہیں ہے اور پچھلے دو ہزار برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کو اس کی زیارت سے روکا گیا ہو۔ اب جن ظالموں کا نامہ اعمال ان کرتوتوں سے سیاہ ہے، ان کا کیا منہ ہے کہ ایک معمولی سی سرحدی جھڑپ پر اس قدر زور شور کے اعتراضات کریں، حالانکہ اس جھڑپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ نبی کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اسلامی جماعت کے چند آدمیوں سے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کا ارتکاب ہو گیا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی معلوم رہنی چاہیے کہ جب یہ دستہ قیدی اور مال غنیمت لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو آپ ﷺ نے اسی وقت فرمادیا تھا کہ میں نے تم کو لڑنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔ نیز آپ نے ان کے لائے ہوئے مال غنیمت میں سے بیت المال کا حصہ لینے سے بھی انکار فرمادیا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ ان کی یہ فعل ناجائز تھا۔ عام مسلمانوں نے بھی اس فعل پر اپنے ان آدمیوں کو سخت ملامت کی تھی اور مدینہ میں کوئی ایسا نہ تھا، جس نے انھیں اس پر داد دی ہو۔

قیدیوں اور مالِ غنیمت کا فیصلہ: حکمت و بصیرت کی مثال

اس واقعے کے بعد، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی، جس کے بعد آپ ﷺ نے مالِ غنیمت اور قیدیوں کے معاملات کا فیصلہ کیا۔ اس کا تفصیلی ذکر سیرت ابنِ ہشام میں موجود ہے۔ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ اور اپنے لیے مخصوص کیا، جبکہ باقی چار حصے جنگ میں شریک مجاہدین میں تقسیم کر دیے۔ قیدیوں کے بدلے میں آپ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عتبہ بن غزوانؓ کو مشرکینِ مکہ سے آزاد کروایا۔

یہاں دو اہم نکات قابلِ غور ہیں جو ہمیں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور بصیرت سے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

1. معاشی حکمتِ عملی اور قریش کے تجارتی مفادات پر دباؤ: جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے، تو انھیں انتہائی سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاجرین کو بے سروسامانی کی حالت میں پناہ ملی، اور انصار نے بھرپور مدد کی، لیکن مدینہ جیسے محدود وسائل والے شہر میں ایک بڑی تعداد کی کفالت ایک چیلنج تھا۔ یہ بات مشرکینِ مکہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان معاشی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اسی دوران، قریش کے تجارتی

قافلے مدینہ کے قریب سے گزرتے ہوئے شام آتے جاتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان قافلوں کی نگرانی اور تعاقب کی حکمتِ عملی اپنائی، جس سے کفارِ مکہ کو یہ واضح پیغام ملا کہ اب مسلمان ایک ایسی جگہ آباد ہو چکے ہیں، جو قریش کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

یہ دراصل نفسیاتی برتری حاصل کرنے کی ایک بہترین حکمتِ عملی تھی، جس کے ذریعے قریش کو دفاعی پوزیشن میں لایا گیا اور ان کے تجارتی راستوں پر دباؤ ڈالا گیا۔ یہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کی غیر معمولی مہارت کا مظہر تھا، جس نے اسلام کے مستقبل کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

2. عرب روایات کا احترام اور سفارتی تدبر: آپ ﷺ کا ایک اور فیصلہ اس سے بھی زیادہ حکمت سے بھرپور تھا۔ آپ ﷺ نے وحی کے نزول سے پہلے مالِ غنیمت کو قبول نہیں کیا، حالانکہ عرب معاشرے میں جنگ کے بعد مالِ غنیمت لینا ایک عام روایت تھی۔ اس عمل سے یہ واضح ہوا کہ آپ ﷺ نے عرب روایات کے احترام کو نظرانداز نہیں کیا، بلکہ انھیں ایک سفارتی حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب قبائل کے دلوں میں آپ ﷺ کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ بعد میں جب اسلام کی دعوت پھیلائی گئی، تو لوگ اسے جلد قبول کرنے پر آمادہ ہوئے۔

یہ آپ ﷺ کی گہری سیاسی بصیرت اور معاشرتی نفسیات کی بہترین سمجھ کا ثبوت ہے۔ آپ ﷺ نے عرب معاشرت کے روایتی اصولوں کو اپناتے ہوئے اسلام کی قبولیت کی راہیں ہموار کیں۔

مشرکینِ مکہ کا پروپیگنڈا اور اس کا مؤثر جواب

مشرکینِ مکہ نے اس واقعے کو مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈا مہم میں تبدیل کر دیا اور یہ کہنے لگے کہ مسلمانوں نے حرمت والے مہینے میں جنگ کو حلال

کر لیا ہے۔ لیکن جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے حکم نازل ہوا، تو آپ ﷺ نے مالِ غنیمت قبول کیا اور قیدیوں کے تبادلے کا فیصلہ کیا۔

یہ حکمتِ عملی مشرکین کے پروپیگنڈے کو ناکام بنانے میں مؤثر ثابت ہوئی اور عام عرب قبائل پر اس کا مثبت اثر پڑا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی متاثر ہوئے، جو پہلے اسلام کے خلاف تھے۔ یہ واقعہ ۲ ہجری میں پیش آیا، اور اس کے صرف ایک ماہ بعد، رمضان المبارک میں جنگِ بدر کا معرکہ برپا ہوا۔ اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وادیٔ نخلہ کا واقعہ درحقیقت جنگِ بدر کے آغاز کا ایک بنیادی سبب بھی بنا۔

یہ تمام حالات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی حکمتِ عملی صرف عسکری میدان تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس میں معاشی دباؤ، نفسیاتی برتری، سفارتی بصیرت، اور سماجی روایات کا بہترین استعمال شامل تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ آپ ﷺ نے نہ صرف ایک بہترین قیادت کا مظاہرہ کیا بلکہ اسلام کے لیے ایک مضبوط بنیاد بھی فراہم کی۔

***

جنگ بدر: عوامل اور نتائج
آپؐ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی روشنی میں

نخلہ کے واقعے کے بعد ایک جنگی کیفیت پیدا ہو گئی اور کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی شدت اختیار کر چکی تھی۔ کفارِ مکہ کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ مسلمان مستقبل میں بھی ان کے تجارتی قافلوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر، آپ ﷺ نے کفارِ مکہ کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی تاکہ کسی بھی ممکنہ جوابی کارروائی کے لیے تیار رہا جا سکے۔

اسی دوران، آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک بڑا تجارتی قافلہ شام سے واپس آ رہا ہے، جس میں تقریباً ایک ہزار اونٹ شامل تھے اور اس کی سربراہی ابوسفیان کر رہا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر حضرت عروہ بن زبیرؓ اور سیرت ابنِ ہشام میں ملتا ہے۔ یہاں ہم اس واقعے کی تفصیلات میں جانے کے بجائے آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور سفارت کاری پر توجہ مرکوز کریں گے، جس کے ذریعے آپ ﷺ نے مشرکینِ مکہ کو ایک بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔

آپ ﷺ کی مدبرانہ قیادت اور مؤثر سفارت کاری کے سبب، قریش کو بیک وقت تین بڑے چیلنجز کا سامنا تھا:

1. اپنے قافلے کو بچانے کا مسئلہ
2. مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے طویل سفر کی دشواری
3. قریبی قبائل کی مدد حاصل کرنے میں ناکامی

قریش کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مدینہ کے آس پاس کوئی بھی قبیلہ ان کی

حمایت کے لیے تیار نہیں تھا، کیونکہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور سیاسی ساکھ نے قریش کی سفارتی کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا۔ نخلہ کے واقعے کے بعد، قریش کو اندازہ ہو چکا تھا کہ مسلمان کسی بھی وقت ان کے خلاف کوئی بڑا اقدام کر سکتے ہیں، جس کے باعث وہ دفاعی حکمتِ عملی ترتیب دینے میں مصروف تھے۔ ابو سفیان کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان ان کے قافلے کے قریب موجود ہیں، تو اس نے فوراً مکہ پیغام بھیجا اور کمک طلب کی۔ ابو جہل نے فوری ردعمل دیتے ہوئے ساڑھے نو سو افراد پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا اور مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس وقت آپ ﷺ بھی تجارتی قافلے کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کے سامنے دو راستے تھے:

1. تجارتی قافلے کو ہدف بنانا
2. مشرکین کے لشکر سے براہِ راست مقابلہ کرنا

آپ ﷺ نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور مشرکین کے لشکر کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ ﷺ کی قیادت میں جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مدینہ میں اس وقت مہاجرین اور انصار آباد تھے، جو سب مسلمان تھے۔ انصار نے عقبہ کی وادی میں یہ عہد کیا تھا کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ کرے گا تو وہ مہاجرین کے ساتھ مل کر مقابلہ کریں گے۔

لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ یہ جنگ مدینہ کے دفاع کے بجائے ایک پیشگی حملے کی نوعیت رکھتی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ انصار کی رائے معلوم کی جائے کہ آیا وہ اس جنگ میں شامل ہوں گے یا نہیں۔ اس موقع پر حضرت مقداد بن عمرؓ نے سورۃ المائدہ کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: ''ہم وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہی تھی، بلکہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ ہیں!''

اس کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ نے بھی انصار کی مکمل حمایت کا یقین دلایا، جس کے بعد آپ ﷺ نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم سے لشکر کے مقابلے کا حتمی فیصلہ کیا۔

جنگِ بدر کے دور رس اثرات میں اہم نکات کچھ اس طرح سے ہیں۔

1. اسلامی ریاست کو ایک عسکری اور سیاسی طاقت کے طور پر پہچان ملی۔ مدینہ کے قبائل میں مسلمانوں کی ساکھ مزید مضبوط ہو گئی۔
2. کفارِ مکہ کو اپنی کمزوری کا اندازہ ہوا، اور وہ مسلمانوں کے خلاف مزید انتقامی کارروائیوں کی تیاری کرنے لگے۔
3. جنگِ بدر نہ صرف اسلامی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی بلکہ اس نے آپ ﷺ کی سفارت کاری، جنگی حکمتِ عملی، اور سیاسی بصیرت کو بھی اجاگر کیا۔

اس کا ذکر سورۃ انفال میں بھی آیا ہے (آیات ۷۔۱۰):

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ۔ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ۔ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ۝ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اور وہ موقع یاد کرو جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔

یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لیے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔

جنگِ بدر کا فیصلہ اور اس کے دور رس اثرات

جنگِ بدر کا فیصلہ آپ ﷺ کی مدبرانہ حکمتِ عملی اور مدافعانہ حکمتِ عملی کا مظہر تھا۔اس جنگ سے چند اہم حقائق واضح ہوئے:

1. مسلمان کسی بھی چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں:

مشرکینِ مکہ نے ہمیشہ مسلمانوں کو کمزور سمجھا، لیکن آپ ﷺ کے اس جرات مندانہ فیصلے نے اہلِ عرب پر یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان کسی بھی مشکل سے گھبرانے والے نہیں ہیں۔ یہ جنگ عرب قبائل کے لیے مسلمانوں کی عسکری طاقت کا پہلا واضح مظاہرہ تھا، جس نے مستقبل کے معرکوں کے لیے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ مسلمان صرف مال و دولت کی خاطر جنگ نہیں کرتے۔آپ ﷺ نے قریش کے تجارتی قافلے پر حملہ کرنے کے بجائے مشرکین کے لشکر سے جنگ کا فیصلہ کیا، تاکہ عرب میں یہ غلط تاثر نہ پھیلے کہ مسلمان محض مالی فوائد کے لیے قافلے لوٹتے ہیں۔

اس حکمتِ عملی کا فائدہ یہ ہوا کہ مکہ کے عام لوگوں کو مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق اور عدل و انصاف کا یقین ہوا۔ تجارتی قافلے میں شامل تاجروں اور عام شہریوں نے بھی سکھ کا سانس لیا، کیونکہ ان کا سامان اور روزگار محفوظ رہا۔ یہاں سے ہمیں یہ اہم سبق ملتا ہے کہ ایک کامیاب خارجہ پالیسی ہمیشہ عام آدمی کے مفادات کو مد نظر رکھتی ہے۔ اگر کوئی ایسی پالیسی اپنائی جائے جو عوام کے لیے مشکلات پیدا کرے، تو اس سے دعوت کے پھیلاؤ میں رکاوٹ آسکتی ہے۔

2. جنگِ بدر میں عرب روایات کے مطابق جنگ سے قبل انفرادی مقابلوں کا انعقاد ہوا۔ مشرکینِ مکہ کی جانب سے عتبہ بن ربیعہ، اس کے بھائی شیبہ اور بیٹا ولید میدان میں اترے اور مسلمانوں کو مقابلے کی دعوت دی۔ مسلمانوں کی طرف سے تین انصاری صحابہؓ آگے بڑھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں واپس بلا لیا اور فرمایا کہ قریش کا مقابلہ قریش ہی کریں گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہ بن الحارثؓ کو میدان میں بھیجا، جنھوں نے تینوں مشرکین کو قتل کر دیا۔

اس سے عرب معاشرے میں ایک مثبت تاثر پیدا ہوا کہ اسلام ایک انصاف پسند دین ہے، جو ہر موقع پر اپنی روایات اور اصولوں کا خیال رکھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہی قبیلے کے افراد کو آگے کر کے یہ پیغام دیا کہ اسلام کسی بیرونی طاقت کا سہارا نہیں لیتا بلکہ اپنے اصولوں پر کھڑا ہے۔ انصار کی وفاداری مزید مضبوط ہو گئی کیونکہ انھیں یقین ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگ صرف اقتدار کے لیے نہیں بلکہ اعلیٰ مقصد کے لیے ہے۔ مشرکینِ مکہ پر نفسیاتی دباؤ بڑھا، کیونکہ ان کے نامور جنگجو مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

یہ ایک انتہائی دانشمندانہ سفارتی چال تھی، جس نے عرب قبائل کے دلوں میں اسلام کے وقار کو مزید بلند کر دیا۔

3. قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک: ایک مثالی خارجہ پالیسی:

جنگِ بدر میں فتح کے بعد آپ ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ عرب کی تاریخ میں ایک بے مثال واقعہ تھا۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ کے مطابق، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ:

چار افراد (عباس، عقیل، نوفل بن حارث اور ابو لبختری) کو قتل نہ کیا جائے بلکہ قیدی بنایا جائے۔

ابو لبختری نے قیدی ہونے کے بجائے لڑنے کو ترجیح دی، تو اسے قتل کر دیا گیا، جو ثابت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد لوگوں کو قتل کرنا نہیں، بلکہ انھیں راہِ راست پر لانا تھا۔ اس امید پر کہ وہ مستقبل میں اسلام قبول کر لیں گے۔ قیدیوں کے تبادلے سے کئی سفارتی فوائد حاصل کیے جا سکتے تھے۔ عرب میں اسلام کی شہرت میں اضافہ ہوا کہ مسلمان جنگ صرف فتح کے لیے نہیں، بلکہ اصلاح اور ہدایت کے لیے کر رہے ہیں۔ یہ حکمتِ عملی اتنی کامیاب رہی کہ چند سالوں میں اسلامی لشکر میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ جنگِ بدر میں صرف ۳۱۳ مسلمان تھے، جبکہ چند سال بعد جنگِ اُحد میں ان کی تعداد ۷۰۰ ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ آپ ﷺ کی حکمتِ عملی، سفارت کاری اور مدبرانہ قیادت کا نتیجہ تھا، جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

4. بنو ہاشم کے افراد کے لیے خصوصی رعایت

جنگِ بدر کے دوران آپ ﷺ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ قریش کے لشکر میں شامل بنو ہاشم کے افراد کو قتل نہ کیا جائے، کیونکہ وہ اس جنگ میں آنے پر مجبور کیے گئے تھے۔ یہ فیصلہ آپ ﷺ کی عدل و انصاف پر مبنی خارجہ پالیسی کا ایک اور مظہر تھا۔ یہ اقدام عرب میں آپ ﷺ کے انصاف اور رحم دلی کی شہرت کو مزید بڑھانے کا باعث بنا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ آپ ﷺ ذاتی دشمنی کے بجائے حق اور باطل کے فرق کو مدنظر رکھتے تھے۔

جنگ بدر سے حاصل ہونے والے اسباق میں چند درج ذیل ہیں۔

1. مسلمان دفاعی کے ساتھ ساتھ جارحانہ جنگی حکمتِ عملی اپنانے کے اہل ہیں۔

2. تجارت پر حملہ کرنے کے بجائے دشمن کے لشکر کا مقابلہ کرنا، آپ ﷺ کی دانشمندانہ سفارت کاری کو ظاہر کرتا ہے۔

3. جنگی اصولوں میں عدل و انصاف کا مظاہرہ کرنا، ایک کامیاب ریاست کے قیام کے لیے ضروری ہے۔

4. قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، مستقبل میں دعوت و تبلیغ کی راہ ہموار کرتا ہے۔

5. خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول عوامی مفادات کا تحفظ ہونا چاہیے، تاکہ دعوت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں۔

یہ تمام اسباق ہمیں آج بھی بہترین سفارتی، سیاسی، اور عسکری حکمتِ عملی اپنانے کی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کی جنگی اور سفارتی حکمتِ عملی آج کے دور کے لیے بھی ایک مکمل رہنما اصول ہے، جو دنیا میں ایک مضبوط اور منصفانہ ریاست کے قیام میں مدد دے سکتی ہے۔

جنگ بدر کے موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری

جنگ بدر سن ۲ ہجری میں پیش آئی، جو اسلام کی پہلی بڑی جنگ تھی۔ اس جنگ کے اسباب، تفصیلات اور نتائج کا مختصر ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ تاہم، اس جنگ کے موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا تفصیلی جائزہ لینا نہایت اہم ہے، کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ صرف ایک عسکری معرکہ نہیں، بلکہ ایک سیاسی اور سفارتی موڑ بھی تھا۔

1-سیاسی اتحاد اور معاہدے: یہ پہلی جنگ تھی جس میں آپ ﷺ نے براہِ راست قیادت فرمائی، لیکن اس سے پہلے آپ ﷺ نے مدینہ میں ایک مضبوط سیاسی بنیاد تیار کی۔ میثاقِ مدینہ کے ذریعے مدینہ کے تمام قبائل کو متحد کر کے ایک مستحکم ریاست کی بنیاد رکھی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کا نظام قائم کر کے مسلمانوں کے اندر اتحاد اور یگانگت کو فروغ دیا۔ مختلف عرب قبائل سے معاہدے کر کے مدینہ کی ریاستی حیثیت کو مزید مستحکم کیا تاکہ مشرکینِ مکہ کے خلاف مدافعت میں مدد ملے۔

2-معاشی دباؤ اور دفاعی حکمتِ عملی: قریش کے تجارتی قافلوں پر حملے کر کے مشرکینِ مکہ کی معاشی طاقت کو کمزور کیا۔ ان چھاپوں کے نتیجے میں مکہ کے سرداروں پر شدید نفسیاتی دباؤ پڑا، اور انھیں محسوس ہونے لگا کہ مدینہ میں مسلمانوں کی موجودگی ان کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس حکمتِ عملی نے مشرکینِ مکہ کو جنگ پر مجبور کیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو مزید طاقت ملی تو ان کی معیشت اور سیاسی اثر و رسوخ تباہ ہو جائے گا۔

3-جنگی حکمتِ عملی اور میدانِ بدر کا انتخاب: آپ ﷺ نے بدر کے مقام پر میدانِ جنگ خود منتخب کیا، جو ایک اسٹریٹیجک مقام تھا۔ بلند مقام پر قیام فرما کر دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھی اور اپنی فوج کے لیے دفاعی برتری حاصل کی۔

4-جذبہ، حوصلہ اور روحانی تیاری: آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے خطبات دیے، خوشخبریاں سنائیں اور اللہ سے مدد طلب کی۔

مسلمانوں کے اندر ایمانی قوت کو مضبوط کیا، جس نے انھیں قلیل تعداد کے باوجود جنگ میں فتح دلائی۔

5-عرب روایات کے مطابق انفرادی مقابلہ: مشرکین کی جانب سے عتبہ،

شیبہ اور ولید نے مبارزت (انفرادی مقابلے) کی دعوت دی۔ آپ ﷺ نے قریش کے مقابلے میں قریش کے افراد کو آگے کیا، یعنی حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ کو میدان میں بھیجا۔ یہ ایک زبردست نفسیاتی چال تھی، جس نے عرب قبائل کے اندر مسلمانوں کی عزت اور برتری کو مزید واضح کر دیا۔

1-جنگ کے بعد آپ ﷺ کی سفارتی حکمتِ عملی: قیدیوں کے ساتھ غیر معمولی حسنِ سلوک: آپ ﷺ نے قیدیوں کو قتل کرنے کے بجائے مختلف طریقوں سے آزاد کیا۔

کچھ قیدیوں کو احسان کے طور پر بغیر فدیے کے چھوڑ دیا۔ کچھ قیدی فدیہ (تاوان) دے کر رہا ہوئے۔ کچھ کو بچوں کو تعلیم دینے کے عوض آزاد کیا گیا۔ یہ ایک غیر معمولی سفارتی اقدام تھا، جس نے پورے عرب میں اسلام کی نرمی اور عدل و انصاف کی شہرت کو پھیلایا۔ مشرکینِ مکہ کے بہت سے لوگ مسلمانوں کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر بعد میں اسلام لے آئے۔

2-مدینہ کی ریاستی حیثیت کا مضبوط ہونا: جنگِ بدر کے بعد، اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک سیاسی قوت بن کر ابھرا۔ عرب میں مسلمانوں کو ایک طاقتور جماعت کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ مشرکینِ مکہ پر واضح ہو گیا کہ مسلمان مدینہ میں ایک مستحکم ریاست قائم کر چکے ہیں، جسے ختم کرنا آسان نہیں۔

3-جنگِ بدر: ایک سیاسی اور عسکری فتح: یہ جنگ محض ایک جنگ نہیں تھی، بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ آپ ﷺ نے جنگ سے گریز کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے بہادری کے ساتھ میدان میں اترنے کو ترجیح دی۔ اس جنگ میں ہر

سفارتی پہلو کو مد نظر رکھا گیا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی عسکری اور سیاسی فتح ممکن ہوئی۔

جنگ بدر سے سیکھے گئے چند اہم اسباق کچھ یوں ہیں؛

1- ایک کامیاب ریاست کے لیے اتحاد اور معاہدات ضروری ہوتے ہیں۔
2- دشمن کی معاشی طاقت کو کمزور کرنا، ایک مؤثر سفارتی حکمتِ عملی ہے۔
3- جنگ میں دفاعی حکمتِ عملی اور ذہانت سے کام لینا فتح کے لیے لازمی ہے۔
4- قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور سفارتی حکمتِ عملی لوگوں کو قریب لانے کا بہترین ذریعہ ہے۔
5- جنگ صرف فتح حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ سیاسی استحکام اور دعوت کے فروغ کے لیے بھی لڑی جاتی ہے۔

جنگِ بدر کے موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارتی مہارت نے یہ ثابت کیا کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں، بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جو امن، حکمت، اور سیاسی بصیرت پر مبنی ہے۔یہی حکمتِ عملی آج کے دور میں بھی قابلِ تقلید ہے، جو ایک کامیاب ریاست کی تشکیل اور سفارت کاری کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔

***

جنگِ اُحد: وجوہات، واقعات اور اس کے مضمرات

جنگِ بدر کے صرف ایک سال بعد جنگِ اُحد کا معرکہ پیش آیا۔ مدینہ منورہ کے شمال میں واقع اُحد پہاڑ کے دامن میں لڑی جانے کی وجہ سے اسے جنگِ اُحد کہا جاتا ہے۔ اس سے قبل، جنگِ بدر میں مشرکینِ مکہ کو ایک عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ قریش کے ستر سے زائد افراد مارے گئے تھے، اور ایک بڑی تعداد قیدی بنی تھی۔ اس جنگ میں مشرکین کو جانی اور مالی نقصان کے ساتھ ساتھ عرب میں ان کی سماجی اور معاشی حیثیت کو بھی زبردست دھچکا لگا تھا۔ یہ وہ زخم تھا جسے قریشِ مکہ فراموش نہ کر سکے۔

مشرکینِ مکہ نے اس شکست کا بدلہ لینے، اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے اور عرب میں اپنی سیاسی و معاشی برتری کو دوبارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگِ بدر میں شکست کے بعد قریش کی تجارتی سرگرمیاں متاثر ہو چکی تھیں، کیونکہ ان کے قافلے اب مسلمانوں کے خطرے سے دوچار ہو گئے تھے۔ قریشِ مکہ کا معاشی انحصار حج اور تجارتی راستوں پر تھا، جو مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس لیے، مشرکین نے نہ صرف بدلے کی آگ میں جنگ کی تیاری کی، بلکہ اپنی فوجی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا بھی ارادہ کیا، تاکہ خطے میں اپنی برتری کو دوبارہ ثابت کر سکیں۔

عرب میں انتقام لینا ایک قدیم روایت تھی، اور جنگِ اُحد کے جلد وقوع پذیر ہونے کی ایک بڑی وجہ یہی انتقامی جذبہ تھا۔ مشرکینِ مکہ نے اس جنگ کے لیے ہر ممکن حکمتِ عملی اپنائی۔ انھوں نے مدینہ پر براہِ راست حملے کا منصوبہ بنایا۔ متعدد حلیف قبائل کو اپنی حمایت میں شامل کیا۔ جنگ میں جوش و جذبہ بڑھانے کے لیے اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لائے۔

آپ ﷺ کو بھی اس بات کا مکمل اندازہ تھا کہ مشرکینِ مکہ اپنی شکست کو بھولنے والے نہیں، اور وہ ہر حال میں انتقام لینے کی کوشش کریں گے۔ اسی لیے، جنگِ بدر کے بعد آپ ﷺ نے مدینہ کا دفاع مضبوط کر دیا اور شہر کے حفاظتی نظام کو مزید مستحکم کیا۔ قرآنِ کریم میں بھی جنگِ اُحد کے حوالے سے کئی آیات نازل ہوئیں، جو اس جنگ کی اہمیت اور اس سے حاصل ہونے والے اسباق کو واضح کرتی ہیں۔

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّا ۢ بِغَمٍّ لِّـكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌ ۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (سورۃ آل عمران ۳: ۱۵۳)

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا، اور رسولؐ تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیے تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں:

جب مسلمانوں پر اچانک دو طرف سے بیک وقت حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی تو کچھ لوگ مدینہ کی طرف بھاگ نکلے اور کچھ اُحد پر چڑھ گئے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا، دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی، مگر اللہ کا رسول اس نازک موقع پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا

تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ!

جنگ اُحد بارے میں ایک حدیث (صحیح بخاری ۴۰۵۳) میں ملتی ہے۔

حدثنا عبيد الله بن موسى , عن إسرائيل , عن ابي إسحاق , عن البراء رضي الله عنه , قال: لقينا المشركين يومئذ واجلس النبي صلى الله عليه وسلم جيشا من الرماة وامر عليهم عبد الله وقال:

" لا تبرحوا إن رايتمونا ظهرنا عليهم فلا تبرحوا , وإن رايتموهم ظهروا علينا فلا تعينونا" , فلما لقينا هربوا حتى رايت النساء يشتددن في الجبل رفعن عن سوقهن قد بدت خلاخلهن فاخذوا يقولون: الغنيمة , الغنيمة , فقال عبد الله: عهد إلي النبي صلى الله عليه وسلم ان لا تبرحوا فابوا , فلما ابوا صرف وجوههم فاصيب سبعون قتيلا , واشرف ابو سفيان فقال: افي القوم محمد؟ فقال لا تجيبوه فقال:

افي القوم ابن ابي قحافة؟ قال: لا تجيبوه , فقال: افي القوم ابن الخطاب؟ فقال: إن هؤلاء قتلوا فلو كانوا احياء لاجابوا , فلم يملك عمر نفسه ,

فقال: كذبت يا عدو الله ابقى الله عليك ما يخزيك , قال ابو سفيان: اعل هبل , فقال النبي صلى الله عليه وسلم:

"اجيبوه", قالوا ما نقول؟ قال: "قولوا الله اعلى واجل", قال ابو سفيان: لنا العزى ولا عزى لكم, فقال النبي صلى الله عليه وسلم: "اجيبوه", قالوا: ما نقول؟

قال: "قولوا الله مولانا ولا مولى لكم", قال ابو سفيان: يوم بيوم بدر والحرب سجال وتجدون مثلة لم آمر بها ولم تسؤني.

ہم سے عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا، ان سے اسرائیل نے بیان کیا، ان سے ابن اسحاق (عمرو بن عبید اللہ سبیعی) نے اور ان سے براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جنگ احد کے موقع پر جب مشرکین سے مقابلے کے لیے پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازوں کا ایک دستہ عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہما کی ماتحتی میں (پہاڑی پر) مقرر فرمایا تھا اور انھیں یہ حکم دیا تھا کہ تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اس وقت بھی جب تم لوگ دیکھ لو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں پھر بھی یہاں سے نہ ہٹنا اور اس وقت بھی جب دیکھ لو کہ وہ ہم پر غالب آ گئے، تم لوگ ہماری مدد کے لیے نہ آنا۔ پھر جب ہماری مڈ بھیڑ کفار سے ہوئی تو ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی عورتیں پہاڑیوں پر بڑی تیزی کے ساتھ بھاگی جا رہی تھیں، پنڈلیوں سے اوپر کپڑے اٹھائے ہوئے، جس سے ان کے پازیب دکھائی دے رہے تھے۔ عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہما کے (تیر انداز) ساتھی کہنے لگے: غنیمت غنیمت۔ اس پر عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ اپنی جگہ سے نہ

ہٹنا (اس لیے تم لوگ مال غنیمت لوٹنے نہ جاؤ) لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس حکم عدولی کے نتیجے میں مسلمانوں کو ہار ہوئی اور ستر مسلمان شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ابوسفیان نے پہاڑی پر سے آواز دی، کیا تمہارے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی جواب نہ دے، پھر اس نے پوچھا، کیا تمہارے ساتھ ابن ابی قحافہ موجود ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب کی بھی ممانعت فرمادی۔ پھر اس نے پوچھا، کیا تمہارے ساتھ ابن خطاب موجود ہیں؟ اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ یہ سب قتل کر دیئے گئے۔ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ بے قابو ہو گئے اور فرمایا: اللہ کے دشمن تو جھوٹا ہے۔ اللہ نے ابھی انھیں تمہیں ذلیل کرنے لیے باقی رکھا ہے۔ ابوسفیان نے کہا: ہبل (ایک بت) بلند رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا جواب دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہم کیا جواب دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو، اللہ سب سے بلند اور بزرگ و برتر ہے۔ ابوسفیان نے کہا: ہمارے پاس عزیٰ (بت) ہے اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا جواب دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، کیا جواب دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو، اللہ ہمارا حامی اور مددگار ہے اور تمہارا کوئی حامی نہیں۔ ابوسفیان نے کہا، آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے اور لڑائی کی مثال ڈول کی ہوتی ہے۔ (کبھی

ہمارے ہاتھ میں اور کبھی تمہارے ہاتھ میں) تم اپنے مقتولین میں کچھ لاشوں کا مثلہ کیا ہوا پاؤ گے، میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا لیکن مجھے برا نہیں معلوم ہوا۔

اسی باب میں جنگِ اُحد بارے میں ایک اور صحیح بخاری (حدیث ۳۰۳۹) بھی ملتی ہے۔

حدثنا عمرو بن خالد، حدثنا زهير، حدثنا ابو إسحاق،

قال: سمعت البراء بن عازب رضى الله عنهما يحدث، قال: جعل النبى صلى الله عليه وسلم على الرجالة يوم احد وكانوا خمسين رجلا عبد الله بن جبير، فقال: إن رايتمونا تخطفنا الطير فلا تبرحوا مكانكم هذا حتى ارسل إليكم، وإن رايتمونا هزمنا القوم واوطاناهم فلا تبرحوا حتى ارسل إليكم فهزموهم، قال: فانا والله رايت النساء يشتددن قد بدت خلاخلهن واسوقهن رافعات ثيابهن، فقال: اصحاب عبد الله بن جبير الغنيمة اى قوم الغنيمة ظهر اصحابكم فما تنتظرون، فقال: عبد الله بن جبير انسيتم ما، قال: لكم رسول الله صلى الله عليه وسلم، قالوا: والله لناتين الناس فلنصيبن من الغنيمة فلما اتوهم صرفت وجوههم، فاقبلوا منهزمين فذاك إذ يدعوهم الرسول فى اخراهم، فلم يبق مع النبى صلى الله عليه وسلم غير اثنى عشر رجلا فاصابوا منا سبعين وكان النبى صلى الله عليه وسلم واصحابه اصاب من المشركين يوم بدر اربعين ومائة سبعين اسيرا وسبعين قتيلا، فقال ابو سفيان: افى القوم محمد ثلاث مرات فنهاهم النبى صلى الله عليه وسلم ان يجيبوه، ثم قال: افى القوم ابن ابى قحافة ثلاث مرات، ثم قال: افى القوم ابن الخطاب ثلاث مرات، ثم رجع إلى اصحابه، فقال: اما هؤلاء

فقد قتلوا فما ملك عمر نفسه، فقال: كذبت والله يا عدو الله إن الذين عددت لأحياء كلهم وقد بقي لك ما يسوءك، قال: يوم بيوم بدر والحرب سجال إنكم ستجدون في القوم مثلة لم آمر بها ولم تسؤني، ثم اخذ ير تجز اعل هبل اعل هبل، قال النبي صلى الله عليه وسلم: الا تجيبوا له، قالوا: يا رسول الله ما نقول، قال: قولوا الله اعلى واجل،

قال: إن لنا العزى ولا عزى لكم، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: الا تجيبوا له، قال: قالوا يا رسول الله ما نقول، قال: قولوا الله مولانا، ولا مولى لكم.

ہم سے عمرو بن خالد نے بیان کیا، کہا ہم سے زہیر نے بیان کیا، کہا ہم سے ابواسحاق نے بیان کیا، کہا کہ میں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے سنا، آپ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد کے موقع پر (تیر اندازوں کے) پچاس آدمیوں کا افسر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو بنایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تاکید کر دی تھی کہ اگر تم یہ بھی دیکھ لو کہ پرندے ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ پھر بھی اپنی جگہ سے مت ہٹنا، جب تک میں تم لوگوں کو کہلا نہ بھیجوں۔ اسی طرح اگر تم یہ دیکھو کہ کفار کو ہم نے شکست دے دی ہے اور انھیں پامال کر دیا ہے پھر بھی یہاں سے نہ ٹلنا، جب میں تمہیں خود بلا نہ بھیجوں۔ پھر اسلامی لشکر نے کفار کو شکست دے دی۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، کہ اللہ کی قسم! میں نے مشرک عورتوں کو دیکھا کہ تیزی کے ساتھ بھاگ رہی تھیں۔ ان کے پازیب اور پنڈلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور وہ اپنے

کپڑوں کو اٹھائے ہوئے تھیں۔ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے کہا: غنیمت لوٹو' اے قوم! غنیمت تمہارے سامنے ہے۔ تمہارے ساتھی غالب آ گئے ہیں۔ اب ڈر کس بات کا ہے۔ اس پر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ کیا جو ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی' تم اسے بھول گئے؟ لیکن وہ لوگ اسی پر اڑے رہے کہ دوسرے اصحاب کے ساتھ غنیمت جمع کرنے میں شریک رہیں گے۔ جب یہ لوگ (اکثریت) اپنی جگہ چھوڑ کر چلے آئے تو ان کے منہ کافروں نے پھیر دیے اور (مسلمانوں کو) شکست زدہ پا کر بھاگتے ہوئے آئے' یہی وہ گھڑی تھی جس کا ذکر سورۃ آل عمران میں ہے کہ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو پیچھے کھڑے ہوئے بلا رہے تھے''۔ اس سے یہی مراد ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ صحابہ کے سوا اور کوئی بھی باقی نہ رہ گیا تھا۔ آخر ہمارے ستر آدمی شہید ہو گئے۔ بدر کی لڑائی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے ساتھ مشرکین کے ایک سو چالیس آدمیوں کا نقصان کیا تھا' ستر ان میں سے قیدی تھے اور ستر مقتول' (جب جنگ ختم ہو گئی تو ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر) ابوسفیان نے کہا: کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے ساتھ موجود ہیں؟ تین مرتبہ انھوں نے یہی پوچھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے سے منع فرما دیا تھا۔ پھر انھوں نے پوچھا: کیا ابن ابی قحافہ (ابو بکر رضی اللہ عنہ) اپنی قوم میں موجود ہیں؟ یہ سوال بھی تین مرتبہ کیا' پھر پوچھا: ابن

خطاب (عمر رضی اللہ عنہ) اپنی قوم میں موجود ہیں؟ یہ بھی تین مرتبہ پوچھا، پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر کہنے لگا کہ یہ تینوں قتل ہو چکے ہیں اس پر عمر رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا اور آپ بول پڑے کہ اے اللہ کے دشمن! اللہ گواہ ہے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے جن کے تو نے ابھی نام لیے تھے وہ سب زندہ ہیں اور ابھی تیرا برا دن آنے والا ہے۔ ابوسفیان نے کہا اچھا! آج کا دن بدر کا بدلہ ہے۔ اور لڑائی بھی ایک ڈول کی طرح ہے (کبھی ادھر کبھی ادھر) تم لوگوں کو اپنی قوم کے بعض لوگ مثلہ کیے ہوئے ملیں گے۔ میں نے اس طرح کا کوئی حکم (اپنے آدمیوں کو) نہیں دیا تھا، لیکن مجھے ان کا یہ عمل برا بھی نہیں معلوم ہوا۔ اس کے بعد وہ فخریہ رجز پڑھنے لگا: ہبل (بت کا نام) بلند رہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ اس کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ہم اس کے جواب میں کیا کہیں یا رسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو کہ اللہ سب سے بلند اور سب سے بڑا بزرگ ہے۔ ابوسفیان نے کہا: ہمارا مددگار عزیٰ (بت) ہے اور تمہارا کوئی بھی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جواب کیوں نہیں دیتے، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کا جواب کیا دیا جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو کہ اللہ ہمارا حامی ہے اور تمہارا حامی کوئی نہیں۔

جنگِ اُحد سے قبل: پسِ منظر اور تیاری

جنگِ اُحد کی تفصیل بیان کرنا میرا مقصد نہیں، بلکہ میرا مطمحِ نظر اس موقع پر آپ ﷺ کی حکمتِ عملی پر روشنی ڈالنا ہے۔ تاہم، اس جنگ کے پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے، لہٰذا ایک مختصر احوال پیش کیا جا رہا ہے۔ جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کے درمیان اہم فرق یہ تھا کہ بدر میں قریش کی طاقت دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ابو سفیان تجارتی قافلے کی قیادت کر رہا تھا، جبکہ ابو جہل مشرکینِ مکہ کی جنگی فوج کا سپہ سالار تھا۔ لیکن جنگِ اُحد میں ایسا نہیں تھا۔ اس جنگ کے لیے قریش نے پورے ایک سال تک بھرپور تیاری کی اور ہر فرد کو اس میں شریک ہونے کا کہا۔ نتیجتاً، تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ایک طاقتور لشکر تیار ہوا، جس کی قیادت ابو سفیان کر رہا تھا۔ مشرکینِ مکہ اس جنگ کے لیے اپنے خاندانوں کو بھی ساتھ لے کر آئے۔ بے شمار خواتین کو بھی جنگی جوش و خروش بڑھانے کے لیے ساتھ رکھا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ مدینہ پر براہِ راست حملہ کیا جائے۔ بنی کنانہ اور اہلِ تہامہ جیسے کئی دیگر قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا گیا۔

ابنِ ہشام اپنی سیرت النبی ﷺ میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ مشرکینِ مکہ نے ابو سفیان کے تجارتی قافلے کا مال لوگوں کو واپس کر دیا، لیکن اس سے حاصل شدہ نفع کو جنگ کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس کے علاوہ، دیگر قبائل کو بھی مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے تیار کیا گیا۔

آپ ﷺ کی پیشگی حکمتِ عملی اور مدینہ کے دفاع کی تیاری

جنگِ بدر کے بعد سے آپ ﷺ کو مشرکینِ مکہ کی سرگرمیوں کا مکمل ادراک تھا۔ جیسے ہی آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ مشرکین مدینہ پر چڑھائی کے ارادے سے آ رہے ہیں، آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔

جنگ کی حکمتِ عملی پر دو مختلف آراء سامنے آئیں۔ کچھ صحابہؓ کا خیال تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر دفاعی جنگ لڑی جائے، تاکہ دشمن کو شہر میں داخل ہونے کا موقع نہ ملے۔ کچھ صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ شہر سے باہر نکل کر میدانِ جنگ میں مشرکین کا سامنا کیا جائے۔ آخر کار، آپ ﷺ نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ جنگ مدینہ کے باہر میدانِ اُحد میں لڑی جائے گی۔

آپ ﷺ ایک ہزار صحابہؓ کے ساتھ میدانِ اُحد کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ میں نماز اور دیگر انتظامات کے لیے حضرت ابنِ اُمِ مکتومؓ کو مقرر کیا۔ جب بعض صحابہ نے جنگ کی حکمتِ عملی بدلنے کی تجویز دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: نبی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ہتھیار پہن لے اور پھر انھیں اتار دے۔ یہ الفاظ آپ ﷺ کے پختہ عزم کو ظاہر کرتے ہیں، جس سے یقینی طور پر صحابہؓ کے حوصلے بھی بلند ہوئے۔ ابھی لشکر راستے میں تھا کہ منافقوں کا سردار عبداللہ بن اُبی تین سو ساتھیوں سمیت یہ کہہ کر واپس لوٹ گیا کہ میری بات نہیں مانی گئی، اس لیے میں جنگ میں شریک نہیں ہوں گا۔ اس کے بعد، آپ ﷺ کے ساتھ صرف سات سو صحابہؓ رہ گئے، جبکہ مشرکینِ مکہ کا لشکر تین ہزار پر مشتمل تھا، یعنی ہر مسلمان کے مقابلے میں چار سے زائد دشمن تھے۔ اس کے علاوہ، مشرکینِ مکہ کے پاس جنگی ساز و سامان بھی مسلمانوں کی نسبت کہیں زیادہ تھا۔

یہاں ایک اور اہم پہلو قابلِ غور ہے کہ صرف ایک سال پہلے، جنگِ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی۔ لیکن محض ایک سال کے قلیل عرصے میں، صحابہؓ کی تعداد دوگنا سے بھی زیادہ ہو گئی۔ یہ سب آپ ﷺ کی کامیاب تبلیغ اور اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا۔ ممکن ہے کہ مشرکینِ مکہ کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا ہو کہ اگر انھوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے میں مزید تاخیر کی، تو مسلمانوں کی تعداد اور زیادہ ہو جائے گی۔

جنگِ اُحد: حکمتِ عملی، واقعات، اور نتائج

جب آپ ﷺ کوہِ اُحد پر پہنچے تو اُحد کی وادی میں قیام فرمایا، اس طرح مسلمانوں کی پشت پر پہاڑ تھا۔اس موقع پر آپ ﷺ نے واضح حکم دیا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں، کوئی جنگ میں پہل نہ کرے۔ مشرکینِ مکہ نے اپنے جانور انصار کے کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیے، جس سے انصار بے حد مشتعل ہو گئے۔ آپ ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ درہ اُحد پر متعین فرمایا اور حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو ان کا امیر مقرر کیا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، درہ خالی نہ کرنا، کیونکہ دشمن اسی راستے سے حملہ کر سکتا ہے۔اس دن لشکرِ اسلام کا جھنڈا حضرت مصعب بن عمیرؓ کے سپرد کیا گیا۔خود آپ ﷺ نے دو زرہیں زیبِ تن فرمائیں، جو جنگ کے لیے آپ ﷺ کے عزم کو ظاہر کرتا تھا۔

مسلمانوں نے بہادری سے لڑائی کا آغاز کیا اور مشرکین پر غلبہ پانے لگے۔ حضرت حمزہؓ، ابو دجانہؓ اور دیگر صحابہؓ نے شجاعت کی بے مثال داستانیں رقم کیں۔ جنگ کے دوران وحشی نامی حبشی غلام نے ایک نیزہ پھینک کر حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا، جس سے مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان ثابت قدم رہے اور مشرکینِ مکہ پسپا ہو کر میدانِ جنگ چھوڑنے لگے۔

جب مشرکین کو شکست نظر آئی تو وہ بھاگنے لگے، جسے دیکھ کر درہ اُحد پر متعین تیر اندازوں نے سمجھا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور مالِ غنیمت جمع کرنے کے لیے میدان میں آ گئے۔یہی وہ غلطی تھی جس کا مشرکین کو انتظار تھا۔ خالد بن ولید نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور درے کے راستے مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ جو مشرکین بھاگ رہے تھے، وہ بھی واپس آ گئے، اور اس طرح

مسلمانوں کو دو اطراف سے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں میں افراتفری اور بے نظمی پیدا ہو گئی، اور جنگ کا پلڑا مشرکین کی طرف جھکنے لگا۔

اسی دوران ایک پتھر آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر لگا، جس سے آپ ﷺ کا نچلا ہونٹ زخمی ہوا اور ایک دانت بھی شہید ہو گیا۔ جنگ کا کوئی واضح فیصلہ نہیں ہوا، لیکن مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا، اور مشرکین مدینہ پر حملہ کیے بغیر واپس چلے گئے۔ آپ ﷺ اپنے زخمی صحابہؓ کے ساتھ مدینہ واپس تشریف لے آئے، شہداء کی تدفین کی گئی، اور زخمیوں کے علاج کا آغاز ہوا۔

حمراءالاسد: آپ ﷺ کی حکمتِ عملی

مشرکینِ مکہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کا زبردست نقصان ہوا ہے اور وہ اب دوبارہ جنگ کے قابل نہیں رہے۔ لیکن آپ ﷺ نے دشمن کو غلط ثابت کرنے کے لیے فوری حکمتِ عملی اختیار کی۔ آپ ﷺ نے اگلے ہی دن اپنے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ مسلمان لشکر مدینہ سے آٹھ میل دور حمراءالاسد کے مقام پر تین دن تک قیام پذیر رہا۔ یہ واضح پیغام تھا کہ ہم شکست خوردہ نہیں، بلکہ اب بھی جنگ کے لیے تیار ہیں۔

اسی دوران، معبد خزاعی نامی شخص، جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا، آپ ﷺ کے لشکر کے پاس آیا اور تعزیت کے کلمات کہے۔ بعد میں وہ ابوسفیان کے لشکر سے ملا اور بتایا کہ محمد ﷺ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ تمہاری تلاش میں نکلے ہیں، وہ شدید غضبناک ہیں اور تم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر ابوسفیان سخت گھبرا گیا اور بنی عبدالقیس کے سواروں کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا تاکہ دھمکی دے سکے کہ ہم واپس آ رہے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: حسبنا اللہ ونعم الوکیل

(اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) صفوان بن اُمیہ نے بھی ابوسفیان کو مشورہ دیا کہ وہ مدینہ پر حملے کا ارادہ ترک کر دے، جس پر وہ واپس مکہ روانہ ہو گیا۔

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے ۷۰ صحابہؓ شہید ہوئے، جن میں حضرت حمزہؓ کی شہادت سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ مشرکینِ مکہ کے ۲۲ افراد قتل ہوئے، لیکن وہ مدینہ پر حملہ کرنے میں ناکام رہے۔ آپ ﷺ کی جنگ کے اگلے روز دشمن کے تعاقب کی حکمتِ عملی نے مشرکین کو یہ احساس دلا دیا کہ مسلمان اب بھی مضبوط ہیں اور مزید جنگ کے لیے تیار ہیں۔ یہ جنگ مشرکین کے لیے مکمل فتح نہ بن سکی، کیونکہ وہ مسلمانوں کی قوت اور استقامت سے خوفزدہ ہو کر دوبارہ مدینہ پر حملہ نہ کر سکے۔

جنگِ اُحد میں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی

جنگِ اُحد کے واقعے کا ایک مختصر ذکر پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ اس جنگ میں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی کے چند اہم پہلو، جن میں ہمارے لیے ایک واضح رہنمائی موجود ہے، درج ذیل ہیں:

1- آپ ﷺ کو اس بات کا مکمل ادراک تھا کہ مشرکینِ مکہ جنگِ بدر کی شکست کے بعد آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ آپ ﷺ عرب کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے کہ عرب ہر حالت میں انتقام لیتے ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ کو پہلے سے معلوم تھا کہ مشرکینِ مکہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے بھی اس کے مقابلے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جب مشرکینِ مکہ کے لشکر کی خبر پہنچی، تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا، جس سے مشورے کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

2- جب مشرکینِ مکہ کے لشکر کی خبر ملی، تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک نہایت مشکل وقت تھا۔ اس بار مشرکین کے لشکر کی تعداد بھی کئی گنا زیادہ تھی، کئی

قبائل بھی ان کے ساتھ تھے، اور ان کی تیاری بھی مکمل تھی۔ وہ انتقام کے جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔ جیسے ہی یہ خبر مدینہ منورہ پہنچی، آپ ﷺ نے صحابہؓ کو مشورے کے لیے بلایا۔ سیرت ابن ہشام کے مطابق، آپ ﷺ کی رائے تھی کہ مسلمان مدینہ منورہ میں ہی رہیں۔ اگر مشرکینِ مکہ کا لشکر آیا بھی تو وہ مدینہ سے باہر ہی رہے گا، اور اگر وہ اندر داخل ہو بھی گئے، تو ہم انھیں آسانی سے ختم کر دیں گے۔ اس طرح ہم خود جنگ میں نہیں جائیں گے۔ تاہم، کچھ لوگوں نے باہر جا کر جنگ لڑنے کی رائے دی، اور آپ ﷺ نے ان کی رائے کو قبول فرمایا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ ﷺ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرستادہ تھے، آپ ﷺ نے جنگی حکمتِ عملی میں اپنے ساتھیوں کی تجویز کو اختیار فرمایا، جو قیادت میں مشاورت کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

3- آپ ﷺ نے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو جنگی نقطۂ نظر سے بے حد مفید تھی۔ آپ ﷺ نے اپنی فوج کو احد پہاڑ کے ساتھ رکھا تاکہ پشت پر قدرتی دفاعی حصار موجود رہے اور دشمن کو پیچھے سے حملہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ یہ آپ ﷺ کی بہترین جنگی حکمتِ عملی تھی۔

4- آپ ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کو ایک چھوٹی پہاڑی پر تعینات کیا تاکہ عقب کی حفاظت کی جا سکے اور دشمن کو مسلم فوج کو گھیرنے سے روکا جا سکے۔ یہ ایک بہترین دفاعی حکمتِ عملی تھی، لیکن بعد میں اسی مقام پر ہونے والی کوتاہی نے جنگ کا رخ بدل دیا۔

5- مسلمانوں کی فوج نے ابتدا میں قریش کی فوج کو پیچھے دھکیل کر کامیابی حاصل کی۔ یہ ابتدائی کامیابی آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور مسلم افواج کے نظم و

ضبط کی تاثیر کا ثبوت تھی، حالانکہ مشرکینِ مکہ کی فوج تعداد میں مسلمانوں سے چار گنا زیادہ تھی۔

6- کچھ مسلمان سپاہیوں نے جنگ کو جیتی ہوئی سمجھ کر آپ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی اور پسپائی اختیار کرنے والی قریش کی فوج کا تعاقب کیا۔ اس طرح ایک اہم دفاعی حصار ختم ہو گیا، اور خالد بن ولید کی قیادت میں قریش کے گھڑ سوار دستوں نے اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور پیچھے سے حملہ کر دیا۔ دوسری طرف قریش کی فوج نے دوبارہ منظم ہو کر مسلمانوں پر زوردار حملہ کیا، جس سے مسلمانوں کی صفوں میں افراتفری مچ گئی اور ایک جیتی ہوئی جنگ ہاتھ سے نکل گئی۔ اس موقع پر ہمیں آپ ﷺ کی بہادری اور حکمتِ عملی کا ایک بہترین نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ بہت سے صحابہؓ میدان چھوڑ چکے تھے، لیکن آپ ﷺ نے میدان نہیں چھوڑا، بلکہ ایک اونچی جگہ پر موجود رہے اور صحابہؓ کو دوبارہ اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ باوجود اس کے کہ آپ ﷺ زخمی ہو چکے تھے، آپ ﷺ نے ہمت نہیں ہاری۔ ابتدائی دھچکے کے باوجود، آپؐ اور باقی صحابہؓ احد کی ڈھلوان پر دوبارہ منظم ہونے میں کامیاب ہوئے اور ایک محفوظ مقام تک پہنچ گئے۔

7- جنگِ اُحد نے مسلمانوں میں نظم و ضبط کی اہمیت، احکامات کی پابندی اور حکمتِ عملی میں صبر کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس جنگ سے مسلمانوں کو یہ سیکھنے کو ملا کہ نقصان کے باوجود، کس طرح اپنی پوزیشن کو مستحکم کیا جا سکتا ہے اور حوصلہ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے فوجی حکمتِ عملی کے قیمتی سبق حاصل کیے اور ساتھ ہی اخلاقی اور روحانی تربیت بھی حاصل کی، جن میں اتحاد، نظم و ضبط، اور ایمان کی اہمیت نمایاں ہیں۔

8- یہ سب جان کر کہا جا سکتا کہ جنگِ اُحد کے دوران پیغمبرِ اسلام ﷺ کی حکمتِ عملی میں ایک محتاط مقام کا انتخاب، علاقے کا مؤثر استعمال اور اپنی فوجوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے انھیں واضح ہدایات دینا شامل تھا۔ جنگ اُحد نے مسلمانوں میں بہترین نظم وضبط کی اہمیت کو مزید اجاگر کیا۔

9- جنگ کے بعد ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ جنگ کسی واضح جیت یا ہار کے بغیر ختم ہوئی۔ جنگ میں کئی صحابہؓ شہید ہو چکے تھے، ان کا غم بھی موجود تھا، کئی صحابہؓ زخمی بھی تھے، اور ایک مشکل صورت حال در پیش تھی۔ لیکن جنگ کے اگلے ہی روز آپ ﷺ نے اسی لشکر کے ساتھ، جو جنگِ اُحد میں شریک تھا، مدینہ سے باہر نکل کر مشرکین کے لشکر کا تعاقب کیا اور تین دن تک ایک مقام پر قیام فرمایا۔ اگر آپ ﷺ ایسا نہ کرتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ مشرکین دوبارہ حملہ آور ہوتے (اس بات کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے)۔ لیکن جب ابو سفیان کو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ ایک عارضی نقصان کے باوجود جنگ کے لیے تیار ہیں اور اس بار اپنے شہداء کا انتقام لینے کے لیے پر عزم ہیں، تو اس نے پلٹ کر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ آپ ﷺ کی بہترین حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا۔

10- اس جنگ میں ہمیں آپ ﷺ کی ایک بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی جھلک بھی نظر آتی ہے، جس میں ہمارے لیے بے حد رہنمائی موجود ہے۔ جب آپ ﷺ مدینہ سے لشکر لے کر نکلے، تو عبداللہ بن اُبی بھی ساتھ تھا، جو بظاہر مسلمان ہو چکا تھا اور اپنے تین سو ساتھیوں سمیت اسلامی لشکر میں شامل تھا۔ یہ مسلمانوں کی فوج کا تقریباً ایک تہائی حصہ تھا۔ لیکن اس نے میدانِ جنگ میں آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ نے اس سے کوئی بات نہ کی اور نہ ہی اسے واپس آنے کے لیے کہا۔ جنگ کے

بعد بھی اس سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کسی منافق سے بحث کرنا یا اس سے مدد کا کہنا بے فائدہ ہے۔ جس نے جانا ہوتا ہے، وہ چلا ہی جاتا ہے۔ یہ بہتر ہی ہوا کہ وہ جنگ سے پہلے ہی علیحدہ ہو گیا، تاکہ باقی لشکر میں صرف وہی لوگ رہ جائیں جو ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفادار تھے اور ہر مشکل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔

***

معرکہ اُحد سے معرکہ ٔخندق تک: ایک تاریخی جائزہ

جنگ اُحد کا واقعہ تین ہجری میں پیش آیا، جبکہ جنگ ِخندق شوال پانچ ہجری میں لڑی گئی۔ ان دو سالوں کے دوران کئی اہم واقعات رونما ہوئے، جو اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کی سیاسی و عسکری حکمت عملی کے لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس عرصے میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری غیر معمولی حکمتِ عملی کی عکاس تھی۔ انھی تدابیر کی بدولت جنگ ِخندق میں مشرکینِ مکہ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اور پھر تین سال بعد، آٹھ ہجری میں، مکہ معظمہ فتح ہوگیا۔ ان واقعات کا مختصر تذکرہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ ان مشکل حالات میں آپ ﷺ نے کس طرح بہترین حکمت عملی ترتیب دی، جو بالآخر اسلام کی فتح و کامیابی کا سبب بنی۔

واقعہ ٔرجیع: ایک غم ناک حادثہ اور مشرکینِ مکہ کا ناقابل ِبیان انتقام

سیرت النبی ﷺ ابن ہشام کے مطابق، بنی عضل اور بنی قارہ کے چند لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارے علاقے میں کچھ صحابہؓ کو بھیج دیا جائے جو ہمیں دین کی تعلیم دیں۔ آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے چھ صحابہؓ کو ان کے ساتھ روانہ کیا۔

تاہم، صحیح بخاری اور سنن ابی داؤد میں یہ ذکر ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے دس صحابہؓ کو مشرکینِ مکہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ بعد میں پیش آنے والے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں روایات کا ماحصل ایک ہی ہے، کیونکہ دونوں میں صحابہؓ کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کا ذکر یکساں طور پر موجود ہے۔

اس واقعے کی تفصیلات ابن ہشام کی سیرت النبی، جلد دوم، صفحات ۲۴۵ سے ۲۵۰ تک بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں، صحیح بخاری (۴۰۸۶) کی درج ذیل احادیث سے بھی اس واقعے کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

(مرفوع) حدثني إبراهيم بن موسى, اخبرنا هشام بن يوسف, عن معمر, عن الزهري, عن عمرو بن ابي سفيان الثقفي, عن ابي هريرة رضي الله عنه, قال:" بعث النبي صلى الله عليه وسلم سرية عينا وامر عليهم عاصم بن ثابت وهو جد عاصم بن عمر بن الخطاب فانطلقوا حتى إذا كان بين عسفان ومكة ذكروا الحي من هذيل يقال لهم بنو لحيان, فتبعوهم بقريب من مائة رام, فاقتصوا آثارهم حتى اتوا منزلا نزلوه فوجدوا فيه نوى تمر تزودوه من المدينة, فقالوا: هذا تمر يثرب فتبعوا آثارهم حتى لحقوهم, فلما انتهى عاصم واصحابه لجئوا إلى فدفد, وجاء القوم فاحاطوا بهم, فقالوا: لكم العهد والميثاق إن نزلتم إلينا ان لا نقتل منكم رجلا, فقال عاصم: اما انا فلا انزل في ذمة كافر, اللهم اخبر عنا نبيك فقاتلوهم حتى قتلوا عاصما في سبعة نفر بالنبل وبقي خبيب وزيد ورجل آخر فاعطوهم العهد والميثاق, فلما اعطوهم العهد والميثاق نزلوا إليهم, فلما استمكنوا منهم حلوا اوتار قسيهم فربطوهم بها, فقال الرجل الثالث الذي معهما: هذا اول الغدر, فابى ان يصحبهم فجرروه وعالجوه على ان يصحبهم فلم يفعل فقتلوه, وانطلقوا بخبيب وزيد حتى باعوهما بمكة فاشترى خبيبا بنو الحارث بن عامر بن نوفل وكان خبيب هو قتل الحارث يوم بدر, فمكث عندهم اسيرا حتى إذا اجمعوا قتله استعار موسى من بعض بنات الحارث ليستحد بها, فاعارته, قالت: فغفلت عن صبي لي فدرج إليه حتى اتاه فوضعه على فخذه, فلما رايته فزعت فزعة عرف ذاك

منى وفي يده الموسى, فقال: اتخشين ان اقتله ما كنت لافعل ذاك إن شاء الله, وكانت تقول: ما رايت اسيرا قط خيرا من خبيب لقد رايته ياكل من قطف عنب وما بمكة يومئذ ثمرة وإنه لموثق في الحديد, وما كان إلا رزق رزقه الله, فخرجوا به من الحرم ليقتلوه, فقال: دعوني اصلي ركعتين, ثم انصرف إليهم, فقال: لولا ان تروا ان ما بي جزع من الموت لزدت, فكان اول من سن الركعتين عند القتل هو, ثم قال: اللهم احصهم عددا, ثم قال: ما ابالي حين اقتل مسلما على اي شق كان لله مصرعي وذلك في ذات الإله وإن يشا يبارك على اوصال شلو ممزع ثم قام إليه عقبة بن الحارث فقتله, وبعثت قريش إلى عاصم ليؤتوا بشيء من جسده يعرفونه, وكان عاصم قتل عظيما من عظمائهم يوم بدر, فبعث الله عليه مثل الظلة من الدبر فحمته من رسلهم فلم يقدروا منه على شيء۔

مجھ سے ابراہیم بن موسیٰ نے بیان کیا، کہا ہم کو ہشام بن یوسف نے خبر دی، انھیں معمر بن راشد نے، انھیں زہری نے، انھیں عمرو بن ابی سفیان ثقفی نے اور ان سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاسوسی کے لیے ایک جماعت (مکہ، قریش کی خبر لانے کے لیے) بھیجی اور اس کا امیر عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بنایا، جو عاصم بن عمر بن خطاب کے نانا ہیں۔ یہ جماعت روانہ ہوئی اور جب عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچی تو قبیلہ ہذیل کے ایک قبیلے کو جسے بنو لحیان کہا جاتا تھا، ان کا علم ہو گیا اور قبیلے کے تقریباً سو تیر اندازوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کے نشانات قدم کو تلاش کرتے ہوئے چلے۔ آخر ایک ایسی جگہ پہنچنے میں

کامیاب ہو گئے جہاں صحابہ کی اس جماعت نے پڑاؤ کیا تھا۔ وہاں اُن کھجوروں کی گٹھلیاں ملیں جو صحابہ مدینہ سے لائے تھے۔ قبیلہ والوں نے کہا کہ یہ تو یثرب کی کھجور (کی گھٹلی) ہے اب انھوں نے پھر تلاش شروع کی اور صحابہ کو پالیا۔ عاصم رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو صحابہ کی اس جماعت نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر پناہ لی۔ قبیلے والوں نے وہاں پہنچ کر ٹیلے کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور صحابہ سے کہا کہ ہم تمھیں یقین دلاتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ اگر تم نے ہتھیار ڈال دیے تو ہم تم میں سے کسی کو بھی قتل نہیں کریں گے۔ اس پر عاصم رضی اللہ عنہ بولے کہ میں تو کسی کافر کی حفاظت وامن میں خود کو کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتا۔ اے اللہ! ہمارے ساتھ پیش آنے والے حالات کی خبر اپنے نبی کو پہنچادے۔ چنانچہ ان صحابہ نے ان سے قتال کیا اور عاصم اپنے سات ساتھیوں کے ساتھ ان کے تیروں سے شہید ہو گئے۔ خبیب، زید اور ایک اور صحابی ان کے حملوں سے ابھی محفوظ تھے۔ قبیلے والوں نے پھر حفاظت وامان کا یقین دلایا۔ یہ حضرات ان کی یقین دہانی پر اتر آئے۔ پھر جب قبیلے والوں نے انھیں پوری طرح اپنے قبضے میں لے لیا تو ان کی کمانوں کی تانت اتار کر ان صحابہ کو انھیں سے باندھ دیا۔ تیسرے صحابی جو خبیب اور زید کے ساتھ تھے، انھوں نے کہا کہ یہ تمہاری پہلی غداری ہے۔ انھوں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ پہلے تو قبیلے والوں نے انھیں گھسیٹا اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے زور لگاتے رہے لیکن

جب وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے تو انھیں وہیں قتل کر دیا اور خبیب اور زید کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ پھر انھیں مکہ میں لا کر بیچ دیا۔ خبیب رضی اللہ عنہ کو تو حارث بن عامر بن نوفل کے بیٹوں نے خرید لیا کیونکہ خبیب رضی اللہ عنہ نے بدر کی جنگ میں حارث کو قتل کیا تھا۔ وہ ان کے یہاں کچھ دنوں تک قیدی کی حیثیت سے رہے۔ جس وقت ان سب کا خبیب رضی اللہ عنہ کے قتل پر اتفاق ہو چکا تو اتفاق سے انھیں دنوں حارث کی ایک لڑکی (زینب) سے انھوں نے موئے زیر ناف صاف کرنے کے لیے استرا مانگا اور انھوں نے ان کو استرا بھی دے دیا تھا۔ انھی کا بیان تھا کہ میرا لڑکا میری غفلت میں خبیب رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے اسے اپنی ران پر بٹھا لیا۔ میں نے جو اسے اس حالت میں دیکھا تو بہت گھبرائی۔ انھوں نے میری گھبراہٹ کو جان لیا، استرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا، کیا تمھیں اس کا خطرہ ہے کہ میں اس بچے کو قتل کر دوں گا؟ ان شاءاللہ میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ ان کا بیان تھا کہ خبیب رضی اللہ عنہ سے بہتر قیدی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انھیں انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا حالانکہ اس وقت مکہ میں کسی طرح کا پھل موجود نہیں تھا جبکہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے بھی تھے، تو وہ اللہ کی بھیجی ہوئی روزی تھی۔ پھر حارث کے بیٹے قتل کرنے کے لیے انھیں لے کر حرم کی حدود سے باہر گئے۔ خبیب رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دو (انھوں نے اجازت دے دی اور)

جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو ان سے فرمایا کہ اگر تم یہ خیال نہ کرنے لگتے کہ میں موت سے گھبرا گیا ہوں تو لمبی نماز پڑھتا۔ خبیب رضی اللہ عنہ ہی وہ پہلے شخص ہیں جن سے قتل سے پہلے دو رکعت نماز کا طریقہ چلا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان کے لیے بددعا کی، اے اللہ! انھیں ایک ایک کر کے ہلاک کر دے اور یہ اشعار پڑھے ''جب کہ میں مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ کس پہلو پر اللہ کی راہ میں مجھے قتل کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ اللہ کی راہ میں ہے اور اگر وہ چاہے گا تو جسم کے ایک ایک کٹے ہوئے ٹکڑے میں برکت دے گا۔'' پھر عقبہ بن حارث نے کھڑے ہو کر انھیں شہید کر دیا اور قریش نے عاصم رضی اللہ عنہ کی لاش کے لیے آدمی بھیجے تاکہ ان کے جسم کا کوئی بھی حصہ لائیں جس سے انھیں پہچانا جا سکے۔ عاصم رضی اللہ عنہ نے قریش کے ایک بہت بڑے سردار کو بدر کی لڑائی میں قتل کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے بھڑوں کی ایک فوج کو بادل کی طرح ان کے اوپر بھیجا اور ان بھڑوں نے ان کی لاش کو قریش کے آدمیوں سے محفوظ رکھا اور قریش کے بھیجے ہوئے یہ لوگ (ان کے پاس نہ پھٹک سکے) کچھ نہ کر سکے۔

بئر معونہ کا ایک دردناک واقعہ

ابھی رجیع کے واقعے کا غم تازہ تھا کہ بئر معونہ کا ایک دلفگار واقعہ پیش آتا ہے۔ اس بارے میں کئی احادیث ملتی ہے۔ درجِ ذیل حدیث سے اس واقعے بارے میں جاننے کو کافی کچھ ملتا ہے۔ (صحیح بخاری حدیث ۲۸۰۱)

حدثنا حفص بن عمر الحوضي، حدثنا همام، عن إسحاق، عن انس رضي الله عنه، قال: بعث النبي صلى الله عليه وسلم اقواما من بني سليم إلى بني عامر في سبعين، فلما قدموا، قال: لهم خالي اتقدمكم فإن امنوني حتى ابلغهم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، وإلا كنتم مني قريبا فتقدم فامنوه فبينما يحدثهم عن النبي صلى الله عليه وسلم إذ اومئوا إلى رجل منهم فطعنه فانفذه، فقال: الله اكبر فزت ورب الكعبة ثم مالوا على بقية اصحابه، فقتلوهم إلا رجلا اعرج صعد الجبل، قال همام: فاراه آخر معه، فاخبر جبريل عليه السلام النبي صلى الله عليه وسلم انهم قد لقوا ربهم فرضي عنهم وارضاهم، فكنا نقرا ان بلغوا قومنا ان قد لقينا ربنا فرضي عنا وارضانا، ثم نسخ بعد فدعا عليهم اربعين صباحا على رعل وذكوان، وبني لحيان، وبني عصية الذين عصوا الله ورسوله صلى الله عليه وسلم.

ہم سے حفص بن عمر حوضی نے بیان کیا، کہا ہم سے ہمام نے ان سے اسحاق نے اور ان سے انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سلیم کے (70) ستر آدمی (جو قاری تھے) بنو عامر کے یہاں بھیجے۔ جب یہ سب حضرات (بئر معونہ پر) پہنچے تو میرے ماموں حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ نے کہا میں (بنو سلیم کے یہاں) آگے جاتا ہوں اگر مجھے انھوں نے اس بات کا امن دے دیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ان تک پہنچاؤں تو۔ بہتر ورنہ تم لوگ میرے قریب تو ہو ہی۔ چنانچہ وہ ان کے یہاں گئے اور انھوں نے امن بھی دے دیا۔ ابھی وہ قبیلہ کے

لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنا ہی رہے تھے کہ قبیلے والوں نے اپنے ایک آدمی (عامر بن طفیل) کو اشارہ کیا اور اس نے آپؓ کے جسم پر برچھا پیوست کر دیا جو آر پار ہو گیا۔ اس وقت ان کی زبان سے نکلا اللہ اکبر میں کامیاب ہو گیا کعبہ کے رب کی قسم! اس کے بعد قبیلے والے حرام رضی اللہ عنہ کے دوسرے ساتھیوں کی طرف (جو ستر کی تعداد میں تھے) بڑھے اور سب کو قتل کر دیا۔ البتہ ایک صاحب جو لنگڑے تھے' پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ہمام (راوی حدیث) نے بیان کیا میں سمجھتا ہوں کہ ایک اور ان کے ساتھ (پہاڑ پر چڑھے تھے) (عمرو بن امیہ ضمری) اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ آپ کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے جا ملے ہیں پس اللہ خود بھی ان سے خوش ہے اور انھیں بھی خوش کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم (قرآن کی دوسری آیتوں کے ساتھ یہ آیت بھی) پڑھتے تھے (ترجمہ) ہماری قوم کے لوگوں کو یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم اپنے رب سے آملے ہیں' پس ہمارا رب خود بھی خوش ہے اور ہمیں بھی خوش کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ آیت منسوخ ہو گئی' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس دن تک صبح کی نماز میں قبیلہ رعل' ذکوان' بنی لحیان اور بنی عصیہ کے لیے بددعا کی تھی جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تھی۔

اس واقعے کی تفصیلات سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں تفصیل سے مذکور ہیں، اور حضرت عروہ بن زبیرؒ کی کتاب مغازی رسول اللہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔اس واقعے سے جُڑا ایک اور اہم واقعہ بھی سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں بیان کیا گیا ہے۔

اس موقع پر حضرت عمرو بن اُمیہؓ زندہ بچ گئے تھے، لیکن کفار نے انھیں قیدی بنا لیا۔ایک مشرک، عامر بن طفیل، نے اپنی ماں کی نذر پوری کرنے کی خاطر ان کی پیشانی کے بال کاٹ کر انھیں آزاد کر دیا۔ حضرت عمرو بن اُمیہؓ واپسی کے سفر پر تھے کہ راستے میں انھیں بنی عامر کے دو افراد ملے، جنھیں آپ نے نیند کی حالت میں قتل کر دیا۔انھیں علم نہیں تھا کہ بنی عامر سے پہلے ہی نبی ﷺ صلح کر چکے تھے۔

جب حضرت عمرو بن اُمیہؓ نے اس واقعے کی اطلاع آپ ﷺ کو دی تو آپؐ نے فرمایا کہ ان دونوں افراد کے قتل کا خون بہا (دیت) ادا کرنا لازم ہے، کیونکہ ان کا قتل ناحق تھا۔ میثاقِ مدینہ کے مطابق خون بہا مدینہ منورہ میں بسنے والے تمام افراد کی مشترکہ ذمہ داری تھا۔اسی معاہدے کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے تاکہ خون بہا کی ادائیگی کے لیے ان سے مدد حاصل کریں۔

جب آپ ﷺ بنی نضیر کے ہاں تشریف فرما تھے، تو یہودیوں نے (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کے قتل کی سازش کی۔ جس دیوار کے قریب آپ ﷺ تشریف رکھتے تھے، اس کے اوپر سے ایک بھاری پتھر گرانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ حضرت جبرائیلؑ نے آپ ﷺ کو اس سازش کی اطلاع دی، جس پر آپ ﷺ فوراً وہاں سے اٹھ کر مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس واقعے سے آگاہ کیا اور بنی نضیر کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کر دی۔جب آپ ﷺ اپنے لشکر کے ساتھ بنی نضیر کے علاقے میں پہنچے، تو انھوں نے قلعہ بند ہو کر مزاحمت کی۔ محاصرہ کئی روز

تک جاری رہا، یہاں تک کہ بنی نضیر نے ہار مانتے ہوئے صلح کا پیغام بھیجا، جسے آپ ﷺ نے قبول فرمالیا۔

صلح کی شرائط کے مطابق، بنی نضیر کے افراد جتنا ساز و سامان اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے، لے کر مدینہ سے نکل گئے اور جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں میں جا بسے۔

سیرت النبی ﷺ ابن ہشام کے مطابق، بنی نضیر کے دو افراد نے اسلام قبول کر لیا، اور آپ ﷺ نے ان کا مال ان کے پاس ہی رہنے دیا۔

اس طرح، ایک اندوہناک واقعہ اپنے انجام کو پہنچا، اور مسلمانوں کے لیے ایک اور تاریخی سبق چھوڑ گیا۔

قرآن مجید سورۃ الحشر (آیت نمبر ۲) میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ۔

وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے، اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اُن کی گڑھیاں انھیں اللہ سے بچا لیں گی۔ مگر اللہ ایسے رُخ سے اُن پر آیا جدھر اُن کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اُس نے اُن کے دلوں میں رُعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے۔ پس

عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!

اس آیت کی تشریح سید مودودی نے کچھ اس طرح کی ہے؛

اس مقام پر ایک بات آغاز ہی میں سمجھ لینی چاہیے تاکہ بنی نضیر کے اخراج کے معاملے میں کوئی ذہنی الجھن پیدا نہ ہو۔ نبی ﷺ سے بنی نضیر کا باقاعدہ تحریری معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کو انھوں نے رد نہیں کیا تھا کہ معاہدہ ختم ہو جاتا۔ لیکن جس وجہ سے ان پر چڑھائی کی گئی وہ یہ تھی کہ انھوں نے بہت سی چھوٹی بڑی خلاف ورزیاں کرنے کے بعد آخر کار ایک صریح فعل ایسا کیا تھا جو نقض عہد کا ہم معنی تھا۔ وہ یہ کہ انھوں نے دوسرے فریق معاہدہ، یعنی مدینہ کی اسلامی ریاست کے صدر کو قتل کرنے کی سازش کی تھی کہ جب ان کو نقض معاہدہ کا الزام دیا گیا تو وہ اس کا انکار نہ کر سکے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کو دس دن کا نوٹس دے دیا کہ اس مدت میں مدینہ چھوڑ کر نکل جاؤ، ورنہ تمہارے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہ نوٹس قرآن مجید کے اس حکم کے ٹھیک مطابق تھا کہ اگر تم کو کسی قوم سے خیانت (بد عہدی) کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو۔ (انفال۔۵۸)۔ اسی لیے ان کے اخراج کو اللہ تعالیٰ اپنا فعل قرار دے رہا ہے، کیونکہ یہ ٹھیک قانون الہیٰ کے مطابق تھا۔ گویا ان کو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے نہیں بلکہ اللہ نے نکالا۔ دوسری وجہ جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اخراج کو اپنا فعل قرار دیا ہے۔ اسی سورۃ کی آگے کی آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔ اس ارشاد کو

سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ بنی نضیر صدیوں سے یہاں جمے ہوئے تھے۔ مدینہ کے باہر ان کی پوری آبادی یکجا تھی جس میں ان کے اپنے قبیلے کے سوا کوئی دوسرا عنصر موجود نہ تھا۔ انھوں نے پوری بستی کو قلعہ بند کر رکھا تھا، اور ان کے مکانات بھی گڑھیوں کی شکل میں بنے ہوئے تھے جس طرح عموماً قبائلی علاقوں میں، جہاں ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہو، بنائے جاتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی اس وقت کے مسلمانوں سے کچھ کم نہ تھی۔ اور خود مدینہ کے اندر بہت سے منافقین ان کی پشت پر تھے۔

اس لیے مسلمانوں کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہ لوگ لڑے بغیر صرف محاصرے ہی سے بدحواس ہو کر یوں اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ اسی طرح خود بنی نضیر کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کوئی طاقت ان سے چھ دن کے اندر یہ جگہ چھڑا لے گی۔ اگرچہ بنی قینقاع ان سے پہلے نکالے جا چکے تھے اور اپنی شجاعت پر ان کا سارا زعم دھرا کا دھرے رہ گیا تھا، لیکن وہ مدینہ کے ایک محلے میں آباد تھے اور ان کی اپنی کوئی الگ قلعہ بند بستی نہ تھی، اس لیے بنی نضیر یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مسلمانوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکنا بعید از قیاس نہ تھا۔ بخلاف اس کے وہ اپنی محفوظ بستی اور اپنی مضبوط گڑھیوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی انھیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جانے کا نوٹس دیا تو انھوں نے بڑے دھڑلے کے ساتھ جواب دے دیا کہ ہم نہیں نکلیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لیجیے۔

جنگ احد اور جنگ خندق کے درمیانی عرصے آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری

جنگ احد کے بعد غزوہ ذات الرقاع، بدر کے مقام پر آپ ﷺ کا ابو سفیان کا انتظار، اور غزوہ دومتہ الجندل جیسے تین اہم واقعات پیش آتے ہیں۔ پھر ۵ ہجری میں جنگِ خندق کا معرکہ برپا ہوتا ہے۔ جنگِ اُحد کے بعد دو نہایت ہی افسوسناک واقعات پیش آئے، جن کے دوران آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کی حکمت عملی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ میں نے جو کچھ سمجھا، وہ درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے:

1- واقعہ رَجیع اور واقعہ بِئرِ مَعُونہ اسلامی تاریخ کے نہایت المناک اور دل دہلا دینے والے واقعات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سانحات پر آپ ﷺ نے شدید رنج و غم کا اظہار فرمایا، جس کا ثبوت ہمیں کئی دنوں تک نماز میں کفار کے خلاف بددعا کرنے سے بھی ملتا ہے۔

2- ان مشکل لمحات میں آپ ﷺ نے بے حد صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ یہ ہم سب کے لیے سبق ہے کہ ایسے مواقع پر جلد بازی کے بجائے صبر اور اللہ پر بھروسہ رکھنا ہی بہترین حکمت عملی ہے۔

3- اس دوران، آپ ﷺ نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں یقین دلایا کہ شہادت کا درجہ بہت بلند ہے۔ ساتھ ہی آپ ﷺ نے اس عزم کا اظہار کیا کہ شہداء کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور ان کی قربانیاں اسلامی مشن کے لیے انتہائی اہم ہیں۔

4- انھی حالات کے پیشِ نظر، آپ ﷺ نے عسکری حکمت عملی پر از سرِ نو غور فرمایا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ آئندہ کسی بھی مہم یا کارروائی میں صحابہ کرامؓ کی حفاظت اولین ترجیح ہو۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے دفاع اور اسلامی ریاست کے استحکام کے لیے مزید اقدامات کیے، جس سے اسلامی تاریخ میں صبر، استقامت اور حکمت عملی کی اہمیت اجاگر ہوئی۔

5- جب ایک صحابیؓ سے نادانستہ طور پر ایک ایسے قبیلے کے فرد کا قتل ہو گیا جس کے ساتھ آپ ﷺ کا صلح کا معاہدہ تھا، تو آپ ﷺ نے فوری طور پر اس کے خون بہا کی ادائیگی کی ذمہ داری لی۔ اسی مقصد کے تحت آپ ﷺ بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ اس فیصلے سے جزیرۃ العرب میں صدیوں سے رائج قبائلی روایات کے احترام کا ثبوت ملتا ہے، جس سے یقینی طور پر اہلِ عرب کی نظر میں آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا اثر مزید گہرا ہوا ہو گا۔

6- بنی نضیر کی جلاوطنی اس دور کا سب سے اہم واقعہ تھا۔ آپ ﷺ ان سے ایک معاہدے میں تھے، لیکن جب انھوں نے آپ ﷺ کے قتل (نعوذ باللہ) کی سازش کی، تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ برتی۔ تاہم، ان پر حملہ کرنے سے پہلے انھیں مدینہ منورہ چھوڑنے کا موقع دیا۔ یہودیوں کی یہ پہلی خلاف ورزی نہیں تھی؛ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر چکے تھے، جو ناقابل معافی تھیں۔ اس مرتبہ، آپ ﷺ نے انھیں مدینہ منورہ سے نکالنے کا فیصلہ کیا، جو وقت کا اہم تقاضا تھا۔

7- آپ ﷺ نے بدر کے میدان میں مشرکینِ مکہ کا انتظار کر کے انھیں یہ واضح پیغام دیا کہ مسلمان آج بھی جنگ کے لیے تیار ہیں۔اس حکمت عملی سے قریش پر ایک نفسیاتی دباؤ پیدا ہوا۔

اس کے بعد بھی کئی اور اہم واقعات بھی پیش آئے، جن کا ذکر احادیث اور سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ سب سے اہم واقعہ جنگِ خندق تھا، جسے جنگِ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ معرکہ اسلامی ریاست کے دفاع کے لیے ایک فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوا۔

***

جنگِ خندق؛ مشرکین مکہ کا مدینہ منورہ پر آخری وار

غزوہ خندق، جسے غزوہ احزاب بھی کہا جاتا ہے، پانچ ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔ سورۃ الاحزاب اسی معرکے سے منسوب ہے۔ یہ مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان تیسری بڑی اور باقاعدہ جنگ تھی (اس سے پہلے جنگِ بدر اور جنگِ اُحد ہو چکی تھیں)۔ اس جنگ میں ایک طرف مسلمان تھے، جب کہ دوسری طرف مشرکینِ مکہ اور ان کے اتحادی قبائل تھے۔ تقریباً دس سے بارہ ہزار افراد پر مشتمل کئی قبائل نے متحد ہو کر مدینہ منورہ پر حملہ کیا۔ اس بار، آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کے اندر رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کا فیصلہ فرمایا۔ مدینہ کی حفاظت کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر شہر کے گرد ایک وسیع خندق کھودی گئی، جس نے دشمن کی پیش قدمی روک دی۔

مشرکینِ مکہ اور ان کے اتحادیوں نے مدینہ کا طویل محاصرہ کیا، لیکن سخت موسمی حالات، سپاہیوں کی تھکن، اور اندرونی اختلافات کی وجہ سے وہ بالآخر ناکام ہو گئے اور پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس جنگ کے نہایت گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے، جنھوں نے جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری پوزیشن کو بے حد مستحکم کر دیا۔ اس جنگ کے بعد مشرکینِ مکہ نے کبھی دوبارہ مدینہ پر حملہ کرنے کی جرات نہ کی۔ یہ ان کے زوال کا نقطۂ آغاز اور اسلام کی سربلندی کا ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔

اس موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو سمجھنے کے لیے اس جنگ کی وجوہات اور مختصر پسِ منظر کو جاننا ضروری ہے۔ تاہم، اس مقالے کا بنیادی موضوع آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ہے، جو نہ صرف اس دور میں بلکہ آج کے زمانے کے لیے بھی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

قرآن مجید میں سورۃ الاحزاب میں اس جنگ کا احوال ملتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا۔ (الاحزاب ۳۳:۹)

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔

مفتی محمد شفیعؒ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:[55]

اے ایمان والو! اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو، جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے (یعنی عیینہ کا لشکر اور ابوسفیان کا لشکر اور یہود بنی قریظہ) پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی (جس نے ان کو پریشان کر دیا اور ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے) اور (فرشتوں کی) ایسی فوج بھیجی جو تم کو (عام طور پر) دکھائی نہ دیتی تھی (گو بعض صحابہ مثلاً حضرت حذیفہ نے بعض ملائکہ کو بشکل انسان دیکھا بھی اور کفار کے لشکر میں یہ جاسوسی کے لیے گئے تھے وہاں یہ آواز بھی سنی کہ بھاگو بھاگو۔ اور اس واقعے میں ملائکہ نے قتال نہیں کیا، صرف کفار کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لیے بھیجے گئے تھے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے (اس وقت کے) اعمال کو دیکھتے تھے (کہ تم نے ایک طویل و

[55] مفتی محمد شفیعؒ، معارف القرآن، ادراہ المعارف کراچی، ۲۰۰۸

عریض اور گہری خندق کھودنے میں بڑی محنت اٹھائی، پھر کفار کے مقابلے کے لیے بڑے استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہے اور اس پر خوش ہو کر تمہاری امداد فرمارہے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ وہ (دشمن) لوگ تم پر (ہر طرف سے نرغہ کر کے) آچڑھے تھے اوپر کی طرف سے اور نیچے کی طرف سے بھی (یعنی کوئی قبیلہ مدینہ کے نشیب کی طرف سے اور کوئی قبیلہ اس کی بلندی کی طرف سے) اور جب کہ آنکھیں (مارے دہشت کے) کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے (جیسا مواقع شدت میں طبعی طور پر مختلف وسوسے آیا کرتے ہیں اور یہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس قول کے منافی ہے جو آگے اہل ایمان کا آئے گا، (آیت) **ھذا ما وعدنا اللہ و رسولہ وصدق اللہ و رسولہ** کیونکہ اس میں لفظ ہذا کا اشارہ احزاب کے چڑھ آنے کی طرف ہے، چونکہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے دی گئی تھی، اس لیے یہ تو متیقن تھا لیکن انجام اس واقعے کا نہیں بتلایا گیا تھا اس لیے اس میں احتمالات مختلفہ غالب آنے اور مغلوب ہونے کے پیدا ہوتے تھے)۔

سید مودودیؒ نے سورۃ احزاب کے دیباچے میں اس جنگ سے پہلے کے واقعات، جنگ کے دوران پیش آنے والے حالات اور اس کے بعد کی روداد بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں بیان کیا جارہا ہے۔

یہ غزوہ دراصل عرب کے بہت سے قبائل کا ایک مشترکہ حملہ تھا جو

مدینہ کی اس طاقت کو کچل دینے کے لیے کیا گیا تھا۔اس کی تحریک بنی النَّضِیر کے اُن لیڈروں نے کی تھی جو جلا وطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔انھوں نے دَورہ کر کے قریش اور بنی غطفان اور دوسرے بہت سے قبائل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اب مل کر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مدینہ پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے قبائل عرب کی اتنی بڑی جمعیت اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہو گئی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔اس میں شمال کی طرف بنی النَّضِیر اور قَیْنُقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینہ سے جلا وطن ہو کر خیبر اور وادی القُریٰ میں آباد ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف سے غَطفان کے قبائل (بنو سُلیم، فَزارہ، مرّہ، اَشجع، سَعد اور اَسَد وغیرہ) نے پیش قدمی کی۔ اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے حلیفوں کی ایک بھاری جمعیت لے کر آگے بڑھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد دس بارہ ہزار تھی۔ یہ حملہ اگر اچانک ہوتا تو سخت تباہ کن ہوتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیّبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے حالانکہ آپ ﷺ کے خبر رساں اور تحریک اسلامی کے ہمدرد اور متاثرین جو تمام قبائل میں موجود تھے، آپ کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے برابر مطلع کرتے رہتے تھے (یہ قوم پرست جتھوں کے مقابلے میں ایک نظریاتی تحریک کی فوقیت کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ قوم پرست جتھے صرف اپنی قوم کے افراد کی تائید و حمایت ہی پر انحصار رکھتے ہیں۔ لیکن ایک اُصولی و نظریاتی تحریک اپنی دعوت سے ہر سمت میں بڑھتی ہے اور خود ان

جتھوں کے اندر سے اپنے حامی نکال لاتی ہے۔) قبل اس کے کہ یہ جمِّ غفیر آپ کے شہر پہنچتا، آپ نے چھ دن کے اندر اندر مدینہ کے شمال غربی رُخ پر ایک خندق کھُدوالی اور کوہ سَلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینہ کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہو سکتا تھا۔ مشرق میں حرّات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف مدینہ کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا اور اسی جانب حضورؐ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انھیں مدینہ کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیونکہ اہل عرب اس طریقِ دفاع سے نا آشنا تھے۔ ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ اس کے بعد کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی، اور وہ یہ کہ بنی قُریظہ کے یہودی قبیلے کو غدّاری پر آمادہ کریں جو مدینہ طیّبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چوں کہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچّے اُن گڑھیوں میں بھجوا دیے

تھے جو بنو قریظہ کی جانب تھیں اور اُدھر مدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔اُن کی طرف سے بنی النَّضیر کا یہودی سردار حُیّی بن اخطَب بنی قُریظہ کے پاس بھیجا گیا تاکہ انھیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرے۔ ابتداءً انھوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن جب ابنِ اخطب نے ان سے کہا کہ "دیکھو، میں اس وقت عرب کی متحدہ طاقت اس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے،اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا"، تو ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس ولحاظ پر غالب آگئی اور بنی قریظہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپؐ کو بر وقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپؐ نے فوراً انصار کے سرداروں کو ان کے پاس تحقیقِ حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپؐ نے اُن کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قُریظہ عہد پر قائم رہیں تو آکر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان یہ خبر سُنا دینا۔ لیکن اگر وہ نقضِ عہد پر مُصر ہوں تو صرف مجھ کو اشارۃً اس کی اطلاع دے دینا، تاکہ عام مسلمان یہ بات سُن کر پست ہمّت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قریظہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انھوں نے برملا ان سے کہہ دیا کہ لا عقد بيننا وبين محمد ولا عهد۔ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد وپیمان نہیں

ہے۔اس جواب کو سن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارۃً حضورؐ سے عرض کر دیا: عَضَل و قارہ۔یعنی قبیلہ عَضَل و قارہ نے رَجیع کے مقام پر مبلّغین اسلام کے وفد سے جو غدّاری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قریظہ کر رہے ہیں۔ یہ خبر بہت جلدی مدینہ کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔کیوں کہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آ گئے تھے اور ان کے شہر کا وہ حصّہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچّے بھی اسی جانب تھے۔اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور انھوں نے اہل ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔کسی نے کہا کہ ”ہم سے وعدے تو قیصر و کسریٰ کے ملک فتح ہو جانے کے کیے جا رہے تھے،اور حال یہ ہے کہ ہم رفع حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے۔“کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں ہمیں جا کر اُن کی حفاظت کرنی ہے۔کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ درست کر لو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کر دو۔یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہو گیا جس کے دِل میں ذرّہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔صرف صادق و مخلص اہل ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فداکاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غطفان سے صلح

کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ مدینہ کے پھلوں کی پیداوار کا تیسرا حصّہ لے کر واپس چلے جائیں۔ لیکن جب انصار کے سرداروں (سعدؓ بن عُبادہ اور سعدؓ بن مُعاذ) سے آپؐ نے اِن شرائط صلح کے متعلق مشورہ طلب کیا تو انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ، یہ آپؐ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؟ یا آپؐ ہمیں بچانے کے لیے یہ تجویز فرمارہے ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا: میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کررہا ہوں، کیوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پِل پڑا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں۔ اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ اگر آپؐ ہماری خاطر یہ معاہدہ کررہے ہیں تو اسے ختم کردیجیے۔ یہ قبیلے ہم سے اُس وقت بھی ایک حبّہ خراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے۔ اور اب تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔ کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان اب صرف تلوار ہی ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کردے۔ یہ کہہ کر انھوں نے معاہدے کے اس مسودے کو چاک کردیا جس پر ابھی دستخط نہ ہوئے تھے۔ اسی دوران قبیلۂ غَطفان کی شاخ اشجَع کے ایک صاحب نَعیم بن مسعُود مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبول اسلام کا علم نہیں ہے، آپؐ مجھ سے اس وقت جو خدمت لینا چاہیں

میں اسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو (اسی موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا اَلحَربُ خُدعَۃ۔ یعنی جنگ میں چال چلنا جائز ہے۔) چنانچہ وہ پہلے بنی قُریظہ کے پاس گئے جن سے ان کا بہت میل جول تھا، اور ان سے کہا کہ قریش اور غطفان تو محاصرے سے تنگ آکر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا، مگر تمھیں مسلمانوں کے ساتھ اسی جگہ رہنا ہے، وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمہارا کیا بنے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصّہ نہ لو جب تک اِن باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمہارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیے جائیں۔ یہ بات بنی قریظہ کے دِل میں اُتر گئی اور انھوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قریظہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آرہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمی مانگیں اور انھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ذرا ان کے ساتھ ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے متحدہ محاذ کے لیڈر بنی قُریظہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انھوں نے قُرظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آگئے ہیں، اب ایک فیصلہ کن لڑائی ہو جانی چاہیے، کل تم اُدھر سے حملہ کرو اور ہم اِدھر سے یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بنی قُریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک آپ لوگ اپنے چند نمایاں آدمی

یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہ کر دیں، اس وقت تک ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے متحدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین آگیا کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ انھوں نے یرغمال دینے سے انکار کر دیا اور اس سے بنی قُریظہ نے سمجھ لیا کہ نعیم نے ہمیں ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اِس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔ اب محاصرہ پچیس دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اتنے بڑے لشکر کے لیے پانی اور غذا اور چارے کی فراہمی بھی مشکل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھوٹ پڑ جانے سے بھی محاصرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس حالت میں یکایک ایک رات سخت آندھی کے زور سے دشمنوں کے خیمے الٹ گئے اور ان کے اندر شدید افراتفری برپا ہوگئی۔ قدرت خداوندی کا یہ کاری وار وہ نہ سہہ سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے گھر کی راہ لی اور صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان میں ایک دشمن بھی موجود نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان کو دشمنوں سے خالی دیکھ کر فوراً ارشاد فرمایا: لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھٰذا ولکنکم تغزونھم۔ یعنی اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے۔ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔

یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ قریش ہی نہیں، سارے دشمن قبائل متحدہ ہو کر اسلام کے خلاف اپنا آخری داؤ چل چکے تھے۔ اس میں ہار جانے کے بعد اب ان میں یہ ہمت ہی باقی نہ رہی تھی کہ مدینہ پر حملہ آور ہونے

کی جرأت کر سکتے۔ اب حملے (offensive) کی قوت دشمنوں سے
مسلمانوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

خندق سے پلٹ کر جب حضورؐ گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبرئیلؑ نے آکر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، بنی قریظہ کا معاملہ باقی ہے، ان سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہیں حضورؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ جو کوئی سمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیار بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے "۔ اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مقدمۃ الجیش کے طور پر بنی قریظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی ﷺ اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی، لیکن یہ بدزبانی ان کو اس جرم عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انھوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔ حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ محاصرے کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخر کار انھوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی ﷺ کے حوالے کر دیا کہ وہ قبیلہ اَوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انھوں نے حضرت سعدؓ کو اس امید پر حکم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اَوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدّتوں سے چلے آرہے تھے وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انھیں بھی اسی طرح مدینہ سے نِکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قَینُقاع اور بنی النضیر کو نِکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلۂ اَوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ نرمی

برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نِکل جانے کا موقع دیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینہ پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہل مدینہ کو تباہ کر دینے کا سامان کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قریظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انھیں پتہ چلا کہ جنگِ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان غدّاروں نے پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں فراہم کر رکھی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین وقت پر مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جبکہ مشرکین یکبارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملے میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل برحق تھا۔

سید مودودیؒ نے اس جنگ کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اس میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ اس موقع پر کفار نے خندق کو پار کرنے کی ہمت تو نہ کی، یہ ضرور ہوا کہ دونوں طرف سے تیر اندازی ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ تو کفار میں سے چند آدمی اپنے گھوڑے لے کر خندق میں بھی اترے مگر ناکام رہے۔ غزوہ خندق میں کفار کے تین آدمی قتل ہوئے (نوفل بن عبداللہ، عمرو بن عبدِ ود اور منبہ بن عبید) جبکہ چھ صحابہ اکرامؓ بھی شہید ہوئے (حضرت سعد بن معاذ، حضرت انس بن اویس، حضرت عبداللہ بن سہل، حضرت طفیل بن نعمان، حضرت ثعلبہ بن عنمہ اور حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہم اجمعین)۔

جنگ کے بعد کے ایک واقعے کے بارے میں صحیح بخاری میں درج ذیل ایک حدیث ملتی ہے جس سے ہمیں حالات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے (حدیث نمبر ۴۱۱۷)

(مرفوع) حدثني عبد الله بن ابي شيبة , حدثنا ابن نمير , عن هشام , عن ابيه , عن عائشة رضي الله عنها , قالت: لما رجع النبي صلى الله عليه وسلم من الخندق , ووضع السلاح واغتسل, اتاه جبريل عليه السلام فقال: قد وضعت السلاح, والله ما وضعناه, فاخرج إليهم, قال:" فإلى اين؟" قال: ها هنا ,واشار إلى بني قريظة فخرج النبي صلى الله عليه وسلم إليهم.

مجھ سے عبداللہ بن ابی شیبہ نے بیان کیا‘ کہا ہم سے عبداللہ بن نمیر نے بیان کیا‘ ان سے ہشام بن عروہ نے‘ ان سے ان کے والد نے اور ان سے عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جوں ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ خندق سے مدینہ واپس ہوئے اور ہتھیار اتار کر غسل کیا تو جبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور کہا: آپ نے ابھی ہتھیار اتار دیے؟ اللہ کی قسم! ہم نے تو ابھی ہتھیار نہیں اتارے۔ چلیے ان پر حملہ کیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کن پر؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ ان پر اور انھوں نے (یہود کے قبیلے) بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ پر چڑھائی کی۔

***

غزوہ خندق کے موقع پر آپ ﷺ کی حکمتِ عملی سے حاصل ہونے والے اسباق

مدافعانہ حکمت عملی: اس مرتبہ جنگِ اُحد کے تجربے کے پیش نظر آپ ﷺ نے مدینہ میں رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کا فیصلہ فرمایا، جو ہر لحاظ سے مفید رہا۔ آپ ﷺ نے شہر کو چاروں طرف سے محفوظ بنایا اور خواتین و بچوں کی حفاظت کا خصوصی بندوبست کیا۔

منافقین سے کنارہ کشی: اس بار آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی جیسے منافقوں کو اپنی صفوں میں شامل نہیں کیا، بلکہ صرف اپنے مخلص صحابہ کرامؓ کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترے۔

مستقل نگرانی: آپ ﷺ نے لمحہ بہ لمحہ حالات پر نظر رکھی اور دشمن کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے ایک منظم حکمتِ عملی ترتیب دی۔

دشمن کی صفوں میں اختلاف پیدا کرنا: جب موقع ملا، تو آپ ﷺ نے نعیم بن مسعودؓ جیسے مخلص ساتھی کے ذریعے دشمن کے مختلف گروہوں میں پھوٹ ڈلوادی، جس کی وجہ سے وہ ناکام و نامراد واپس لوٹنے پر مجبور ہوئے۔

یہودیوں کے خلاف فوری اقدام: جنگ کے فوراً بعد آپ ﷺ بنی قریظہ کی طرف متوجہ ہوئے، جنھوں نے جنگ کے دوران معاہدہ توڑ کر مسلمانوں سے غداری کی تھی۔ حالانکہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ تحفظ اور معاونت کے معاہدے میں شامل تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی عہد شکنی کا فوری اور موثر تدارک فرمایا، جس کے نتیجے میں آئندہ کسی یہودی قبیلے کو مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

مستقبل کی جنگی حکمت عملی: جنگ کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

(مرفوع) حدثنا ابو نعیم , حدثنا سفیان , عن ابی إسحاق , عن سلیمان بن صرد , قال: قال النبی صلی الله علیه وسلم یوم الاحزاب: نغزوهم ولا یغزوننا. ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، ان سے ابو اسحاق سبیعی نے، ان سے سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب کے موقع پر (جب کفار کا لشکر ناکام واپس ہو گیا) فرمایا کہ اب ہم ان سے لڑیں گے۔ آئندہ وہ ہم پر چڑھ کر کبھی نہ آ سکیں گے۔ (صحیح بخاری، حدیث ۴۱۰۹)

اصحابِ رجیع کے قاتلوں سے انتقام: جب موقع ملا، تو آپ ﷺ نے رجیع کے سانحے میں شہید ہونے والے صحابہؓ کا بدلہ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے خون کو رائیگاں نہیں جانے دیا اور جزیرۃ العرب کی انتقامی روایات کا بھی لحاظ رکھا۔

جنگِ احزاب: ایک اعصابی جنگ

یہ جنگ کوئی روایتی دوبدو معرکہ نہیں تھی، بلکہ اعصاب، حکمتِ عملی اور صبر و استقامت کی جنگ تھی۔

اسی موقع پر آپ ﷺ نے درج دعا کی تھی: "اے اللہ! کتاب اتارنے والے، جلد حساب لینے والے ان لشکروں کو شکست دے۔ اے اللہ! انھیں شکست سے دوچار کر اور انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دے۔" (صحیح البخاری، الجہاد والسیر)۔

جنگ خندق فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی کیونکہ:

1- عرب کے تمام بڑے قبائل مل کر بھی مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔

2- مشرکینِ مکہ کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ پر حملہ اب ممکن نہیں۔

3- کفار نے جتنی بڑی تیاری کی تھی، آئندہ اتنی قوت فراہم کرنا ان کے بس میں نہ رہا۔

4- تاریخ میں ایسا کوئی اور واقعہ نہیں جہاں عرب قبائل نے اس طرح متحد ہو کر جنگ لڑی ہو۔

جنگ کے بعد آپ ﷺ کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، اور اگلے ہی سال چھ ہجری میں صلح حدیبیہ اور آٹھ ہجری میں فتح مکہ کے واقعات پیش آئے۔

یہ سب بیان کرنے کے بعد میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزوہ خندق، در حقیقت، فتح مکہ کی بنیاد ثابت ہوا۔ آپ ﷺ کے دفاعی اور سفارتی اقدامات نے بغیر کسی بڑے تصادم کے اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس جنگ کے اہم پہلو کچھ اس طرح ہیں۔

مدافعانہ جنگی حکمتِ عملی (مدینہ میں رہ کر دفاع کرنا)

1- خندق کھودنے کا نیا حربہ (جو عربوں کے لیے اجنبی تھا)

2- کفار اور یہودیوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنا

3- یہودیوں کی غداری کا فوری سد باب

4- صحابہ کے ساتھ مل کر سختیوں کو برداشت کرنا

5- اللہ کی نصرت اور رحمت، جس نے کفار کو ناکام لوٹنے پر مجبور کیا

اس جنگ نے ثابت کر دیا کہ:

"جنگ میں سب سے اہم چیز اعصاب کی مضبوطی ہوتی ہے، جو کسی بھی معرکے کے نتیجے کا تعین کرتی ہے۔"

جنگِ خندق کے بعد کے اہم واقعات اور خارجہ پالیسی

جنگِ خندق، جو پانچ ہجری میں پیش آئی، کے بعد آپ ﷺ نے چھ ہجری میں

حدیبیہ کے مقام پر مشرکینِ مکہ سے صلح کی۔ اس درمیانی عرصے میں کئی اہم واقعات پیش آئے، جن کا ذکر سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام میں بھی ملتا ہے۔ ان میں سے چند نمایاں واقعات درج ذیل ہیں:

سلام بن ابی الحقیق کا قتل آپ ﷺ کی اجازت سے ہوا۔

عمرو بن عاصؓ اور خالد بن ولیدؓ کا قبولِ اسلام۔

غزوہ بنی لحیان: جس میں آپ ﷺ نے اصحابِ رجیع کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے لشکر کشی کی۔

غزوہ ذی قرد: جس میں دشمن کے حملے کو پسپا کیا گیا۔

غزوہ بنی مصطلق: جس میں بنی مصطلق کے فتنے کو ختم کیا گیا۔

فتنہ ابنِ سلول کا خاتمہ۔

حضرت جویریہؓ کا قیدی بن کر آنا اور پھر آپ ﷺ سے ان کا نکاح ہونا۔

ان کے علاوہ بھی کئی اہم واقعات اس دور میں پیش آئے، جن کی تفصیل سیرت ابنِ ہشام میں مذکور ہے۔ مگر اس باب میں میرا بنیادی موضوع صلح حدیبیہ کا پس منظر اور اس کے اثرات ہیں، تاکہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو بہتر انداز میں سمجھا جاسکے۔

***

مسلمان مکہ معظمہ کے دروازے پر اور صلح حدیبیہ

سورۃ الفتح (آیت نمبر ۲۷) میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ خوشخبری دی گئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ معظمہ جائیں گے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۔

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا ان شاءاللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے، اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا وہ اُس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اُس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔

اس آیت کی تشریح تفسیر عثمانی میں یوں کی گئی ہے [56]

ابتدائے سورت میں ذکر ہو چکا ہے کہ مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوئے اور سر منڈا کر اور بال کترا کر حلال ہو رہے ہیں۔ ادھر اتفاق سے آپ کا قصد اسی سال عمرہ کا ہو گیا۔ صحابہ نے عموماً یہ خیال جما لیا کہ اسی سال ہم مکہ پہنچیں گے اور عمرہ ادا کریں

[56] تفسیر عثمانی کا آغاز مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے کیا، بعد میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس پر حاشیہ آرائی کی۔

گے۔ جس وقت صلح مکمل ہو کر حدیبیہ سے واپسی ہوئی اور بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم امن وامان سے مکہ میں داخل ہوں گے اور عمرہ کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ امسال ایسا ہو گا۔ عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو بے شک یوں ہی ہو کر رہے گا۔ تم امن وامان سے مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کرو گے۔ اور تم میں سے کوئی سر منڈوا کر، کوئی بال کترواکر احرام کھولے گا اور وہاں جانے کے بعد کسی طرح کا کھٹکا نہ ہو گا۔ چنانچہ حدیبیہ سے اگلے سال یوں ہی ہوا آیت ہذا میں اسی واقعے کے بارے میں فرمایا ہے کہ بالتحقیق اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا۔ باقی اِنۡ شَآءَ اللّٰه فرمانا ابن کثیر کے نزدیک تحقیق وتاکید کے لیے ہے اور سیبویہ کے نزدیک اس قسم کے مواقع میں قطعی طور پر ایک چیز کا بتلانا کسی مصلحت سے مقصود نہیں ہوتا اور کرنا منظور ہوتا ہے وہاں یہ عنوان اختیار کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ اور اس وقت کے سیاسی حالات

اس سورت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی تھی کہ اب مشرکینِ مکہ مدینہ منورہ پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے، درست ثابت ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں صلح حدیبیہ (جسے بیعتِ رضوان بھی کہا جاتا ہے) کا ذکر کروں، ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت کے سیاسی حالات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے، تو وہاں یہودیوں کے تین بڑے قبائل آباد تھے؛ بنی نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ۔

آپ ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد میثاقِ مدینہ نامی ایک معاہدہ کیا، جس میں یہ تینوں قبائل شامل تھے۔ مگر بعد میں انھوں نے یکے بعد دیگرے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے انھیں مدینہ سے نکال دیا۔ یہی وہ یہودی قبائل تھے، جنھوں نے مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ورغلایا اور انھیں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا، جس کا نتیجہ جنگِ احزاب کی صورت میں نکلا۔ یہودیوں کی اکثریت خیبر میں جا کر آباد ہو گئی، جہاں وہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ ساز باز میں مصروف رہے۔

اب جزیرۃ العرب میں آپ ﷺ کے دو بڑے مخالف گروہ بن چکے تھے: مشرکینِ مکہ و دیگر عرب قبائل اور یہودی قبائل، جو پہلے آپ ﷺ کے ساتھ معاہدے میں تھے لیکن اب مخالف بن چکے تھے۔ اس کے ساتھ ایک نیا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ یہودی اور مشرکین آپس میں متحد ہو گئے، جس کا واضح مظاہرہ جنگِ خندق میں دیکھنے کو ملا، جہاں دونوں گروہ مسلمانوں کے خلاف ایک مشترکہ حملے میں شریک تھے۔

جنگِ خندق میں مسلمانوں کو ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس جنگ کا نتیجہ دو پہلوؤں پر مشتمل تھا:

1- مشرکینِ مکہ اور ان کے اتحادیوں کا مشترکہ حملہ ناکام ہو چکا تھا۔

2- لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ مشرکینِ مکہ کی طاقت ابھی برقرار تھی۔

اگر وہ دوبارہ اتحاد قائم کر کے مسلمانوں پر حملہ کرتے، تو صورت حال مشکل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جنگِ خندق کے بعد، تقریباً ایک سال کے اندر مختلف قبائل کے ساتھ مسلمانوں کی کشمکش میں اضافہ ہو گیا (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے)۔ اسلام کے دشمن ابھی بھی جنگ کے لیے تیار تھے۔ یہ صورت حال ظاہر کرتی ہے کہ اسلام کے مخالفین ابھی بھی جنگ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ایسے نازک وقت میں آپ ﷺ نے کون

سی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری اپنائی؟ یہی وہ موضوع ہے جسے میں یہاں تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم، اس سے پہلے صلح حدیبیہ کے واقعے کا ایک مختصر احوال پیش کرنا ضروری ہے۔

بیعتِ رضوان جسے صلح حدیبیہ بھی کہا جاتا ہے

بیعتِ رضوان بارے میں سورۃ الفتح کی پہلی آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ملتا ہے۔ سورۃ الفتح کے نزول بارے میں معارف القرآن میں بیان کیا گیا ہے؛

جمہور صحابہ وتابعین اور ائمہ تفسیر کے نزدیک سورۃ فتح اس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ بقصد عمرہ مکہ مکرمہ مع جماعت صحابہ کے تشریف لے گئے اور حرم مکہ کے قریب مقام حدیبیہ تک پہنچ کر قیام فرمایا مگر قریش مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے منع کیا پھر اس پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوئے کہ اس سال تو آپ واپس چلے جائیں اگلے سال اس عمرے کی قضاء کر لیں، بہت سے صحابہ کرام خصوصاً فاروق اعظم اس طرح کی صلح سے ناراض تھے مگر آنحضرت ﷺ نے باشارات ربانی اس صلح کو انجام کار مسلمانوں کے لیے ذریعہ کامیابی سمجھ کر قبول فرمالیا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے اپنا احرام عمرہ کھول دیا اور حدیبیہ سے واپس روانہ ہوئے تو راستے میں یہ سورت پوری نازل ہوئی جس میں بتلادیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب سچا ہے ضرور واقع ہوگا مگر اس کا یہ وقت نہیں بعد میں فتح کے وقت ہوگا اور اس صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ صلح ہی در حقیقت فتح مکہ کا سبب بنی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے فرمایا ہے کہ تم لوگ تو فتح مکہ کو فتح کہتے ہو اور ہم صلح حدیبیہ کو فتح سمجھتے ہیں۔ اسی طرح حضرت براء بن عازبؓ نے فرمایا کہ تم لوگ تو فتح مکہ ہی کو فتح سمجھتے ہو اور کوئی شک نہیں کہ وہ فتح ہے لیکن ہم تو واقعہ حدیبیہ کے وقت بیعت رضوان کو اصلی فتح سمجھتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے حاضرین

صحابہ سے جن کی تعداد چودہ سو تھی ایک درخت کے نیچے جہاد کرنے پر بیعت لی تھی جیسا کہ اسی سورت میں اس بیعت کا ذکر بھی آگے آ رہا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سورت واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے۔

سفر بغرض عمرہ

سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں بھی اس واقعے کی تفصیل بیان کی گئی ہے [57]۔اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

چھ ہجری میں ذیقعد کے مہینے میں آپ ﷺ نے عمرے کی غرض سے مکہ معظمہ کی طرف سفر شروع کیا۔آپ ﷺ کا جنگ کا ارادہ نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت نمیلہ بن عبدللہ لیثیؓ کو مدینہ منورہ کا حاکم مقرر کیا۔جب آپ ﷺ نے عمرے کا اعلان کیا تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد آپ ﷺ کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں مشرکین مکہ اس سفر سے جنگ کا تاثر نہ لے لیں، آپ ﷺ نے مہاجر و انصار اور ارد گرد میں بسنے والے دیگر لوگوں کے ساتھ احرام باندھ کر اور قربانی کے جانور ساتھ لے کر سفر شروع کیا۔یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا تاکہ سب یہ بات جان لیں کہ مسلمان عمرے کی نیت سے مکہ معظمہ کی طرف سفر کر رہے ہیں۔اس سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ اکرامؓ تھے۔جب آپ ﷺ کا قافلہ عسفان کے مقام پر پہنچا تو بشیر بن

[57] سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں بھی اسے بیعتِ رضوان ہی لکھا گیا ہے۔

سفیان نے بتایا کہ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کی آمد کا سن کر جنگ کی تیاری کر لی ہے اور وہ ذی طویٰ کے مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ قریش کو کیا ہو گیا ہے؟ لڑائی ان کو کھا گئی ہے۔ پھر بھی باز نہیں آتے۔ اگر یہ مجھ کو تمام عرب کے مقابل چھوڑ دیں اور خود الگ ہو جائیں تو بہتر ہے۔ اگر مجھ کو خدا نے عرب پر غالب کیا، تب یہ اسلام اختیار کر لیں گے یا جنگ کریں گے۔ اور اگر میں عرب سے مغلوب ہو گیا تب ان کا مطلب مفت حاصل ہو گا۔

صلح حدیبیہ: ایک تاریخی معاہدہ

سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

"کون ہے جو مجھے ایسا راستہ بتائے جو قریش کے راستے سے مختلف ہو، یعنی وہ راستہ جو مشرکینِ مکہ کے قبضے میں ہے، اس سے ہٹ کر ہو؟" اس پر بنی اسلم کے ایک شخص نے رہنمائی کی اور ایک دشوار گزار راستے سے قافلے کو لے کر مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام تک پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور آپ ﷺ نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم سے وہیں قیام فرمایا۔ یہ خبر قریش تک بھی پہنچ گئی۔

اب حدیبیہ ایک تاریخی مقام ہے جو مکہ معظمہ سے تقریباً پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک کنواں ہے جو حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے[58]۔ یہی وہ مقام ہے جہاں معاہدہ ہوا،

---

[58] یہ جگہ مکہ سے پرانے جدہ روڈ پر واقع ہے۔ اب یہاں حدیبیہ مسجد بنائی گئی ہے۔
+https://www.google.com/maps/place/Masjid+Hudaibiyah

اسی لیے اسے صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ ﷺ کی بہترین حکمتِ عملی کا ثبوت تھا کہ اتنے بڑے قافلے کی آمد کی اطلاع مشرکینِ مکہ کو وقت پر نہ ہو سکی۔ یعنی اپنے منصوبوں کو خفیہ رکھنا، جو جنگی اور سفارتی حکمت عملی کا ایک اہم اصول ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر سب سے پہلے بدیل بن ورقاء اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہوا اور پوچھا:

آپ ﷺ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ہم صرف کعبہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں۔

یہ جواب سن کر بدیل بن ورقاء قریش کے پاس واپس گیا اور انھیں اطلاع دی کہ مسلمان صرف زیارت کے لیے آئے ہیں۔ مگر قریش نے کہا: ہم اس بات کو نہیں مان سکتے۔ ہمیں لگتا ہے کہ محمد ﷺ دھوکے سے ہمارے شہر پر قبضہ کر لیں گے، اور ہم جزیرۃ العرب میں بے وقوف سمجھے جائیں گے۔

اس کے بعد قریش نے مختلف نمائندے بھیجے جن میں مکرز بن اخیف عامری اور حلیس بن علقمہ (جو کئی قبیلوں کی فوج کا سربراہ تھا) شامل تھے۔ آپ ﷺ نے ان سب کو یہی جواب دیا۔ حلیس بن علقمہ نے مشرکینِ مکہ کو یہی بات بتائی۔ یہ بات سن کر مشرکین مکہ نے حلیس بن علقمہ کی بات کو مذاق میں اڑا دیا۔ اس پر حلیس بن علقمہ ناراض ہوا اور کہنے لگا: اگر تم نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو زیارتِ کعبہ سے روکا، تو میں اپنے لشکر کو لے کر واپس چلا جاؤں گا۔

یہ سن کر قریش نے محسوس کیا کہ اب کوئی صلح کا راستہ نکالنا ضروری ہے۔ اسی دوران عروہ بن مسعود آیا اور آپ ﷺ کو ڈرانے لگا کہ اہلِ مکہ نے زبردست جنگی تیاری کر رکھی ہے اور وہ کل جنگ کے لیے مکمل تیار ہوں گے۔ اس کے بعد بھی کئی چھوٹے چھوٹے واقعات پیش آئے۔ سب سے اہم واقعہ یہ تھا کہ آپ ﷺ نے

حضرت عثمانؓ کو اہلِ مکہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو کعبہ کی زیارت کرنے کی اجازت دلائیں۔ حضرت عثمانؓ کی ابو سفیان سے ملاقات ہوئی۔ ابو سفیان نے حضرت عثمانؓ سے کہا: اگر تم چاہو تو طوافِ کعبہ کر سکتے ہو۔

مگر حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: میں رسول اللہ ﷺ کے بغیر طواف نہیں کروں گا۔

یہ سن کر مشرکینِ مکہ نے حضرت عثمانؓ کو روک لیا۔ جب حضرت عثمانؓ واپس نہ آئے، تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انھیں شہید کر دیا گیا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا: ہم حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بدلہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔

پھر آپ ﷺ نے ایک درخت کے نیچے اپنے جانثاروں سے بیعت لی، جسے بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔

اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کی غیر موجودگی میں اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر ان کی طرف سے بھی بیعت لی۔ اسی دوران سہیل بن عمرو عامری مشرکینِ مکہ کی طرف سے صلح کا پیغام لے کر آیا۔ اس نے کہا:

قریش یہ چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں اور اگلے سال تشریف لائیں۔ اگر آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا تو جزیرۃ العرب کے لوگ کہیں گے کہ آپ ﷺ نے زبردستی عمرہ کیا اور قریش آپ کو روک نہ سکے۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بہترین حکمتِ عملی اختیار کی اور حضرت عثمانؓ کو بطور سفیر بھیجا۔ جب ہم آپ ﷺ کے اس فیصلے کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب حالات کے عین مطابق تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخصیت تھے، جنھیں مکہ میں عزت و احترام حاصل تھا۔ ان کے تعلقات قریش کے کئی بڑے سرداروں سے تھے، جس سے بات چیت کا راستہ

کھلا۔ انھوں نے انتہائی دانشمندی سے مذاکرات کیے اور بالآخر ایک معاہدہ طے پا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفیر کے انتخاب نے صلح حدیبیہ کی کامیابی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہاں ہمیں ایک اہم سبق ملتا ہے کہ جنگی حالات میں اگر کوئی معاہدہ طے کرنا ہو، تو ایک ایسے سفیر کا انتخاب کیا جانا چاہیے جسے دونوں فریق عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔

قرآن مجید نے بھی اس صلح کو "فتح مبین" قرار دیا۔

اس واقعے سے متعلق قرآن مجید میں سورۃ الفتح کی کئی آیات موجود ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح قرار دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (الفتح ۴۸: ۱۰)

اے نبیؐ، جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا اب جو اس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا، اور جو اُس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۔ (سورۃ الفتح ۴۸: ۱۸)

اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں کا حال اُس کو معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۔ (سورۃ الفتح ۴۸: ۲۴)

وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک دیے، حالانکہ وہ اُن پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۔ (سورۃ الفتح ۴۸: ۲۵)

وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو اُن کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنھیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انھیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۖ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ۖ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِن دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا ۔ (سورۃ الفتح ۴۸: ۲۷)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک حق کے مطابق تھا ان شاءاللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے، اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا وہ اُس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اُس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔

طویل مذاکرات کے بعد چھ ہجری میں معاہدۂ حدیبیہ طے پایا۔اس معاہدے کی اصل اہمیت اس کی شرائط میں پوشیدہ ہے۔ان شرائط کا مطالعہ کرنے سے قبل ان پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط

طویل بحث و تمحیص کے بعد درج ذیل نکات پر اتفاق ہوا، جن کا ذکر حضرت عروہ بن زبیرؓ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ یہ شرائط سیرت النبی ﷺ از ابن ہشام میں بھی مذکور ہیں، اور دیگر سیرت کی کتب میں بھی ان کی تفصیل موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا ہے، اس واقعے کی تمام تر تفصیل میں نے سیرت النبی ﷺ از ابن ہشام سے لی ہے۔

معاہدے کی بنیادی شرائط کچھ یوں تھیں؛

1- فریقین کے درمیان دس سال کے لیے جنگ بندی کا فیصلہ کیا گیا۔اس دوران دونوں فریق امن قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔کوئی کسی کو قید نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی کے خلاف ہتھیار اٹھائے گا۔

2- جو بھی مسلمان حج یا عمرے کے لیے مکہ آئے گا، یا یمن یا طائف کی طرف سے آئے جائے گا، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

3- مشرکینِ مکہ میں سے جو کوئی شام یا مشرقی علاقوں کی طرف جاتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گزرے گا، اسے بھی تحفظ حاصل ہو گا۔

4- معاہدے کے مطابق آپ ﷺ کے حلیف بنو خزاعہ اور مشرکینِ مکہ کے حلیف بنو کنانہ بھی اس معاہدے کے پابند ہوں گے۔

5- مکہ سے اگر کوئی مسلمان مدینہ ہجرت کر کے آئے گا، تو اسے قریش کے حوالے کرنا ہو گا۔ مدینہ سے اگر کوئی شخص مکہ فرار ہو کر آئے گا، تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

صلح حدیبیہ کی اہمیت

اس معاہدے کو صلح حدیبیہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یہ معاہدہ کتنا اہم تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن نے اسے مسلمانوں کے لیے فتح مبین قرار دیا ہے (سورۃ الفتح ۴۸:۱)۔

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا۔

اے نبیؐ، ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی

اس معاہدے کی کئی شقوں کی وجہ سے کئی صحابہ اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس کا تفصیل سے ذکر سیرت کی کتابوں سے ملتا ہے۔ اس بارے میں کئی احادیث بھی ملتی ہے۔ میں ایک حدیث صحیح بخاری سے درج کر رہا ہوں (حدیث نمبر 4179):

(مرفوع) حدثنا عبد الله بن محمد , حدثنا سفيان , قال: سمعت الزهري حين حدث هذا الحديث حفظت بعضه ,وثبتني معمر ,عن عروة بن الزبير ,عن المسور بن مخرمة ,ومروان بن الحكم يزيد, احدهما على صاحبه, قالا: خرج النبي صلى الله عليه وسلم عام الحديبية في بضع عشرة مائة من اصحابه ,فلما اتى ذا الحليفة قلد الهدي واشعره واحرم منها بعمرة

, وبعث عينا له من خزاعة , وسار النبی صلی الله عليه وسلم حتی كان بغدير الاشطاط اتاه عينه,

قال: إن قريشا جمعوا لك جموعا , وقد جمعوا لك الاحابيش وهم مقاتلوك , وصادوك عن البيت ومانعوك , فقال:" اشيروا ايها الناس علی , اترون ان اميل إلی عيالهم وذراری هؤلاء الذين يريدون ان يصدونا عن البيت؟ فإن ياتونا كان الله عز وجل قد قطع عينا من المشركين وإلا تركناهم محروبين" , قال ابو بكر : يا رسول الله خرجت عامدا لهذا البيت لا تريد قتل احد ولا حرب احد , فتوجه له , فمن صدنا عنه قاتلناه , قال:" امضوا علی اسم الله".

ہم سے عبداللہ بن محمد مسندی نے بیان کیا' کہا ہم سے سفیان بن عیینہ نے بیان کیا' کہا کہ جب زہری نے یہ حدیث بیان کی (جو آگے مذکور ہوئی ہے) تو اس میں سے کچھ میں نے یاد رکھی اور معمر نے اس کو اچھی طرح یاد دلایا۔ ان سے عروہ بن زبیر نے' ان سے مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور مروان بن حکم نے بیان کیا' ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کچھ بڑھاتا ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے موقع پر تقریباً ایک ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ پھر جب آپ ذوالحلیفہ پہنچے تو آپ نے قربانی کے جانور کو قلادہ پہنایا اور اس پر نشان لگایا اور وہیں سے عمرے کا احرام باندھا۔ پھر آپ نے قبیلہ بنو خزاعہ کے ایک صحابی کو جاسوسی کے لیے بھیجا اور خود بھی سفر جاری رکھا۔ جب آپ غدیر الاشطاط پر پہنچے تو آپ کے جاسوس بھی خبریں لے کر آ گئے۔ جنھوں نے

بتایا کہ قریش نے آپ کے مقابلے کے لیے بہت بڑا لشکر تیار کر رکھا ہے اور بہت سے قبائل کو بلایا ہے۔ وہ آپ سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور آپ کو بیت اللہ سے روکیں گے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ مجھے مشورہ دو کیا تمہارے خیال میں یہ مناسب ہو گا کہ میں ان کفار کی عورتوں اور بچوں پر حملہ کر دوں جو ہمارے بیت اللہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بننا چاہتے ہیں؟ اگر انھوں نے ہمارا مقابلہ کیا تو اللہ عزوجل نے مشرکین سے ہمارے جاسوس کو محفوظ رکھا ہے اور اگر وہ ہمارے مقابلے پر نہیں آتے تو ہم انھیں ایک ہاری ہوئی قوم جان کر چھوڑ دیں گے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ تو صرف بیت اللہ کے عمرے کے لیے نکلے ہیں نہ آپ کا ارادہ کسی کو قتل کرنے کا ہے اور نہ کسی سے لڑائی کا۔ اس لیے آپ بیت اللہ تشریف لے چلیں۔ اگر ہمیں پھر بھی کوئی بیت اللہ تک جانے سے روکے گا تو ہم اس سے جنگ کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ کا نام لے کر سفر جاری رکھو۔

صلح حدیبیہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمتِ عملی

صلح حدیبیہ سے پہلے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی اہم معاہدے کیے، جن میں سب سے اہم میثاقِ مدینہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف قبائل سے معاہدے کیے، لیکن صلح حدیبیہ کئی لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پہلا معاہدہ تھا جس کے اثرات نہ صرف عرب بلکہ دیگر ریاستوں تک بھی پہنچے۔ اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے

کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر کون سی حکمتِ عملی اختیار کی، جس کی بدولت یہ معاہدہ قریش مکہ کے زوال کا پیش خیمہ بن گیا۔ یہاں تک کہ وہ دن آ پہنچا جب آپ ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں نے مکہ فتح کر لیا۔

میرے خیال میں فتح مکہ کی بنیاد اسی دن رکھی گئی تھی، جس دن صلح حدیبیہ طے پایا تھا۔ جب ہم اس معاہدے کے پورے عمل کا جائزہ لیتے ہیں، تو چند اہم نکات سامنے آتے ہیں:

حکمت و بصیرت کے ساتھ بڑے مقاصد کو سامنے رکھنا: آپ ﷺ نے ایسی شرائط بھی قبول فرمائیں، جو بظاہر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ اور غیر منصفانہ لگتی تھیں۔ کئی صحابہؓ نے ان شرائط پر تحفظات کا اظہار کیا، لیکن آپ ﷺ نے صبر اور حکمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بڑے مقصد کی خاطر ان شرائط کو تسلیم کیا۔ یہ ایک عظیم سبق ہے کہ وقتی طور پر پیچھے ہٹنا، طویل المدتی کامیابی کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

جنگ کے بجائے سفارت کاری کو ترجیح دینا: آپ ﷺ نے تلوار کے بجائے گفت و شنید کے ذریعے مسائل حل کرنے کو ترجیح دی۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ امن کا راستہ جنگ سے زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے، کیونکہ امن کے دوران دعوت و تربیت کا کام زیادہ مؤثر انداز میں کیا جا سکتا ہے۔

معاہدے کی پاسداری اور اس کی اہمیت: مسلمانوں کو معاہدے کی پاسداری سکھانے کے لیے آپ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو بھی واپس بھیج دیا، حالانکہ یہ بظاہر بہت مشکل فیصلہ تھا۔ بعد میں یہی شرط قریش کے لیے وبالِ جان بن گئی، کیونکہ وہی مہاجرین ایک الگ مقام پر جا کر قریش کے قافلوں کو نقصان پہنچانے لگے، جس سے قریش خود پریشان ہو گئے۔

قریش کی معاہدے کی خلاف ورزی اور اس کے نتائج: آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ قریش، جو مختلف قبائل کا مجموعہ تھے، اس معاہدے کی پابندی نہیں کر سکیں گے، جبکہ مسلمان اس کی سختی سے پاسداری کریں گے۔ صرف دو سال کے اندر ہی قریش نے معاہدے کی ایک اہم شق توڑ دی، جس کے بعد آپ ﷺ کو مکہ پر چڑھائی کا جواز مل گیا، اور مکہ فتح ہو گیا۔

معاہدے میں دور اندیشی کا پہلو

اس معاہدے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب بھی کسی دوسرے فریق سے معاہدہ کیا جائے، تو معمولی اور غیر ضروری باتوں پر اصرار کرنے کے بجائے طویل المدتی مقاصد کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ حقیقی کامیابی کے لیے وقتی مصلحتوں کو قبول کرنا دانشمندی کی علامت ہے۔

***

حدیبیہ کے معاہدے کے اثرات:
اسلام کی ترویج اور فتوحات کی راہ ہموار

صلح حدیبیہ کے بعد عرب میں امن قائم ہو چکا تھا، اور بظاہر جنگ کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اس پر امن دور میں آپ ﷺ نے عرب و غیر عرب قبائل اور دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے اور اپنی دعوت کو پھیلانے کے لیے کئی اہم اقدامات اٹھائے۔ ہم ان سطور میں ان اقدامات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لیے کس قدر فائدہ مند ثابت ہوئی۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کی کامیابیاں

ایک بار جب مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ قریش اب ان پر حملہ آور نہیں ہوں گے، تو انھوں نے یہودیوں کے مراکز خیبر اور فدک کو فتح کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے قبائل، جو قریش کے اتحادی تھے یا یہودیوں کے ڈر سے اسلام قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے، وہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ صلح حدیبیہ کے غیر متوقع اثرات دیکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ صلح حدیبیہ نے، جسے "فتح مبین" کہا گیا، جزیرۃ العرب میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کر دی اور مسلمانوں کے لیے بے شمار آسانیوں کے دروازے کھول دیے۔

صلح حدیبیہ کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہونے والے چند اہم فوائد درج ذیل ہیں:

اسلامی ریاست کا باضابطہ اعتراف: اس معاہدے کے بعد مشرکین مکہ نے پہلی بار مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک باقاعدہ ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا۔ یہ ایک عظیم سفارتی

کامیابی تھی، کیونکہ اب مدینہ کو عرب کے دیگر قبائل بھی ایک مستحکم ریاست کے طور پر دیکھنے لگے۔

مکہ میں مسلمانوں کو آزادی: مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو کھلے عام اسلام پر عمل کرنے کی اجازت ملی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ ﷺ اب ایک وسیع اور مستحکم حکمرانی قائم کر چکے تھے۔

بیرونی دنیا سے تعلقات قائم کرنے کا سنہری موقع: معاہدے کی دس سالہ جنگ بندی کی شق نے آپ ﷺ کو ایک ایسا موقع فراہم کیا، جس سے آپ نے مختلف ریاستوں اور قبائل سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ مسلمان بغیر کسی خوف و خطر عرب کے اندر اور باہر سفر کر سکتے تھے، جس سے معاشی، سیاسی، اور سماجی فوائد حاصل ہوئے۔ عرب اور بیرونِ عرب کے لوگ مدینہ کے سفر پر آ سکتے تھے، جس سے اسلامی ریاست کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے دیگر قبائل اور ریاستوں کے پاس سفارتی وفود بھیجے، اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کیے۔

اسلام کی تیزی سے اشاعت: بہت سے قبائل کے وفود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان ملاقاتوں کے نتیجے میں دعوتِ اسلام دور دور تک پہنچ گئی۔ ان ۲۲ مہینوں میں، جب جنگ بندی رہی، اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد پچھلے کئی سالوں کی نسبت کئی گنا زیادہ تھی۔ اس سے مسلمانوں کی تعداد اور طاقت میں زبردست اضافہ ہوا۔

مکہ کے لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی: اس معاہدے سے پہلے مشرکین مکہ آپ ﷺ کو مدینہ کا حکمران تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن اب وہ نہ صرف مدینہ کو ایک ریاست ماننے پر مجبور ہوئے بلکہ مدینہ کی قوت سے بھی خائف ہو گئے۔ یہ ایک بڑی سفارتی کامیابی تھی، کیونکہ اس کے بعد اہلِ عرب اور بیرونِ عرب کے لوگ بھی مدینہ کو بطورِ ریاست تسلیم کرنے لگے۔

امن کے قیام سے لوگوں کا اسلام کے قریب آنا: جب عرب میں امن قائم ہو گیا، تو بہت سے قبائل نے اسلام کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع پایا۔ نتیجتاً بہت سے قبائل گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ معاہدے کی شق کے مطابق مسلمانوں کو دوسرے قبائل سے اتحاد کرنے کی آزادی حاصل تھی، جس کا مسلمانوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

خیبر میں یہودیوں کی طاقت کا خاتمہ: اس معاہدے کا ایک اور اہم نتیجہ یہ نکلا کہ خیبر میں بسنے والے یہودی، جو قریش کے بڑے حلیف تھے، اب اس حمایت سے محروم ہو گئے۔

معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ قریش، مسلمانوں کے خلاف کسی بھی قبیلے کی مدد نہیں کریں گے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں نے خیبر میں یہودیوں کی سازشوں کا قلع قمع کر دیا، اور مدینہ کو اندرونی خطرات سے محفوظ بنا لیا۔

معاہدے کی بظاہر سخت شرائط، لیکن درحقیقت مسلمانوں کے حق میں: معاہدے کی کئی شرائط بظاہر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ لگتی تھیں، لیکن حقیقت میں وہی مشرکین مکہ کے لیے وبالِ جان بن گئیں۔ مثال کے طور پر، حضرت ابو جندلؓ کے معاملے پر مسلمانوں کو رنج پہنچا، لیکن آپ ﷺ نے معاہدے کی پاسداری کی۔ بعد میں وہی مسلمان، جنھیں مکہ میں روکا گیا تھا، وہاں سے نکل کر قریش کے لیے مستقل پریشانی کا سبب بن گئے۔ قریش نے خود آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان مسلمانوں کو واپس مدینہ بلا لیا جائے، جس سے یہ شرط انھی کے خلاف ثابت ہوئی۔

مسلمانوں کے لیے پہلا پُرامن دور: تین بڑی جنگوں اور چھ سال کی مسلسل جھڑپوں کے بعد، مسلمانوں کو پہلی بار مدینہ میں سکون نصیب ہوا۔ اب مدینہ پر مشرکین مکہ کے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا، اور مسلمان پہلی بار بغیر کسی خوف کے زندگی گزارنے لگے۔

دعوتِ اسلام کے عالمی سطح پر پھیلنے کی راہ ہموار ہوئی: بظاہر اس معاہدے میں تمام شرائط قریش کی مرضی کے مطابق رکھی گئیں، لیکن حقیقت میں یہ مسلمانوں کی عظیم فتح ثابت ہوئی۔ آپ ﷺ نے اس موقع کو دعوتِ اسلام کو عام کرنے کے لیے استعمال کیا، مختلف بادشاہوں کو خطوط ارسال کیے، اور کئی سربراہان کو اسلام کی دعوت دی۔

مکہ کی فتح کا راستہ ہموار ہوا: صلح حدیبیہ کے بعد، مسلمانوں کو بے مثال سفارتی اور دعوتی کامیابیاں ملیں۔ بیعتِ رضوان کے صرف دو سال بعد، آٹھ ہجری میں، مسلمان مکہ فتح کر چکے تھے۔ صلح حدیبیہ کے نتیجے میں ہونے والی جنگ بندی نے اسلام کی تبلیغ کے دروازے کھول دیے، جس کے نتیجے میں بے شمار قبائل مسلمان ہو گئے۔

اسلامی ریاست کی مضبوط بنیاد: صلح حدیبیہ کے بعد، مسلمان جنگ کے خوف سے آزاد ہو کر، علمی اور دعوتی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ جن لوگوں میں ذرہ برابر بھی عقل تھی، وہ گفتگو اور مباحثے کے ذریعے اسلام کی سچائی کو تسلیم کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال بعد، آپ ﷺ دس ہزار صحابہ کے لشکر کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔

***

غزوہ خیبر: جس کے بعد یہودی پھر نہ اٹھ سکے

غزوہ خیبر بارے میں کئی احادیث ملتی ہیں۔ صحیح بخاری کے باب المغازی میں ایک مکمل باب ملتا ہے (حدیث ۴۱۹۵ تا ۴۲۲۸)۔ ان کے علاوہ حدیث کی دیگر کتابوں میں بھی غزوہ خیبر کا تفصیل سے ذکر پایا جاتا ہے۔ عروہ بن زبیرؓ نے بھی اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس پر بات کروں کہ آپ ﷺ کے خیبر پر حملہ کرنے کی وجوہات کیا تھیں، میں غزوہ خیبر کا ایک مختصر ذکر بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے ہمیں یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ وہ کیا حالات تھے جب آپ ﷺ نے خیبر فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد اس موقع پر آپ ﷺ کی ترتیب دی گئی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا تذکرہ کیا جائے گا۔

(مرفوع) حدثنا عبد الله بن يوسف، اخبرنا مالك، عن حميد الطويل، عن انس رضي الله عنه، ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اتى خيبر ليلا، وكان إذا اتى قوما بليل لم يغر بهم حتى يصبح، فلما اصبح خرجت اليهود بمساحيهم ومكاتلهم، فلما راوه قالوا: محمد والله محمد والخميس، فقال النبي صلى الله عليه وسلم:" خربت خيبر، إنا إذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرين". (صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۱۹۷)

ہم سے عبداللہ بن یوسف تینسی نے بیان کیا، کہا ہم کو امام مالک رحمہ اللہ نے خبر دی، انھیں حمید طویل نے اور انھیں انس رضی اللہ عنہ نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر رات کے وقت پہنچے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ

جب کسی قوم پر حملہ کرنے کے لیے رات کے وقت موقع پر پہنچتے تو فوراً ہی حملہ نہیں کرتے بلکہ صبح ہو جاتی جب کرتے۔ چنانچہ صبح کے وقت یہودی اپنے کلہاڑے اور ٹوکرے لے کر باہر نکلے لیکن جب انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو شور کرنے لگے کہ محمد' اللہ کی قسم! محمد لشکر لے کر آ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خیبر برباد ہوا' ہم جب کسی قوم کے میدان میں اتر جاتے ہیں تو ڈرائے ہوئے لوگوں کی صبح بری ہو جاتی ہے۔

(مرفوع) حدثنا سليمان بن حرب، حدثنا حماد بن زيد، عن ثابت، عن انس رضی الله عنه، قال: صلى النبی صلى الله عليه وسلم الصبح قريبا من خيبر بغلس، ثم قال: "الله اكبر خربت خيبر، إنا إذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرين"، فخرجوا يسعون فی السكك، فقتل النبی صلى الله عليه وسلم المقاتلة، وسبى الذرية، وكان فی السبی صفية فصارت إلى دحية الكلبی، ثم صارت إلى النبی صلى الله عليه وسلم فجعل عتقها صداقها، فقال عبد العزيز بن صهيب لثابت: يا ابا محمد آنت قلت لانس: ما اصدقها؟ فحرك ثابت راسه تصديقا له. (صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۲۰۰)

ہم سے سلیمان بن حرب نے بیان کیا' کہا ہم سے حماد بن زید نے بیان کیا' ان سے ثابت نے اور ان سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز خیبر کے قریب پہنچ کر ادا کی' ابھی اندھیرا تھا پھر فرمایا' اللہ کی ذات سب سے بلند و برتر ہے۔ خیبر برباد ہوا' یقیناً جب ہم کسی قوم کے میدان میں اتر جاتے ہیں تو ڈرائے لوگوں کی صبح بری ہو

جاتی ہے۔ پھر یہودی گلیوں میں ڈرتے ہوئے نکلے۔ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنگ کرنے والے لوگوں کو قتل کرا دیا اور عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا۔ قیدیوں میں ام المؤمنین صفیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی تھیں۔ پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئیں۔ چنانچہ آپ نے ان سے نکاح کر لیا اور مہر میں انھیں آزاد کر دیا۔ عبدالعزیز بن صہیب نے ثابت سے پوچھا: ابو محمد! کیا تم نے یہ پوچھا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو مہر کیا دیا تھا؟ ثابت رضی اللہ عنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

غزوہ خیبر کی رُوداد سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر سیرت کی کتابوں میں بھی اس غزوہ کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ نے بھی اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، میں اس کا خلاصہ یہاں بیان کر رہا ہوں۔

حدیبیہ سے واپس آنے کے تقریباً دو ماہ بعد، محرم کے آخری دنوں میں، آپ ﷺ نے خیبر کے جہاد کا فیصلہ فرمایا۔ آپ ﷺ نے نمیلہ بن عبداللہ لیثیؓ کو مدینہ منورہ کا حاکم مقرر کیا اور حضرت علیؓ کو سفید جھنڈا عطا فرما کر آگے روانہ کیا۔ آپؐ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ صبح کے وقت حملہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ رات کے وقت خیبر پہنچے اور اگلے روز صبح ہوتے ہی حملہ کیا۔

مقامی لوگوں نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ لیا اور جا کر باقی لوگوں کو بھی اطلاع دی۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ آپ ﷺ نے رجیع نامی وادی، جو خیبر اور شام کے درمیان واقع تھی، میں قیام فرمایا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کو

معلوم ہوا تھا کہ بنی غطفان کے لوگ خیبر کی مدد کو آ سکتے ہیں، لہٰذا انھیں روکنے کے لیے آپ ﷺ نے اس وادی میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ دیکھ کر بنی غطفان نے یہودیوں کی مدد کا ارادہ ترک کر دیا۔

خیبر میں کئی قلعے تھے، جو ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک ایک کر کے قلعوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ان فتوحات کے نتیجے میں کئی قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، جن میں ام المؤمنین حضرت صفیہؓ بھی شامل تھیں، جو ایک یہودی سردار کی بیٹی تھیں۔ جب آپ ﷺ آخری دو قلعوں تک پہنچے تو تقریباً دس روز تک محاصرہ جاری رہا۔ اس موقع پر ایک یہودی جنگجو مرحب پوری طرح مسلح ہو کر باہر نکلا۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا، جنھوں نے مرحب کو قتل کر دیا۔

اس جنگ میں ایک اور اہم واقعہ بھی پیش آیا۔ آپ ﷺ نے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ایک قلعے کی طرف بھیجا، مگر وہ اسے فتح نہ کر سکے۔ بعد میں حضرت عمر بن خطابؓ کو بھیجا گیا، لیکن وہ بھی قلعہ فتح نہ کر سکے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرے گا اور کبھی پیٹھ نہیں دکھائے گا، اور اس کے ہاتھوں اللہ فتح عطا فرمائے گا۔

اگلے روز آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلوایا۔ ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی، تو آپ ﷺ نے اپنا لعابِ مبارک ان کی آنکھوں پر لگایا، جس سے ان کی تکلیف ختم ہو گئی۔ پھر آپ ﷺ نے جھنڈا ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا:

اللہ کے نام اور اس کی برکت کے ساتھ قلعے پر حملہ کرو، اللہ تمہارے ہاتھوں فتح عطا فرمائے گا۔

چنانچہ حضرت علیؓ کی قیادت میں مسلمانوں نے قلعے پر حملہ کیا اور بالآخر یہ اہم قلعہ فتح ہو گیا۔

کئی روز کے محاصرے کے بعد جب یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ ان کے بچنے کی کوئی راہ نہیں، تو انھوں نے آپ ﷺ کو پیغام بھیجا کہ ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں، آپ ﷺ ہماری جان بخشی کر دیں۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرما لی۔ خیبر کا تمام مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ کچھ یہودیوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھیتی باڑی کے ماہر ہیں، ہمیں یہ کام کرنے دیا جائے، اور ہم اپنی پیداوار میں سے نصف حصہ آپ ﷺ کو دیتے رہیں گے۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست بھی قبول فرمالی۔

اسی جنگ کے دوران، جب آپ ﷺ فتوحات سے فارغ ہوئے، ایک یہودی عورت نے آپ ﷺ کو زہر دینے کی کوشش کی۔ آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے معلوم ہوا کہ کھانے میں زہر ہے۔ آپ ﷺ نے اس عورت سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: آپ ﷺ جانتے ہیں کہ میری قوم کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر آپ ﷺ بادشاہ ہیں تو ہم اس زہر کے ذریعے آپ ﷺ سے نجات حاصل کر لیں گے اور اگر آپ ﷺ نبی ہیں تو اللہ رب العزت آپ ﷺ کو اس کی خبر دے دے گا اور آپ ﷺ محفوظ رہیں گے۔

چونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ ﷺ کو زہر کے بارے میں مطلع کر دیا تھا، آپ ﷺ محفوظ رہے، اور اس عورت کو معاف کر دیا۔ لیکن آپ ﷺ کے ایک صحابی، حضرت بشر بن براءؓ، نے وہ گوشت کھا لیا تھا، جس کے نتیجے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جنگ خیبر کے بعد کے واقعات

اس جنگ کے بعد واپسی پر کئی اہم واقعات پیش آئے، لیکن وہ ہمارے مقالے کے موضوع سے مختلف ہیں۔ اس جنگ میں کچھ خواتین بھی شامل تھیں، جنھیں آپ ﷺ نے آنے کی اجازت دی تھی۔ ہمارا اصل موضوع اس موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا جائزہ لینا ہے۔ سب سے پہلے ان حالات کا ذکر ضروری ہے جو غزوہ خیبر سے پہلے کے تھے، تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ آپ ﷺ نے حدیبیہ سے واپسی کے فوراً بعد خیبر پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟

حدیبیہ کے بعد خیبر پر حملے کی حکمت

جنگِ احزاب کے بعد جزیرۃ العرب میں آپ ﷺ کے دو بڑے مخالف باقی رہ گئے تھے: یہود اور مشرکینِ مکہ۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق اور سیاسی گٹھ جوڑ تھا۔ قریش مکہ، جزیرۃ العرب میں ایک بڑی سیاسی حیثیت رکھتے تھے۔ بہت سے قبائل ان کے حلیف تھے، اور وہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ دوسری طرف، آپ ﷺ خود بھی قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے، لیکن آپ ﷺ کے قبیلے کے اکثر افراد نے آپ ﷺ کی شدید مخالفت کی تھی۔ قریش نے نہ صرف آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا، بلکہ مدینہ میں آپ ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست کو ختم کرنے کے لیے گزشتہ چھ سالوں سے مسلسل کوششیں کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جزیرۃ العرب کے اکثر قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا، لیکن وہ مسلمانوں کی طاقت ختم کرنے کے اپنے خواب کو پورا نہ کرسکے۔

مکہ کے مشرکین کو اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ:

- کئی جنگوں میں ان کے افراد مارے جا چکے تھے۔

❖ ان کے بہت سے قریبی رشتہ دار مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ ہجرت کر چکے تھے۔

بہت سے خاندان آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہو چکے تھے۔

❖ مدینہ کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے قریش کی معاشی طاقت بھی کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

یہ تمام عوامل اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حدیبیہ کے بعد سب سے پہلے خیبر پر حملہ کیوں کیا؟ یہ جنگ نہ صرف مدینہ کی سلامتی کے لیے ضروری تھی بلکہ اسلامی ریاست کے استحکام کا ایک اہم مرحلہ بھی ثابت ہوئی۔

آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر مشرکینِ مکہ سے صلح کی۔ اس معاہدے میں مشرکین مکہ ایک ایسی شق پر راضی ہو گئے جس نے ان کی پچھلی چھ سالہ کوششوں پر پانی پھیر دیا، یعنی اگلے دس سال کے لیے جنگ بندی۔ مسلمان تو پہلے ہی جنگ نہیں چاہتے تھے، اب مشرکینِ مکہ نے بھی جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک طرح سے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور اپنی ان کوششوں کو ضائع کر دیا، جن کے لیے وہ تین بڑی جنگیں بھی لڑ چکے تھے۔ اس معاہدے کے بعد آپ ﷺ کو مشرکینِ مکہ کی طرف سے کسی فوری خطرے کا اندیشہ نہ رہا۔

یہودیوں کی حیثیت اور خیبر کی اہمیت

مدینہ اور دیگر کئی علاقوں میں یہودی آباد تھے۔ ان کی کوئی بہت بڑی سیاسی حیثیت نہ تھی، نہ ہی ان کے پاس زیادہ افرادی قوت تھی، لیکن دولت و ثروت کے لحاظ سے وہ جزیرۃ العرب میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ مشرکینِ مکہ بھی مالی طور پر ان کے محتاج تھے، اور کئی قبائل یہودیوں کے معاشی اثر ورسوخ میں تھے۔ دو بڑی طاقتیں

مسلمانوں کے خلاف متحد تھیں؛ مشرکینِ مکہ، جو سیاسی طور پر مضبوط تھے، بڑی فوج رکھتے تھے، اور انتقام لینا چاہتے تھے اور یہودی، جنھیں مدینہ سے نکالا جا چکا تھا، اور وہ خیبر سمیت مختلف علاقوں میں جا بسے تھے۔ خیبر ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا، جہاں بے شمار پہاڑیاں اور مضبوط قلعے تھے۔ یہ یہودی بھی انتقام کے جذبے سے خالی نہ تھے اور مسلمانوں کی ترقی کو روکنا چاہتے تھے۔

خیبر پر حملے کی وجوہات

حدیبیہ کے معاہدے کے بعد، آپ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ بہترین موقع ہے کہ یہودیوں کی قوت کو ختم کیا جائے، خاص طور پر اس لیے بھی یہ ایک بہترین موقع تھا کیونکہ اب مشرکینِ مکہ ان کی حمایت کے لیے نہیں آ سکتے تھے۔ صرف ایک خطرہ باقی تھا کہ ان کے قریبی حلیف، بنی غطفان، ان کی مدد کو آ سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے یہ مناسب سمجھا کہ یہودیوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑی جائے اور انھیں جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے۔

میرے خیال میں، غزوہ خیبر کی درج ذیل چھ بڑی وجوہات تھیں:

1- **اسلامی ریاست کا استحکام:** آپ ﷺ نے خیبر کی مہم کو جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کے کنٹرول کو مستحکم کرنے اور اسلامی ریاست کو محفوظ بنانے کی کوششوں کا حصہ بنایا۔

2- **مدینہ کے شمالی راستوں کا تحفظ:** خیبر اپنے محلِ وقوع اور مضبوط قلعوں کی وجہ سے ایک محفوظ قلعہ بند علاقہ تھا۔ یہاں یہودیوں کی موجودگی ہمیشہ مسلمانوں کے لیے ایک خطرہ بنی رہتی۔ آپ ﷺ نے خیبر پر حملہ کر کے مدینہ کے شمالی راستوں کو محفوظ بنانے کی کوشش کی تاکہ مستقبل میں کسی بھی ممکنہ خطرے سے بچا جا سکے۔

3- **معاشی فوائد:** خیبر ایک زرخیز خطہ تھا، جو اپنی زرعی پیداوار اور دولت کے لحاظ سے مشہور تھا۔ اس پر مسلمانوں کا قبضہ ان کے لیے بے حد مالی فائدہ مند ثابت ہوا۔ غزوہ خیبر کے بعد مسلمان معاشی طور پر مستحکم اور خوشحال ہو گئے۔

4- **یہودیوں اور دشمن قبائل کے گٹھ جوڑ کو روکنا:** آپ ﷺ کو معلوم ہو چکا تھا کہ آپ کے دشمن خیبر کو مرکز بنا کر مختلف قبائل کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ خیبر کے قلعے ناقابل تسخیر ہیں اور ایک نیا اتحاد بنا کر مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس ممکنہ خطرے کو جڑ سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

5- **یہودیوں کے اقدامات کا انتقام:** یہودیوں نے کئی بار اسلام کے خلاف سازشیں کیں، مدینہ میں بدعہدی کی، اور کئی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف شریک ہوئے۔ ان کے ان اقدامات کا جواب دینا ضروری تھا، جس کے باعث آپ ﷺ نے ان کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی۔

6- **مسلم ریاست کی وسیع حکمت عملی:** یہ جنگ آپ ﷺ کی جزیرۃ العرب میں مسلم ریاست کے کنٹرول کو مستحکم کرنے کی حکمت عملی کا حصہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ خیبر میں یہودیوں کی شکست کے بعد جزیرۃ العرب میں کوئی بھی طاقت مسلمانوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اس جنگ کے بعد مسلم ریاست نہ صرف سیاسی اور عسکری طور پر مضبوط ہوئی بلکہ اس کے اثر ورسوخ میں بھی اضافہ ہوا۔

غزوہ خیبر کے دیرپا اور گہرے اثرات

غزوہ خیبر کی کامیابی کے بعد، تاریخ نے دیکھا کہ :

خیبر مسلمانوں کے کنٹرول میں آگیا۔

1- مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہوگئی۔

2- ارد گرد کے علاقوں میں مسلمانوں کا سیاسی اثر ور سوخ بڑھا

3- اب تک کی گئی بات کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر مشرکینِ مکہ سے صلح کی، جس کے نتیجے میں اگلے دس سال کے لیے جنگ بندی طے پائی۔ اس معاہدے سے مشرکینِ مکہ نے بھی جنگ سے دستبرداری اختیار کر لی، جس کے بعد مسلمانوں کو مکہ کی جانب سے کسی فوری خطرے کا سامنا نہ رہا۔

مدینہ اور دیگر علاقوں میں یہودی مالی طور پر مضبوط تھے، مگر سیاسی و عسکری طور پر کمزور تھے۔ مشرکینِ مکہ اور یہودی، دونوں مسلمانوں کے خلاف متحد ہو چکے تھے، لیکن حدیبیہ کے بعد مشرکینِ مکہ یہودیوں کی مدد کو تیار نہ تھے۔ آپ ﷺ نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے خیبر پر فیصلہ کن حملے کا منصوبہ بنایا۔

میں یہ سب دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کامیابی جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کے مکمل غلبے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

***

عمرہ قضاء کی ادائیگی

حدیبیہ کے معاہدے میں یہ شرط شامل تھی کہ اگلے سال مسلمان صرف تلوار، وہ بھی نیام میں رکھ کر، یعنی ایک طرح سے غیر مسلح ہو کر عمرے کے لیے آئیں گے اور مکہ میں صرف تین دن قیام کریں گے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ نے اسے عمرۂ قضاء کا نام دیا ہے، اور سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں بھی یہی نام درج ہے۔ سیرت ابن ہشام میں مذکور تفصیل کے مطابق، یہ عمرہ سات ہجری میں اسی مہینے ادا کیا گیا، جس میں حدیبیہ کے مقام پر صلح کا معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق، آپ ﷺ اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے گئے تھے اور اگلے سال غیر مسلح ہو کر عمرے کے لیے آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اسی بنا پر اسے عمرۂ قضاء کہا گیا، جبکہ بعض لوگ اسے عمرۂ قصاص بھی کہتے ہیں۔

اس سفر میں وہ تمام لوگ شامل تھے جو ایک سال قبل آپ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ آئے تھے لیکن بغیر عمرہ کیے واپس چلے گئے تھے۔ آپ ﷺ کی آمد کی خبر سن کر مشرکینِ مکہ دور کھڑے ہو گئے اور آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو طواف کرتے دیکھنے لگے۔ اس دوران، انھوں نے طنزیہ فقرے بھی کسے۔ اس پر آپ ﷺ نے اپنا کندھا چادر سے باہر نکالا اور جوش و خروش کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے تین طواف کیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اللہ اس پر رحم فرمائے جو آج مشرکینِ مکہ کو اپنی طاقت دکھائے!

اسی دوران، آپ ﷺ نے حضرت میمونہ بنت الحارثؓ سے نکاح بھی فرمایا اس کا ذکر صحیح بخاری میں ملتا ہے (حدیث ۴۲۵۹)

(مرفوع) قال ابو عبدالله، وزاد ابن إسحاق، حدثني ابن ابي نجيح، وابان بن صالح، عن عطاء، ومجاهد، عن ابن عباس، قال: تزوج النبي صلى الله عليه وسلم ميمونة في عمرة القضاء.

امام بخاری رحمہ اللہ نے اور ابن اسحاق نے اپنی روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ مجھ سے ابن ابی نجیح اور ابان بن صالح نے بیان کیا' ان سے عطاء اور مجاہد نے اور ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے عمرہ قضاء میں نکاح کیا تھا۔

آپ ﷺ نے معاہدے کے مطابق صرف تین دن قیام کیا۔ جب یہ مدت پوری ہو گئی تو مشرکینِ مکہ نے پیغام بھیجا کہ تین دن مکمل ہو چکے ہیں، لہٰذا آپ ﷺ مکہ سے چلے جائیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

اگر تم اجازت دو تو ہم یہاں شادی کا ولیمہ کریں اور تمہیں بھی دعوت دیں۔

لیکن مشرکینِ مکہ نے آپ ﷺ کی دعوت قبول نہ کی، چنانچہ آپ ﷺ مکہ سے باہر تشریف لے گئے۔

اس واقعے کا ذکر کئی احادیث میں بھی ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں درج ایک حدیث (حدیث نمبر ۴۲۵۲) کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

(مرفوع) حدثني محمد بن رافع، حدثنا سريج، حدثنا فليح. ح وحدثني محمد بن الحسين بن إبراهيم، قال: حدثني ابي، حدثنا فليح بن سليمان، عن نافع، عن ابن عمر رضی الله عنهما: " ان رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج معتمرا، فحال كفار قريش بينه وبين البيت، فنحر هديه، وحلق راسه بالحديبية، وقاضاهم على ان يعتمر العام المقبل، ولا يحمل سلاحا عليهم إلا سيوفا، ولا يقيم بها إلا ما احبوا، فاعتمر من العام

المقبل فدخلها كما كان صالحهم، فلما ان اقام بها ثلاثا، امروه ان يخرج، فخرج".

مجھ سے محمد بن رافع نے بیان کیا' کہا ہم سے سریج نے بیان کیا' کہا ہم سے فلیح نے بیان کیا۔ (دوسری سند اور مجھ سے محمد بن حسین بن ابراہیم نے بیان کیا' کہا کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا' ان سے فلیح بن سلیمان نے بیان کیا' ان سے نافع نے اور ان سے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرے کے ارادے سے نکلے ' لیکن کفار قریش نے بیت اللہ پہنچنے سے آپ کو روکا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قربانی کا جانور حدیبیہ میں ہی ذبح کر دیا اور وہیں سر بھی منڈوایا اور ان سے معاہدہ کیا کہ آپ آئندہ سال عمرہ کر سکتے ہیں لیکن (نیام میں) تلواروں کے سوا اور کوئی ہتھیار ساتھ نہیں لا سکتے اور جتنے دنوں مکہ والے چاہیں گے ' اس سے زیادہ آپ وہاں ٹھہر نہیں سکیں گے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ سال عمرہ کیا اور معاہدے کے مطابق مکہ میں داخل ہوئے۔ تین دن وہاں مقیم رہے۔ پھر قریش نے آپ سے جانے کے لیے کہا اور آپ مکہ سے چلے آئے۔

اس کے بعد آپ ﷺ مکہ سے باہر چند روز قیام پذیر رہے۔ یہاں اس عمرے کے سفر کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ اس موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے چند اہم نکات ذکر کرنا ضروری ہیں، جو آج بھی ہماری رہنمائی کے لیے بے حد مفید ہیں۔ صلح حدیبیہ کے معاہدے نے عرب میں مشرکینِ مکہ کے حوالے سے ایک منفی تاثر پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے وہ کام کیا جو اس سے پہلے

شاذ و نادر ہی ہوا تھا، یعنی کسی زائر کو عمرہ ادا کرنے سے روکنا۔ دوسری جانب، عرب بھر میں یہ خبر بھی عام ہو گئی کہ مسلمان جنگ و جدل کے بجائے ایک بنیادی تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں۔ اس تاثر نے اسلام کی ترویج میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بڑی تعداد میں وفود مدینہ آئے، اور اس سال کو "عام الوفود" (وفود کا سال) کہا جانے لگا۔ اس واقعے سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی خوف کے بغیر عمرہ کرنے کا فیصلہ فرمایا، اور ایک بڑی جماعت صحابہؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ مسلمان اب کسی خوف میں مبتلا نہیں، بلکہ غیر مسلح ہو کر بھی تین دن مکہ میں قیام کریں گے۔ یہ مشرکینِ مکہ کے لیے ایک واضح پیغام تھا کہ مسلمان اب ایک مضبوط اور خود مختار قوت بن چکے ہیں۔ اس عمرے کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے پاس طاقت تھی اور مشرکینِ مکہ کمزور ہو رہے تھے، آپ ﷺ نے تین دن سے ایک لمحہ بھی زیادہ مکہ میں قیام نہیں کیا اور وعدے کے مطابق روانہ ہو گئے۔ اس نے عرب میں یہ تاثر پیدا کیا کہ آپ ﷺ اپنے وعدے کے پکے ہیں، اور عرب معاشرے میں اس وصف کی بے حد قدر کی جاتی تھی۔ یہی خوبی اسلام کی دعوت کے پھیلاؤ میں بھی ایک اہم ذریعہ بنی۔ اس سفر میں ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ طواف کے دوران بھرپور قوت اور جوش و خروش کے ساتھ چلیں تاکہ مشرکینِ مکہ کو احساس ہو کہ مسلمان اب کمزور نہیں رہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات لگتی ہے، لیکن جب دو گروہوں کے درمیان کشمکش ہو، تو ایسی حکمت عملی بھی نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اسی موقع پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ تلوار ہاتھ میں لیے رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آپ ﷺ کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس مختصر قیام کے دوران، آپ ﷺ نے مکہ کے ایک معزز خاندان کی خاتون حضرت میمونہ بنت الحارثؓ سے نکاح بھی فرمایا۔ یہ ایک طرح کا سفارتی پیغام تھا کہ آپ ﷺ مشرکینِ مکہ کے ساتھ اچھے تعلقات قائم

رکھنا چاہتے ہیں اور جنگ کے خواہاں نہیں۔ یہ نکاح ایک بڑی سفارتی کامیابی تھی، کیونکہ اس خاندان کی تلواریں اگرچہ مشرکین کے ساتھ تھیں، لیکن ان کے دل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہو گئے تھے۔

یاد رہے کہ یہ عمرہ سات ہجری میں اسی مہینے ادا کیا گیا تھا جس میں حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس سے اگلے سال، یعنی آٹھ ہجری میں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا۔ یوں تین سال میں چار اہم واقعات پیش آئے: صلح حدیبیہ، فتح خیبر، عمرہ قضاء اور فتح مکہ۔

الحمد للہ رب العالمین!

***

سات ہجری عام الخطوط

صلح حدیبیہ کے بعد، چھٹی اور ساتویں ہجری میں، آپ ﷺ نے عرب سے باہر کی ریاستوں کے سربراہوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط ارسال کرنا شروع کیے۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی، جس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا۔ اسی وجہ سے ساتویں ہجری کو عام الخطوط (یعنی خطوط کا سال) بھی کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں کئی احادیث ملتی ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث (حدیث نمبر ۵۸۷۵) کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

(مرفوع) حدثنا آدم بن أبي إياس، حدثنا شعبة، عن قتادة، عن أنس بن مالك رضى الله عنه، قال:"لما أراد النبي صلى الله عليه وسلم أن يكتب إلى الروم قيل له: إنهم لن يقرءوا كتابك إذا لم يكن مختوما، فاتخذ خاتما من فضة ونقشه محمد رسول الله، فكأنما أنظر إلى بياضه في يده."

ہم سے آدم بن ابی ایاس نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، ان سے قتادہ نے، اور ان سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روم (کے بادشاہ) کو خط لکھوانا چاہا تو آپ سے کہا گیا کہ وہ بغیر مہر کے خط کو نہیں پڑھیں گے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی، جس پر محمد رسول اللہ کندہ کرایا۔

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گویا میں ابھی بھی اس کی سفیدی آپ ﷺ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کے لیے مختلف صحابہ کرام کو مختلف قبائل اور حکمرانوں کی طرف بھیجا۔اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغامِ الٰہی پہنچانے کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے۔ایک مؤثر ذریعہ وہ خطوط تھے جو آپ ﷺ نے بادشاہوں اور سربراہوں کو بھیجے، جن میں انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔

مکاتیبِ نبی محترم حضرت محمد مصطفی ﷺ کے بارے میں کئی احادیث ملتی ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

(مرفوع) حدثنا إسماعيل بن عبد الله، قال: حدثني إبراهيم بن سعد، عن صالح، عن ابن شهاب، عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود، ان عبد الله بن عباس اخبره،" ان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث بكتابه رجلا وامره ان يدفعه إلى عظيم البحرين، فدفعه عظيم البحرين إلى كسرى، فلما قراه مزقه، فحسبت ان ابن المسيب، قال: فدعا عليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يمزقوا كل ممزق".

(صحیح بخاری حدیث نمبر ۶۴)

اسماعیل بن عبداللہ نے ہم سے بیان کیا،ان سے ابراہیم بن سعد نے صالح کے واسطے سے روایت کی،انھوں نے ابن شہاب سے،انھوں نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ان سے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک شخص کو اپنا ایک خط دے کر بھیجا اور اسے یہ حکم دیا کہ اسے حاکم بحرین کے پاس لے جائے۔ بحرین کے حاکم نے وہ خط کسریٰ (شاہ ایران) کے پاس بھیج دیا۔ جس وقت اس نے وہ خط پڑھا تو چاک کر ڈالا (راوی کہتے ہیں) اور میرا خیال ہے کہ ابن مسیب نے (اس کے بعد) مجھ سے کہا کہ (اس واقعہ کو سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایران کے لیے بددعا کی کہ وہ (بھی چاک شدہ خط کی طرح) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

(مرفوع) حدثنا إسحاق، اخبرنا يعقوب بن إبراهيم، حدثنا ابن اخي ابن شهاب، عن عمه، قال: اخبرني عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود، ان عبد الله بن عباس رضي الله عنهما، اخبره ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كتب إلى قيصر، وقال: "فإن توليت، فإن عليك إثم الاريسيين".

(صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۹۳۶)

ہم سے اسحاق بن منصور نے بیان کیا، کہا ہم کو یعقوب بن ابراہیم نے خبر دی، کہا مجھے میرے بھتیجے ابن شہاب نے خبر دی، ان سے ان کے چچا نے بیان کیا، انھیں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (روم کے بادشاہ) قیصر کو (خط) لکھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تم نے (اسلام کی دعوت سے) منہ موڑا تو (اپنے گناہ کے ساتھ) ان کاشتکاروں کا بھی گناہ تم پر پڑے گا (جن پر تم حکمرانی کر رہے ہو)۔

(مرفوع) حدثنا عبد الله بن يوسف، حدثنا الليث، قال: حدثني عقيل عن ابن شهاب، قال: اخبرني عبيد الله بن عبد الله بن عتبة، ان عبد

الله بن عباس اخبره، ان رسول الله صلى الله عليه وسلم " بعث بكتابه إلى كسرى، فامره ان يدفعه إلى عظيم البحرين يدفعه عظيم البحرين إلى كسرى، فلما قراه كسرى حرقه، فحسبت ان سعيد بن المسيب، قال: فدعا عليهم النبي صلى الله عليه وسلم ان يمزقوا كل ممزق".

(صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۹۳۹)

ہم سے عبداللہ بن یوسف نے بیان کیا، کہا ہم سے لیث نے بیان کیا، کہا مجھ سے عقیل نے بیان کیا، ان سے ابن شہاب نے کہا کہ مجھے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے خبر دی اور انھیں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خط کسریٰ کے پاس بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایلچی سے) یہ فرمایا تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کو بحرین کے گورنر کو دے دیں، بحرین کا گورنر اسے کسریٰ کے دربار میں پہنچادے گا۔

جب کسریٰ نے مکتوب مبارک پڑھا تو اسے اس نے پھاڑ ڈالا۔ مجھے یاد ہے کہ سعید بن مسیب نے بیان کیا تھا کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بددعا کی تھی کہ وہ بھی پارہ پارہ ہو جائے (چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔

(مرفوع) حدثنا ابو اليمان، اخبرنا شعيب، عن الزهري، قال: اخبرني عبيد الله بن عبد الله ان ابن عباس رضي الله عنهما، اخبره ان ابا سفيان، اخبره: " ان هرقل ارسل إليه وهم بإيلياء، ثم دعا بكتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما فرغ من قراءة الكتاب كثر عنده الصخب، فارتفعت

الاصوات واخرجنا، فقلت: لاصحابي حين اخرجنا لقد امر امر ابن ابي كبشة إنه يخافه ملك بني الاصفر "(صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۹۷۸).

ہم سے ابوالیمان نے بیان کیا، کہا ہم کو شعیب نے خبر دی، ان سے زہری نے بیان کیا کہ مجھے عبید اللہ بن عبد اللہ نے، انھیں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی اور انھیں ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک جب شاہ روم ہرقل کو ملا تو) اس نے اپنا آدمی انھیں تلاش کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ اس وقت ایلیاء میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آخر (طویل گفتگو کے بعد) اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک منگوایا۔ جب وہ پڑھا جا چکا تو اس کے دربار میں ہنگامہ برپا ہو گیا (چاروں طرف سے) آواز بلند ہونے لگی۔ اور ہمیں باہر نکال دیا گیا۔ جب ہم باہر کر دیے گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ (مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) کا معاملہ تو اب بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ یہ ملک بنی اصفر (قیصر روم) بھی ان سے ڈرنے لگا ہے۔

(مرفوع) حدثنا إسحاق، حدثنا يعقوب بن إبراهيم، حدثنا ابي، عن صالح، عن ابن شهاب، قال: اخبرني عبيد الله بن عبد الله، ان ابن عباس اخبره: " ان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث بكتابه إلى كسرى مع عبد الله بن حذافة السهمي، فامره ان يدفعه إلى عظيم البحرين، فدفعه عظيم البحرين إلى كسرى، فلما قراه مزقه، فحسبت ان ابن المسيب، قال: فدعا عليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يمزقوا كل ممزق".

(صحیح بخاری حدیث ۴۴۲۴)

ہم سے اسحاق بن رباح نے بیان کیا، انھوں نے کہا ہم سے یعقوب بن ابراہیم نے بیان کیا، ان سے ان کے والد (ابراہیم بن سعد) نے بیان کیا، ان سے صالح بن کیسان نے، ان سے ابن شہاب نے بیان کیا، انھیں عبیداللہ بن عبداللہ نے خبر دی اور انھیں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (شاہ فارس) کسریٰ کے پاس اپنا خط عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کو دے کر بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ یہ خط بحرین کے گورنر کو دے دیں (جو کسریٰ کا عالم تھا) کسریٰ نے جب آپ کا خط مبارک پڑھا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ میرا خیال ہے کہ ابن مسیب نے بیان کیا کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے بد دعا کی کہ وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

(مرفوع) حدثنا محمد بن مقاتل ابو الحسن، اخبرنا عبد الله، اخبرنا يونس، عن الزهري، قال: اخبرني عبيد الله بن عبد الله بن عتبة، ان ابن عباس، اخبره، ان ابا سفيان بن حرب، اخبره، ان هرقل ارسل إليه في نفر من قريش وكانوا تجارا بالشام، فاتوه فذكر الحديث، قال: ثم دعا بكتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فقرئ، فإذا فيه: " بسم الله الرحمن الرحيم من محمد عبد الله ورسوله إلى هرقل عظيم الروم السلام على من اتبع الهدى اما بعد". (صحیح بخاری حدیث نمبر ۶۲۶۰)

ہم سے محمد بن مقاتل ابوالحسن نے بیان کیا انھوں نے کہا ہم کو عبداللہ نے خبر دی انھوں نے کہا ہم کو یونس نے خبر دی اور ان سے زہری نے بیان کیا انھیں عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے خبر دی انھیں عبداللہ بن عباس

رضی اللہ عنہما نے خبر دی اور انھیں ابو سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ ہر قل نے قریش کے چند افراد کے ساتھ انھیں بھی بلا بھیجا یہ لوگ شام تجارت کی غرض سے گئے تھے سب لوگ ہر قل کے پاس آئے پھر انھوں نے واقعہ بیان کیا کہ پھر ہر قل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط منگوایا اور وہ پڑھا گیا خط میں یہ لکھا ہوا تھا۔

بسم الله الرحمن الرحيم،

محمد کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ ہر قل عظیم روم کی طرف، سلام ہو ان پر جنھوں نے ہدایت کی اتباع کی۔ اما بعد!

وقال ابن عباس: اخبرني ابو سفيان بن حرب، ان هرقل دعا ترجمانه، ثم دعا بكتاب النبي صلى الله عليه وسلم، فقراه: بسم الله الرحمن الرحيم من محمد عبد الله ورسوله إلى هرقل ويا اهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم الآية.

(صحیح بخاری حدیث نمبر ۷۵۴۱)

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ مجھے ابو سفیان بن حرب نے خبر دی کہ ہر قل نے اپنے ترجمان کو بلایا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط منگوایا اور اسے پڑھا۔ شروع اللہ کے نام سے جو بہت نہایت رحم کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہر قل کی جانب۔ پھر یہ آیت لکھی تھی یا أهل

الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم کہ اے کتاب والو! اس بات پر آ جاؤ جو ہم میں تم میں یکساں مانی جاتی ہے۔۔۔" آخر آیت تک۔

صحیح مسلم میں بھی اس حوالے سے حدیث ملتی ہے
(بَاب كِتَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى هِرَقْلَ يَدْعُوهُ إِلَى الإِسْلاَمِ)۔
جس میں ہرقل کے نام خط اور وہاں ابوسفیان سے اس کی گفتگو کا ذکر ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب رسولِ اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی میں تفصیل سے ان خطوط کا ذکر کیا ہے[59]۔ وہ لکھتے ہیں؛

"تاریخ نے ایسے کوئی دو اڑھائی سو خط محفوظ کیے ہیں جو آنحضرت ﷺ نے مختلف قبائلی شیوخ، صوبہ جاتی افسروں اور ہمسایہ حکمرانوں کے نام تحریر فرمائے تھے۔ جو شخص پورے جزیرہ نمائے عرب کا حکمران بن چکا ہو۔ اس کے لیے یہ تعداد کوئی بڑی نہیں ہے"۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس موضوع پر کئی مضامین لکھے ہیں، جن میں نبی محترم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مختلف خطوط کے عکس بھی شامل ہیں۔ رحیق المختوم

---

[59] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت کراچی ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۲۶، اس کے علاوہ اسی نام سے ایک دوسری کتاب بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، عبداللہ اکیڈیمی، ۲۰۱۶ء"۔ دونوں میں کئی مضمون مشترک ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف بھی ہیں۔ دونوں میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین ہی ہیں۔ میں نے دارالاشاعت کی کتاب کو زیادہ مفصل پایا ہے۔

میں بھی ان مبارک خطوط کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، اور آٹھ خطوط کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے، جو درج ذیل حکمرانوں کے نام بھیجے گئے تھے:

نجاشی (بادشاہِ حبشہ)، مقوقس (مصر کا والی)، خسرو پرویز (فارس کا شہنشاہ)، قیصر روم (روم کا بادشاہ)، ہوزہ بن علی (صاحبِ یمامہ)، حارث بن ابی شمر الغسانی، عمان کے بادشاہ، یمامہ کے گورنر، حوثی بن علی۔

سیرت النبی ﷺ میں بھی ان خطوط کے بارے میں تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> صلح حدیبیہ کے بعد، جب کسی قدر اطمینان نصیب ہوا، تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام پوری دنیا تک پہنچایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا: اے لوگو! خدا نے مجھے تمام دنیا کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو! حوارینِ عیسیٰؑ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ، میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو۔

اس کے بعد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم، شہنشاہِ فارس، مصر کے مقوقس اور دیگر عرب و غیر عرب حکمرانوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ اسی کتاب میں ان چھ صحابہؓ کے نام بھی درج ہیں، جو مختلف بادشاہوں کے دربار میں یہ خطوط لے کر گئے۔

خطوط کی تعداد اور ان کا اثر

ان خطوط کی کل تعداد کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ ان میں کیا لکھا گیا، کن کے ذریعے بھیجے گئے، اور ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے، میرے لیے اس پر تفصیلی بحث ناممکن ہے۔ تاہم، اس تحریر کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ صلح

حدیبیہ کے بعد، آپ ﷺ نے جزیرۃ العرب سے باہر کی بڑی اور چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں سے سفارتی تعلقات استوار کیے اور انھیں انتہائی حکمت و دانائی کے ساتھ اسلام کی دعوت دی۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ خطوط ایک ہی وقت میں نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد، چھ ہجری کے آخر میں ان کی ترسیل کا آغاز ہوا۔ اس وقت عرب میں امن قائم ہو چکا تھا، اور اہلِ عرب نے مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک مستحکم حکومت کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ ان خطوط سے آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور سفارت کاری ظاہر ہوتی ہے کہ جیسے ہی موقع میسر آیا، آپ ﷺ نے اس وقت کے کئی بڑے بادشاہوں اور حکمرانوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے خطوط کا سہارا لیا۔ ان خطوط کے نتیجے میں:

- ❖ کچھ لوگ ایمان لے آئے۔
- ❖ کچھ حکمران نرمی اور عزت سے پیش آئے۔
- ❖ جبکہ کچھ نے سختی برتی اور بعض نے خطوط پھاڑ ڈالے
- ❖ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خطوط کے ذریعے مدینہ کی اسلامی ریاست کا تعارف ایک باقاعدہ حکومت کے طور پر ہوا، جو اس وقت کے بڑے بادشاہوں کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

یہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک انتہائی اہم اور کامیاب باب تھا۔ مدینہ کی ریاست جو ابتدا میں ایک چھوٹی سی حکومت تھی، اب اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ وہ روم اور ایران جیسے طاقتور حکمرانوں کے درباروں تک اپنے سفیر بھیج رہی تھی اور خط لکھ رہی تھی۔ اس سفارتی حکمتِ عملی کا مسلمانوں کو بعد میں بے حد فائدہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کو بھیجے گئے یہ

خطوط اسلام کی ابتدائی تبلیغ اور سفارتی تعلقات کے قیام میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ان خطوط کے ذریعے:

پرامن بقائے باہمی کا پیغام دیا گیا

- ❖ توحیداور اخلاقیات کی دعوت دی گئی
- ❖ اسلام کی تبلیغ کو ایک منظم سفارتی شکل دی گئی
- ❖ یہ خطوط نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ بین الاقوامی سفارت کاری کے تناظر میں بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ آج بھی، ان خطوط سے ہمیں دعوتِ دین کے حکیمانہ اصول اور بین الاقوامی تعلقات میں نرمی، حکمت اور حسنِ سلوک کے عملی نمونے ملتے ہیں۔

خطوط: آپ ﷺ کی سفارتی مہارت کا ایک منہ بولتا ثبوت

جو خطوط آپ ﷺ نے لکھے ان کے مطالعے سے ہمیں پیغمبر اسلام ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے کئی اہم پہلو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان تمام خطوط میں:

کسی بھی جگہ جنگ کی دھمکی نہیں دی گئی

- ❖ تمام خطوط میں عزت وو قار، نرمی اور حکمت کا عنصر نمایاں ہے
- ❖ زیادہ تر خطوط کے الفاظ میں ہمدردی اور خیر خواہی جھلکتی ہے
- ❖ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط کو محض تاریخی دستاویزات نہیں، بلکہ دعوت و سفارت کاری کے عظیم اصولوں پر مبنی شاہکار کہا جاسکتا ہے، جن سے آج بھی بین الاقوامی تعلقات، سفارت کاری، اور تبلیغِ دین کے لیے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔آپ ﷺ کے بھیجے گئے خطوط سے ان کی خارجہ پالیسی اور

سفارت کاری کے کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ درج ذیل نکات ان خطوط کے ذریعے واضح ہونے والے چند اہم اصولوں کو بیان کرتے ہیں:

حکمرانوں کی خود مختاری کا احترام: آپ ﷺ نے کسی بھی خط میں کسی بادشاہ یا سربراہ کے اقتدار یا حکمرانی کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں لکھی جو ان کے اقتدار کے لیے خطرہ ہو۔

دعوتِ اسلام کا پیغام: تمام خطوط میں بنیادی طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی اور ساتھ ہی اس کے روحانی اور عملی فوائد بھی بیان کیے گئے۔

زمانے کے سفارتی آداب کی پاسداری: آپ ﷺ نے اس وقت کے سفارتی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خطوط پر اپنی خاص مہر ثبت کی، تاکہ یہ واضح ہو کہ یہ ایک باقاعدہ ریاست کے سربراہ کی جانب سے بھیجے جا رہے ہیں۔

مدینہ کی ریاست کا پہلا تعارف: ان خطوط کے ذریعے مدینہ کی نوخیز اسلامی ریاست کا پہلی بار عالمی سطح پر تعارف ہوا۔ ان خطوط میں کسی قسم کی دھمکی آمیز زبان استعمال نہیں کی گئی بلکہ ان میں خیر خواہی اور نرمی جھلکتی تھی۔

قابلِ اعتماد سفیروں کا انتخاب: آپ ﷺ نے یہ خطوط اپنے ان قابلِ بھروسہ صحابہ کرامؓ کے ذریعے بھجوائے جو پہلے سے ہی ان ممالک سے کسی نہ کسی سطح پر واقفیت رکھتے تھے۔ عرب تاجر مختلف علاقوں میں سفر کرتے تھے، اور ان میں سے کئی صحابہؓ روم، ایران، مصر، بحرین اور عمان کے حالات سے کسی حد تک آگاہ تھے۔

سیاسی و سماجی معلومات کا حصول: ان خطوط کے ذریعے مدینہ کے سفیروں کو ان ممالک کے سیاسی و سماجی حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یقینی طور پر ان کی اہلِ اقتدار سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، جس سے وہ ان ممالک کی پالیسیوں اور

طرزِ حکمرانی کو سمجھ سکے۔ یہ معلومات بعد میں سفارتی تعلقات استوار کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔

ان خطوط کے ذریعے مسلمانوں کو درج ذیل فوائد حاصل ہوئے:

دعوتِ اسلام کی عالمگیر توسیع: رسول اللہ ﷺ نے ان خطوط کے ذریعے اسلام کی دعوت کو وسیع پیمانے پر پھیلایا، جو کہ بطور نبی آپ ﷺ کی ایک بنیادی ذمہ داری تھی۔

حکمرانوں تک براہِ راست پیغام رسانی: جہاں عام عوام کو اسلام کی دعوت دی گئی، وہیں اس وقت کے بڑے حکمرانوں کو بھی اللہ کے دین کی طرف بلایا گیا۔

مختلف ردِ عمل: ان خطوط پر مختلف بادشاہوں کا ردِ عمل سامنے آیا——کچھ نے ان کا مثبت جواب دیا، کچھ نے انکار کر دیا، اور بعض نے سفیروں کی توہین کی یا خط تک پھاڑ دیا۔

عرب کی بڑھتی ہوئی اہمیت: ان خطوط کے ذریعے اس وقت کی بڑی سلطنتوں کو یہ احساس ہوا کہ جزیرۃ العرب، جسے وہ ماضی میں نظر انداز کرتے آئے تھے، اب ایک سیاسی اور مذہبی قوت کے طور پر ابھر رہا ہے، جو انھیں اسلام کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ ان کے لیے ایک غیر معمولی اور فکر انگیز پیغام تھا۔

ان خطوط کی اہمیت محض دعوتِ اسلام کی حد تک محدود نہیں بلکہ یہ سفارت کاری اور بین الاقوامی تعلقات کی ایک مضبوط بنیاد بھی فراہم کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی میں حکمت، تدبر اور سفارتی آداب کی جھلک نمایاں ہے۔ یہ خطوط ایک طرف اسلام کے پیغام کو عام کرنے کا ذریعہ بنے، اور دوسری طرف مختلف ریاستوں کے ساتھ مدینہ کے تعلقات کے استحکام میں بھی معاون ثابت ہوئے۔ یہی حکمت عملی بعد میں خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی فتوحات اور سفارتی تعلقات کی بنیاد بنی، جس کے نتیجے میں اسلام ایک عالمگیر دین کے طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچا۔

جنگ موتہ: جو فتح مکہ کا سبب بنی

بظاہر جنگ موتہ کا فتح مکہ سے کوئی براہ راست تعلق نظر نہیں آتا، لیکن یہ جنگ ایک ایسے واقعے کی نمائندگی کرتی ہے جس کے بعد مشرکینِ مکہ کے حوصلے بلند ہوئے، اور انھوں نے صلح حدیبیہ کی اہم دفعات کو پامال کیا۔ یہ جنگ کیوں لڑی گئی، اس کے اسباب کیا تھے، اور اس کے کیا نتائج نکلے؟ ان نکات کا مختصر جائزہ لینا نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو بہتر طور پر سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

اس جنگ بارے میں صحیح بخاری کی دو احادیث:

(مرفوع) حدثنا يوسف بن يعقوب الصفار، حدثنا إسماعيل بن علية، عن ايوب، عن حميد بن هلال، عن انس بن مالك رضي الله عنه، قال: خطب النبي صلى الله عليه وسلم، فقال:" اخذ الراية زيد فاصيب، ثم اخذها جعفر فاصيب، ثم اخذها عبد الله بن رواحة فاصيب، ثم اخذها خالد بن الوليد، عن غير إمرة ففتح له، وقال:" ما يسرنا انهم عندنا، قال: ايوب، او قال: ما يسرهم انهم عندنا، وعيناه تذرفان".

(صحیح بخاری حدیث نمبر: ۲۷۹۸)

ہم سے یوسف بن یعقوب صفار نے بیان کیا، کہا ہم سے اسماعیل بن علیہ نے، ان سے ایوب نے، ان سے حمید بن ہلال نے اور ان سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فوج کا جھنڈا اب زید نے اپنے ہاتھ میں لیا اور وہ شہید کر دیے گئے پھر جعفر نے لے لیا اور وہ بھی شہید کر دیے گئے پھر عبداللہ بن رواحہ نے لے لیا اور وہ بھی شہید کر دیے گئے اور اب کسی

ہدایت کا انتظار کئے بغیر خالد بن ولید نے جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ان کے ہاتھ پر اسلامی لشکر کو فتح ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور ہمیں کوئی اس کی خوشی بھی نہیں تھی کہ یہ لوگ جو شہید ہو گئے ہیں ہمارے پاس زندہ رہتے کیونکہ وہ بہت عیش و آرام میں چلے گئے ہیں۔ ایوب نے بیان کیا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا: انھیں کوئی اس کی خوشی بھی نہیں تھی کہ ہمارے ساتھ زندہ رہتے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

(مرفوع) اخبرنا احمد بن ابی بکر , حدثنا مغيرة بن عبد الرحمن، عن عبد الله بن سعيد، عن نافع، عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، قال: امر رسول الله صلى الله عليه وسلم في غزوة مؤتة زيد بن حارثة، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " إن قتل زيد فجعفر، وإن قتل جعفر فعبد الله بن رواحة"، قال عبد الله: كنت فيهم في تلك الغزوة، فالتمسنا جعفر بن ابي طالب فوجدناه في القتلى، ووجدنا ما في جسده بضعا وتسعين من طعنة ورمية. (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۴۲۶۱)

ہمیں احمد بن ابی بکر نے خبر دی ' انھوں نے کہا ہم سے مغیرہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا' ان سے عبداللہ نے بیان کیا' ان سے نافع نے اور ان سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ موتہ کے لشکر کا امیر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو

جعفر امیر ہوں اور اگر جعفر بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ اس غزوہ میں، میں بھی شریک تھا۔ بعد میں جب ہم نے جعفر رضی اللہ عنہ کو تلاش کیا تو ان کی لاش ہمیں شہداء میں ملی اور ان کے جسم پر کچھ اوپر نوے زخم نیزوں اور تیروں کے تھے۔

جنگِ موتہ: سفیر کے ساتھ نامناسب سلوک پر نبی کریم ﷺ کا ردِ عمل

دنیا بھر میں سفیروں کو ایک خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ہاں آنے والے ہر سفیر کی عزت و تکریم فرمائی اور ان کے تحفظ کو یقینی بنایا۔ تاہم، اگر کسی جگہ آپ ﷺ کے سفیر کے ساتھ نامناسب سلوک کیا گیا، تو اس پر آپ ﷺ نے سخت ردِ عمل کا مظاہرہ بھی فرمایا۔ یہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک انتہائی اہم پہلو ہے، جو آج کی دنیا کے لیے بھی قابلِ تقلید سبق رکھتا ہے۔

تاریخ میں سفیروں کی عزت و حوصلہ افزائی ایک مسلمہ حقیقت رہی ہے، اور اس کی خلاف ورزی پر سخت ردِ عمل بھی سامنے آتا رہا ہے۔ آپ ﷺ کے کئی سفیروں کو شہید کر دیا گیا، اور ان مظالم کے جواب میں آپ ﷺ نے کارروائیاں بھی کیں، جن کی تفصیل سیرت کی کتب میں موجود ہے۔ ایسی ہی ایک جنگ جنگِ موتہ تھی، جو آپ ﷺ نے اپنے نامہ بر کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے لڑی۔

حضرت عروہ بن زبیرؒ کے مطابق، جنگِ موتہ کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ آپ ﷺ نے آٹھ ہجری (صلح حدیبیہ کے دو سال بعد) حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو روم کے بادشاہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا، جو شام کے علاقے میں رہتا تھا۔ تاہم،

راستے میں ایک مقامی سردار شرحبیل بن عمرو الغسانی نے آپ ﷺ کے سفیر کو گرفتار کرکے شہید کر دیا۔ جب یہ خبر آپ ﷺ تک پہنچی، تو آپ ﷺ نے اس کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور ایک لشکر شام کی طرف روانہ کیا۔ یہ لشکر تین ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا، اور اس کی سربراہی حضرت زید بن حارثہؓ کو سونپی گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ شہید ہو جائیں، تو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ قیادت سنبھالیں گے، اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں، تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ امیر ہوں گے۔

ایک عرب عالم نے اس موضوع پر جنگِ موتہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے[60]۔ بیشتر علما نے اسے جنگِ موتہ کا نام دیا، لیکن اس کتاب میں اسے غزوہ موتہ لکھا گیا ہے۔ ممکنہ طور پر اس کی وجہ یہ ہو کہ جب یہ جنگ ہو رہی تھی، تو نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں موجود ہونے کے باوجود اللہ کے حکم سے اس کا احوال صحابہ کو بیان فرمارہے تھے۔ وَاللہُ اَعلَمُ بِالصّواب۔

رحیق المختوم میں اس جنگ کی وجوہات کچھ یوں بیان کی گئی ہیں (بحوالہ زاد المعاد اور فتح الباری)۔

جنگِ موتہ کا پس منظر

موتہ اردن کے علاقے بلقاء کے قریب ایک بستی کا نام ہے، جو بیت المقدس سے مناسب فاصلے پر واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ عظیم معرکہ پیش آیا۔ یہ جنگ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مسلمانوں کو درپیش سب سے خونریز معرکہ تھا، اور بعد میں عیسائی ممالک کی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کا وقوع جمادی الاولیٰ ۸ ہجری (مطابق اگست یا ستمبر ۶۲۹ء) میں ہوا۔

---

[60] غزوہ موتہ، محمد احمد باشمیل، ترجمہ مولانا اختر فتح پوری، نفیس اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۸۶ء

جنگ کا سبب یہ بنا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ (حضرت عروہ بن زبیرؓ نے انھیں الحرث بن عمیر ازری لکھا ہے) کو اپنا سفیر بنا کر حاکمِ بُصریٰ کے پاس روانہ کیا۔ لیکن قیصرِ روم کے گورنر شرحبیل بن عمرو غسانی (جو بلقاء کے علاقے کا نگران تھا) نے انھیں گرفتار کر کے نہایت بے رحمی سے شہید کر دیا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سفیروں اور قاصدوں کا قتل ایک نہایت سنگین جرم تصور کیا جاتا تھا، جو عملاً اعلانِ جنگ کے مترادف بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ جب یہ خبر نبی کریم ﷺ تک پہنچی، تو آپ ﷺ نے اس واقعے کو انتہائی سنگین قرار دیا اور فیصلہ کیا کہ غسانی علاقے پر فوج کشی کی جائے۔ چنانچہ، آپ ﷺ نے تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک لشکر تیار فرمایا۔ یہ اس وقت تک کا سب سے بڑا اسلامی لشکر تھا، جو جنگِ احزاب کے سوا کسی اور معرکے میں اس تعداد تک نہیں پہنچا تھا۔

جنگِ موتہ اور اس کے حالات

جنگِ موتہ کی تفصیلات سیرت کی مختلف کتابوں میں ملتی ہیں، لیکن یہ میرے مقالے کے دائرہ کار میں شامل نہیں۔ یہاں میرا مقصد ان مشکل ترین حالات کا جائزہ لینا ہے، جن میں نبی کریم ﷺ نے تین ہزار صحابہ کرامؓ پر مشتمل ایک لشکر مدینہ منورہ سے تقریباً ایک ہزار کلو میٹر دور ایسے علاقے میں روانہ کیا، جہاں عیسائی حکمران موجود تھے۔ یہ وہی حکمران تھے جو اسلام کے سخت دشمن تھے اور جنھوں نے آپؐ کے ایلچی کو بے دردی سے شہید کیا تھا۔ یہ واضح تھا کہ مسلمانوں کو ایک سخت دشمن کا سامنا تھا۔ مزید برآں، شام کی اس سرحد کے قریب کوئی ایسا قبیلہ موجود نہیں تھا جسے مسلمانوں کا حلیف کہا جا سکے۔ یہ بھی پہلی بار تھا کہ مسلمان کسی غیر ملکی طاقت، وہ بھی رومی سلطنت جیسی سپر پاور کے خلاف برسرِ پیکار ہونے جا رہے تھے، جس کی فوج اپنے وقت کی منظم اور تربیت یافتہ فوجوں میں شمار ہوتی تھی۔

جغرافیائی معلومات اور پس منظر

ابنِ ہشام کی سیرت النبی ﷺ میں جنگِ موتہ کی تفصیلات تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ موتہ، دریائے اردن کے مشرق میں، اردن کے موجودہ شہر کرک کے قریب واقع ہے۔ یہیں مسلمانوں کے تینوں سپہ سالاروں کے مزارات بھی موجود ہیں۔ یہاں پر موتہ یونیورسٹی بھی قائم کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں یہ علاقہ رومی سلطنت کی ایک سرحد سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ رومی یہاں براہِ راست حکمران نہیں تھے، لیکن ان کے حلیف قبائل یہاں اقتدار میں تھے اور مکمل طور پر رومی اثر ورسوخ میں تھے۔

رومی بادشاہ ہرقل نے مسلمانوں کے خلاف ایک لاکھ فوج کے ساتھ جنگ کے میدان میں قدم رکھا۔ ایک طرف تین ہزار مسلمان مجاہدین تھے، جو طویل سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے، اور دوسری طرف ہرقل کی ایک لاکھ کی منظم فوج موجود تھی۔ جنگ کا آغاز ہوا اور شدید لڑائی ہوئی۔ اس معرکے میں مسلمانوں کے تینوں سپہ سالار حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ، اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے لشکر کی کمان سنبھالی۔ یہ جنگ عسکری لحاظ سے رومیوں کے حق میں رہی، کیونکہ مسلمانوں کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا، اور کئی نامور صحابہؓ شہید ہوئے۔ تاہم، حضرت خالد بن ولیدؓ اپنی جنگی مہارت سے باقی لشکر کو محفوظ طریقے سے واپس مدینہ لے آئے۔

جنگِ موتہ پر مشرکینِ مکہ کا ردِ عمل

چونکہ مسلمان یہ جنگ واضح طور پر نہ جیت سکے تھے، اس لیے مشرکینِ مکہ نے یہ سمجھا کہ مسلمان کمزور ہو چکے ہیں۔ اس زعم میں آکر انھوں نے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قبیلہ بنی خزاعہ کے کچھ افراد کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے خاتمے کا سبب بنا، کیونکہ بنی خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے، اور معاہدے کی رو سے

مشرکینِ مکہ ان سے جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں جنگِ موتہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں، کیونکہ سیرت کی کتابوں میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ تاہم، اس مقالے میں اس جنگ کا وہ پہلو اجاگر کیا جائے گا، جس سے نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ سوال اہم ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے سفیر کی شہادت پر اتنا سخت ردِ عمل کیوں دیا؟ اور اس کے پیچھے آپ ﷺ کی سفارتی حکمتِ عملی کیا تھی؟ میرے نزدیک، اس جنگ کے وقت نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اس کے چند نمایاں پہلو درج ذیل ہیں:

1. **بین الاقوامی سطح پر پیغام رسانی:** یہ جنگ صرف رومی سلطنت کے خلاف نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعے آپ ﷺ نے اپنے ارد گرد کے دیگر حکمرانوں کو یہ واضح پیغام دیا کہ آپ ﷺ اپنے سفیر کے قتل کو برداشت نہیں کریں گے اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے طاقتور ترین سلطنت کے خلاف جنگ کا خطرہ بھی مول لے سکتے ہیں۔

2. **ساتھیوں کا حوصلہ بلند کرنا:** یہ پیغام صرف اسلام مخالف قوتوں کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک حوصلہ افزا علامت تھی۔ اس سے صحابہ کرامؓ کو یہ اعتماد ملا کہ نبی کریم ﷺ اپنے ساتھیوں کی حفاظت اور عزت کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

3. **پہلی بار کسی غیر عرب طاقت کے خلاف جنگ:** جنگِ موتہ سے قبل، مسلمانوں نے جتنی بھی جنگیں لڑی تھیں، وہ زیادہ تر غیر مسلم عرب قبائل کے خلاف تھیں۔ زیادہ تر معرکے مشرکینِ مکہ کے ساتھ ہوئے، جو خود نبی کریم ﷺ کے خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم، یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ مسلمانوں نے کسی غیر عرب اور بین الاقوامی طاقت—وہ بھی رومی سلطنت—کے خلاف جنگ لڑی۔

4. رومیوں کے خلاف پہلا عسکری تجربہ: یہ جنگ مسلمانوں کے لیے رومیوں کے خلاف پہلا عسکری تجربہ ثابت ہوئی۔ مسلمانوں نے رومی فوج کی جنگی حکمتِ عملی کو قریب سے دیکھا اور اس خطے کی جغرافیائی صورتِ حال کو سمجھا۔ بعد میں اسلامی فتوحات میں یہ تجربہ انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔

5. عربوں کے دلوں سے رومیوں کی ہیبت کم ہونا: رومی سلطنت اس وقت کی سپر پاور تھی اور عرب قبائل اس کی عسکری طاقت سے خوفزدہ رہتے تھے۔ جنگِ موتہ کے بعد عربوں کے دل سے رومیوں کی ہیبت کسی حد تک کم ہو گئی، کیونکہ پہلی بار کسی نے ان کے عظیم لشکر کو للکارا اور پھر محفوظ طریقے سے واپسی بھی ممکن ہوئی۔

6. اسلام کی طاقت کا تعارف بلادِ شام و اردن میں: یہ پہلی اسلامی فوج تھی جو مدینہ سے اتنی دور جا کر ایک اجنبی سرزمین میں لڑی۔ اس جنگ کے نتیجے میں، بلادِ شام و اردن اور گرد و نواح میں بسنے والے لوگوں نے مسلمانوں کی طاقت کو تسلیم کرنا شروع کیا، جو بعد میں اسلامی فتوحات کے لیے ایک اہم پیش رفت ثابت ہوئی۔

7. صلح حدیبیہ کا خاتمہ اور فتح مکہ کی راہ ہموار ہونا: اگرچہ جنگِ موتہ میں مسلمانوں کو ان کے منصوبے کے مطابق کامیابی نہیں ملی، لیکن اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کو کمزور سمجھتے ہوئے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کی۔ اس کے نتیجے میں یہ معاہدہ ختم ہو گیا اور نبی کریم ﷺ نے مکہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگِ موتہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی جنگیں مشرکینِ مکہ اور یہودی قبائل تک محدود نہیں رہیں، بلکہ اب وہ ایک عالمی طاقت — رومی سلطنت — کے خلاف صف آرا ہو

چکے تھے۔ اس جنگ سے جزیرۃ العرب میں یہ بات واضح ہو گئی کہ مسلمان ایک مضبوط قوت ہیں اور وہ رومیوں سے بھی ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہی جنگ اسلامی ریاست اور رومی سلطنت کے درمیان کشمکش کی ابتدا ثابت ہوئی، جو بعد میں اسلامی فتوحات کی بنیاد بنی اور رومی سلطنت کے کئی علاقے مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گئے۔

***

فتح مکہ معظمہ

اسلام کے جزیرۃ العرب پر مکمل غلبے کی ابتداء

فتح مکہ سے قبل کی صورتِ حال

اس سے پہلے کہ میں فتح مکہ کے بارے میں کچھ بیان کروں، میں اس پس منظر کا ذکر کرنا چاہوں گا جس کے تحت نبی کریم ﷺ نے مکہ معظمہ پر لشکر کشی کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ صلح حدیبیہ کے معاہدے کے مطابق مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان دس سال تک جنگ نہیں ہونی تھی۔ اس حوالے سے سیرت کی متعدد کتب میں تفصیل موجود ہے، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی اور اس کے نتائج

فتح مکہ کا واقعہ آٹھ ہجری میں پیش آیا، جس کی بنیادی وجہ صلح حدیبیہ کا خاتمہ تھا۔ معاہدے کے مطابق، مسلمان اور مشرکینِ مکہ کسی ایسے حلیف کی مدد نہیں کریں گے، جو مخالف فریق کے کسی حلیف سے جنگ کرے۔ مکہ کے قریب بنو بکر اور بنو خزاعہ قبائل رہائش پذیر تھے، جن کے درمیان کئی برسوں سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ صلح حدیبیہ کے تحت، بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف بنے، جبکہ بنو بکر مشرکینِ مکہ کے حلیف رہے۔ لیکن جب ان کے درمیان جھڑپ ہوئی تو مشرکینِ مکہ نے بنو بکر کی ہر طرح سے مدد کی، جو صلح کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ اس خلاف ورزی پر، بنو خزاعہ کا ایک سردار عمرو بن سالم خزاعی، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مدینہ پہنچا۔ اس نے پورا واقعہ بیان کیا اور مدد کی درخواست کی۔ اس کے بعد بنو خزاعہ کے مزید لوگ بھی آپ ﷺ کے

پاس آئے اور اس ظلم کی شکایت کی۔ یہ بات طے تھی کہ ابو سفیان بھی جلد ہی نبی کریم ﷺ کے پاس آکر معاہدے کی تجدید کی درخواست کرے گا۔

ابوسفیان کی ناکام کوشش اور فتح مکہ کے لیے خفیہ تیاری

مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہو چکا تھا، مگر قریش کے ایک قبیلے نے خود ہی اس معاہدے کو توڑ دیا۔ جب قریش کو اپنی غلطی اور اس معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا، تو انھوں نے اپنے سردار ابو سفیان کو صلح کی تجدید کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔

مدینہ پہنچ کر ابو سفیان نے سفارش کے لیے حضرت علیؓ اور اپنی بیٹی حضرت اُمِّ حبیبہؓ (ام المؤمنین) سے ملاقات کی۔ مگر ان دونوں شخصیات کی طرف سے انھیں کوئی حوصلہ افزائی نہ ملی۔ بہر حال، ابو سفیان نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور صلح کی تجدید کی درخواست کی، مگر نبی کریم ﷺ نے اسے قبول نہ فرمایا۔

ان حالات میں، ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے چہ مگوئیاں کی ہوں کہ قریش کا سردار خود چل کر آیا تھا، صلح کی بھیک مانگ رہا تھا، اور صلح تو بہتر ہی ہوتی ہے —— تو پھر نبی کریم ﷺ نے صلح کیوں نہیں کی؟

صلح کی تجدید کیوں نہ کی گئی؟

نبی کریم ﷺ کو بخوبی علم تھا کہ اب مشرکین میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اگر اس موقع پر معاہدے کی تجدید کی جاتی، تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کفر اور شرک کو اپنی مذموم سرگرمیوں کے لیے ایک بار پھر کھلی چھوٹ دے دی جائے۔ لٰہذا، نبی کریم ﷺ نے معاہدے کی تجدید کو مسترد کر دیا، اور فتح مکہ کی تیاری شروع کر دی۔ نبی کریم ﷺ نے انتہائی رازداری کے ساتھ جنگ کی تیاری کی،

اور سوائے چند قریبی ساتھیوں کے کسی کو اس کا علم نہ ہونے دیا۔ اس دوران کئی اہم واقعات پیش آئے، جن کا ذکر سیرت کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔

ابو سفیان مایوس ہو کر مکہ واپس چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس خلاف ورزی کے نتیجے میں نبی کریم ﷺ مکہ پر حملہ کر دیں گے۔ اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا تو وہ مکہ واپس جا کر جنگ کی تیاری ضرور کرواتا۔ یہی بات اس وقت ثابت ہو گئی جب اس نے مکہ کے قریب ایک عظیم الشان لشکر دیکھا، اور اسے یقین نہیں آیا کہ یہ مسلمانوں کی فوج ہے۔

لشکر کی روانگی اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ

نبی کریم ﷺ نے آٹھ ہجری کے ماہِ رمضان میں دس ہزار کے عظیم لشکر کے ساتھ مکہ کی جانب پیش قدمی کی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ تین سال قبل، جنگِ خندق (پانچ ہجری) میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ جنگِ احد میں سات سو صحابہ کرامؓ تھے۔ جنگِ بدر میں صرف تین سو کے قریب مجاہدین شامل تھے، لیکن فتح مکہ کے موقع پر لشکر کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا اور مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔

فتح مکہ کی تفصیلات صحیح بخاری اور دیگر احادیث کی کتب میں موجود ہیں۔ اس واقعے کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی کیا گیا ہے، جو اس کی تاریخی اور دینی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (سورۃ التوبہ ۹:۷)

اِن مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔بجز اُن لوگوں کے جن سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا، تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے

اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر ڈاکٹر اسرار احمد نے کچھ یوں کی ہے؛

فتح مکہ سے قبل صورت حال ایسی تھی کہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں بہت سے لوگ تذبذب اور الجھن کا شکار تھے۔ بعض مسلمانوں کے بیوی بچے اور بہت سے کمزور مسلمان جو ہجرت نہیں کر پائے تھے' ابھی تک مکہ میں پھنسے ہوئے تھے۔اکثر لوگوں کو خدشہ تھا کہ اگر مکہ پر حملہ ہوا تو بہت خون خرابہ ہوگا اور مکہ میں موجود تمام مسلمان اس کی زد میں آجائیں گے۔اگرچہ بعد میں بالفعل جنگ کی نوبت نہ آئی مگر مختلف ذہنوں میں ایسے اندیشے بہر حال موجود تھے۔ اس سلسلے میں زیادہ بے چینی منافقین نے پھیلائی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان آیات میں مسلمانوں کو مکہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جارہا ہے۔

اسی طرح جب آپ ﷺ مکہ معظمہ کے قریب پہنچے تو کیا اہم واقعات پیش آئے اس بارے میں صحیح بخاری کی حدیث سے تفصیل ملتی ہے:

(مرفوع) حدثنا عبيد بن إسماعيل، حدثنا ابو اسامة، عن هشام، عن ابيه، قال:" لما سار رسول الله صلى الله عليه وسلم عام الفتح، فبلغ ذلك قريشا، خرج ابو سفيان بن حرب، وحكيم بن حزام، وبديل بن ورقاء يلتمسون الخبر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، فاقبلوا يسيرون حتى

اتوا مر الظهران، فإذا هم بنيران كأنها نيران عرفة، فقال ابو سفيان: ما هذه لكأنها نيران عرفة؟ فقال بديل بن ورقاء: نيران بني عمرو، فقال ابو سفيان: عمرو اقل من ذلك، فرآهم ناس من حرس رسول الله صلى الله عليه وسلم، فادركوهم، فاخذوهم، فاتوا بهم رسول الله صلى الله عليه وسلم، فاسلم ابو سفيان، فلما سار، قال للعباس:" احبس ابا سفيان عند حطم الخيل حتى ينظر إلى المسلمين"، فحبسه العباس، فجعلت القبائل تمر مع النبي صلى الله عليه وسلم تمر كتيبة كتيبة على ابي سفيان، فمرت كتيبة، قال: يا عباس من هذه؟ قال: هذه غفار، قال: ما لي ولغفار؟ ثم مرت جهينة، قال مثل ذلك، ثم مرت سعد بن هذيم، فقال مثل ذلك، ومرت سليم، فقال مثل ذلك، حتى اقبلت كتيبة لم ير مثلها، قال: من هذه؟ قال: هؤلاء الانصار عليهم سعد بن عبادة معه الراية، فقال سعد بن عبادة: يا ابا سفيان، اليوم يوم الملحمة، اليوم تستحل الكعبة، فقال ابو سفيان: يا عباس، حبذا يوم الذمار، ثم جاءت كتيبة وهي اقل الكتائب فيهم رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه وراية النبي صلى الله عليه وسلم مع الزبير بن العوام، فلما مر رسول الله صلى الله عليه وسلم بابي سفيان، قال: الم تعلم ما قال سعد بن عبادة؟ قال:" ما قال؟" قال: كذا وكذا، فقال:" كذب سعد، ولكن هذا يوم يعظم الله فيه الكعبة، ويوم تكسى فيه الكعبة"، قال: وامر رسول الله صلى الله عليه وسلم ان تركز رايته بالحجون، قال عروة: واخبرني نافع بن جبير بن مطعم، قال: سمعت العباس، يقول للزبير بن العوام: يا ابا عبد الله، ها هنا امرك رسول الله صلى الله عليه وسلم ان تركز الراية، قال: وامر رسول الله صلى الله عليه وسلم يومئذ خالد بن الوليد ان يدخل من اعلى مكة من كداء،

ودخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کدا، فقتل من خیل خالد بن الولید رضی اللہ عنہ یومئذ رجلان: حبیش بن الاشعر، و کرز بن جابر الفهری.

(حدیث نمبر ۴۲۸۰)

ہم سے عبید بن اسماعیل نے بیان کیا' کہا ہم سے ابواسامہ نے بیان کیا' ان سے ہشام بن عروہ نے' ان سے ان کے والد نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے تو قریش کو اس کی خبر مل گئی تھی۔، چنانچہ ابوسفیان بن حرب' حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں میں معلومات کے لیے مکہ سے نکلے۔ یہ لوگ چلتے چلتے مقام مرالظہران پر جب پہنچے تو انھیں جگہ جگہ آگ جلتی ہوئی دکھائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مقام عرفات کی آگ ہے۔ ابوسفیان نے کہا یہ آگ کیسی ہے؟ یہ عرفات کی آگ کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس پر بدیل بن ورقاء نے کہا کہ یہ بنی عمرو (یعنی قباء کے قبیلے) کی آگ ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ بنی عمرو کی تعداد اس سے بہت کم ہے۔ اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ دستے نے انھیں دیکھ لیا اور ان کو پکڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے' پھر ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگے (مکہ کی طرف) بڑھے تو عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ پر روکے رکھو جہاں گھوڑوں کا جاتے وقت ہجوم ہو تاکہ وہ مسلمانوں کی فوجی قوت کو دیکھ لیں۔ چنانچہ عباس رضی اللہ عنہ انھیں ایسے

ہی مقام پر روک کر کھڑے ہو گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قبائل کے دستے ایک ایک کر کے ابو سفیان کے سامنے سے گزرنے لگے۔ایک دستہ گزرا تو انھوں نے پوچھا: عباس! یہ کون ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ یہ قبیلہ غفار ہے۔ابو سفیان نے کہا کہ مجھے غفار سے کیا سروکار' پھر قبیلہ جہینہ گزرا تو ان کے متعلق بھی انھوں نے یہی کہا' قبیلہ سلیم گزرا تو ان کے متعلق بھی یہی کہا۔ آخر ایک دستہ سامنے آیا۔اس جیسا فوجی دستہ نہیں دیکھا گیا ہو گا۔ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ انصار کا دستہ ہے۔سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اس کے امیر ہیں اور انھیں کے ہاتھ میں (انصار کا عَلم ہے) سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ابو سفیان! آج کا دن قتل عام کا دن ہے۔آج کعبہ میں بھی لڑنا درست کر دیا گیا ہے۔ابو سفیان رضی اللہ عنہ اس پر بولے: اے عباس! قریش کی ہلاکت و بربادی کا دن اچھا آلگا ہے۔پھر ایک اور دستہ آیا یہ سب سے چھوٹا دستہ تھا۔اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عَلم زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اٹھائے ہوئے تھے۔جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابو سفیان کے قریب سے گزرے تو انھوں نے کہا آپ کو معلوم نہیں، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کیا کہہ گئے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ انھوں نے کیا کہا ہے؟ تو ابو سفیان نے بتایا کہ یہ یہ کہہ گئے ہیں کہ آپ قریش کا کام تمام کر دیں گے۔(سب کو قتل کر ڈالیں

گے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد نے غلط کہا ہے بلکہ آج کا دن وہ ہے جس میں اللہ کعبہ کی عظمت اور زیادہ کر دے گا۔ آج کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔ عروہ نے بیان کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ آپ کا علم مقام حجون میں گاڑ دیا جائے۔ عروہ نے بیان کیا اور مجھے نافع بن جبیر بن مطعم نے خبر دی، کہا کہ میں نے عباس رضی اللہ عنہ سے سنا، انھوں نے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے کہا (فتح مکہ کے بعد) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہیں جھنڈا گاڑنے کے لیے حکم فرمایا تھا۔ راوی نے بیان کیا کہ اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ مکہ کے بالائی علاقہ کداء کی طرف سے داخل ہوں اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کداء (نشیبی علاقہ) کی طرف سے داخل ہوئے۔ اس دن خالد رضی اللہ عنہ کے دستے کے دو صحابی، حبیش بن اشعر اور کرز بن جابر فہری شہید ہوئے تھے۔

پچھلے صفحات میں فتح مکہ معظمہ سے قبل اور اس دوران پیش آنے والے واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ جو عظیم الشان سلوک کیا، اس کی نہ تو تاریخ میں کوئی مثال ملتی ہے اور نہ ہی بعد میں ایسی کوئی نظیر قائم ہوئی۔

سیرت النبی ﷺ ابن ہشام، حضرت عروہ بن زبیرؓ اور دیگر سیرت کی کتب میں فتح مکہ کے واقعات تفصیل سے مذکور ہیں۔ اسی طرح، قرآنِ مجید میں بھی فتح مکہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۔(الحدید۵۷:۱۰)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

اس آیت کی تشریح سید مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں کچھ یوں کی ہے:

یعنی اجر کے مستحق تو دونوں ہی ہیں، لیکن ایک گروہ کا رتبہ دوسرے گروہ سے لازماً بلند تر ہے، کیونکہ اس نے زیادہ سخت حالات میں اللہ تعالیٰ کی خاطر وہ خطرات مول لیے جو دوسرے گروہ کو درپیش نہ تھے۔ اس نے ایسی حالت میں مال خرچ کیا جب دور دور کہیں یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ کبھی فتوحات سے اس خرچ کی تلافی ہو جائے گی، اور اس نے ایسے نازک دور میں کفار سے جنگ کی جب ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن غالب آکر اسلام کا نام لینے والوں کو پیس ڈالیں گے۔ مفسرین میں سے مجاہد، قتادہ اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں جس چیز کے لیے لفظ ''فتح'' استعمال

کیا گیا ہے اس کا اطلاق فتح مکہ پر ہوتا ہے، اور عامر شعبی کہتے ہیں کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ پہلے قول کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے، اور دوسرے قول کی تائید میں حضرت ابو سعید خدری کی یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے صلح حدیبیہ کے زمانے میں فرمایا، عنقریب ایسے لوگ آنے والے ہیں جن کے اعمال کو دیکھ کر تم لوگ اپنے اعمال کو حقیر سمجھو گے، مگر **لو کان لاحدھم جبل من ذھب فانفقه ما ادرك مد احدكم ولا نصيفه** ان میں سے کسی کے پاس پہاڑ برابر بھی سونا ہو اور وہ سارا کا سارا خدا کی راہ میں خرچ کر دے تو وہ تمہارے دو رطل بلکہ ایک رطل خرچ کرنے کے برابر بھی نہ پہنچ سکے گا (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابو نعیم اصفہانی)۔ نیز اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد نے حضرت انس سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دوران نزاع میں حضرت خالد نے حضرت عبد الرحمٰن سے کہا: تم لوگ اپنی پچھلی خدمات کی بنا پر ہم سے دوں کی لیتے ہو۔ یہ بات جب نبی ﷺ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم لوگ احد کے برابر، یا پہاڑوں کے برابر سونا بھی خرچ کرو تو ان لوگوں کے اعمال کو نہ پہنچ سکو گے۔ اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے، کیونکہ حضرت خالد اسی صلح کے بعد ایمان لائے تھے اور فتح مکہ میں شریک تھے۔

لیکن اس خاص موقع پر فتح سے مراد خواہ صلح حدیبیہ لی جائے یا فتح مکہ، بہر حال اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درجات کا یہ فرق بس اسی ایک فتح پر ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ اصولاً اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب کبھی اسلام پر ایسا کوئی وقت آجائے جس میں کفر اور کفار کا پلڑا بہت بھاری ہو اور بظاہر اسلام کے غلبے کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے ہوں، اس وقت جو لوگ اسلام کی حمایت میں جانیں لڑائیں اور مال خرچ کریں ان کے مرتبے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو کفر و اسلام کی کشمکش کا فیصلہ اسلام کے حق میں ہو جانے کے بعد قربانیاں دیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ معظمہ میں مصروفیات بارے میں کئی احادیث ملتی ہے۔ جن میں سے صحیح بخاری سے چند احادیث یہاں بیان کر رہا ہوں۔ ان احادیث سے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہترین حسنِ سلوک بارے میں جاننے کو ملے گا۔

(مرفوع) حدثنا إسحاق، حدثنا ابو عاصم، عن ابن جريج، قال: اخبرني حسن بن مسلم، عن مجاهد: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قام يوم الفتح، فقال: " إن الله حرم مكة يوم خلق السموات والارض، فهي حرام بحرام الله إلى يوم القيامة، لم تحل لاحد قبلي ولا تحل لاحد بعدي، ولم تحلل لي قط إلا ساعة من الدهر لا ينفر صيدها، ولا يعضد شوكها، ولا يختلى خلاها، ولا تحل لقطتها إلا لمنشد"، فقال العباس بن عبد المطلب: إلا الإذخر يا رسول الله، فإنه لا بد منه للقين والبيوت، فسكت، ثم قال: " إلا الإذخر، فإنه حلال"، وعن ابن جريج، اخبرني عبد الكريم، عن عكرمة،

عن ابن عباس بمثل هذا او نحو هذا، رواه ابو هريرة، عن النبی صلی الله عليه وسلم (صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۳۱۴)

ہم سے اسحاق بن منصور نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو عاصم نبیل نے بیان کیا، ان سے ابن جریج نے بیان کیا، کہا مجھ کو حسن بن مسلم نے خبر دی اور انھیں مجاہد نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن خطبہ سنانے کھڑے ہوئے اور فرمایا: جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا، اسی دن اس نے مکہ کو حرمت والا شہر قرار دے دیا تھا۔ پس یہ شہر اللہ کے حکم کے مطابق قیامت تک کے لیے حرمت والا رہے گا۔ جو مجھ سے پہلے کبھی کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہو گا اور میرے لیے بھی صرف ایک گھڑی کے لیے حلال ہوا تھا۔ یہاں حدود حرم میں شکار کے قابل جانور نہ چھیڑے جائیں۔ یہاں کے کانٹے دار درخت نہ کاٹے جائیں نہ یہاں کی گھاس اکھاڑی جائے اور یہاں پر گری پڑی چیز اس شخص کے سوا جو اعلان کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور کسی کے لیے اٹھانی جائز نہیں۔ اس پر عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ نے کہا: یا رسول اللہ! اذخر (گھاس) کی اجازت دے دیجیے کیونکہ سناروں کے لیے اور مکانات (کی تعمیر وغیرہ) کے لیے یہ ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے پھر فرمایا: اذخر اس حکم سے الگ ہے اس کا (کاٹنا) حلال ہے۔ دوسری روایت ابن جریج سے (اسی سند سے) ایسی ہی ہے انھوں نے عبدالکریم بن مالک سے، انھوں نے ابن عباس سے اور ابوہریرہ رضی اللہ

عنہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ہی روایت کی ہے۔

وقال الليث: حدثني يونس، قال: اخبرني نافع، عن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اقبل يوم الفتح من اعلى مكة على راحلته مردفا اسامة بن زيد، ومعه بلال، ومعه عثمان بن طلحة من الحجبة حتى اناخ في المسجد، فامره ان ياتي بمفتاح البيت، فدخل رسول الله صلى الله عليه وسلم ومعه اسامة بن زيد، وبلال، وعثمان بن طلحة، فمكث فيه نهارا طويلا، ثم خرج، فاستبق الناس، فكان عبد الله بن عمر اول من دخل، فوجد بلالا، وراء الباب قائما، فساله اين صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فاشار له إلى المكان الذي صلى فيه، قال عبد الله: فنسيت ان اساله كم صلى من سجدة. (صحیح بخاری حدیث نمبر 4289)

اور لیث نے بیان کیا کہ مجھ سے یونس نے بیان کیا' کہا کہ مجھے نافع نے خبر دی اور انھیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر فتح مکہ کے دن مکہ کے بالائی علاقے کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما آپ کی سواری پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھ بلال رضی اللہ عنہ اور کعبہ کے حاجب عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آخر اپنے اونٹ کو آپ نے مسجد (کے قریب باہر) بٹھایا اور بیت اللہ کی کنجی لانے کا حکم دیا پھر آپ بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ اسامہ بن زید' بلال اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ آپ اندر کافی دیر تک ٹھہرے' جب باہر تشریف لائے تو لوگ جلدی سے آگے بڑھے۔ عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہما سب سے پہلے اندر جانے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے بیت اللہ کے دروازے کے پیچھے بلال رضی اللہ عنہ کو کھڑے ہوئے دیکھا اور ان سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں نماز پڑھی تھی۔ انھوں نے وہ جگہ بتلائی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں یہ پوچھنا بھول گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں کتنی رکعتیں پڑھی تھیں۔

(مرفوع) حدثنا سعيد بن شرحبيل، حدثنا الليث، عن المقبري، عن ابي شريح العدوي: انه قال لعمرو بن سعيد وهو يبعث البعوث إلى مكة: ائذن لي ايها الامير احدثك قولا قام به رسول الله صلى الله عليه وسلم: " الغد يوم الفتح سمعته اذناي ووعاه قلبي وابصرته عيناي حين تكلم به إنه حمد الله واثنى عليه، ثم قال: " إن مكة حرمها الله، ولم يحرمها الناس، لا يحل لامرئ يؤمن بالله واليوم الآخر ان يسفك بها دما، ولا يعضد بها شجرا، فإن احد ترخص لقتال رسول الله صلى الله عليه وسلم فيها، فقولوا له: إن الله اذن لرسوله ولم ياذن لكم، وإنما اذن لي فيها ساعة من نهار، وقد عادت حرمتها اليوم كحرمتها بالامس، وليبلغ الشاهد الغائب". فقيل لابي شريح: ماذا قال لك عمرو؟ قال: قال: انا اعلم بذلك منك يا ابا شريح، إن الحرم لا يعيذ عاصيا، ولا فارا بدم، ولا فارا بخربة، قال ابو عبد الله: الخربة: البلية. (صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۲۹۵)

ہم سے سعید بن شرحبیل نے بیان کیا، کہا ہم سے لیث بن سعد نے بیان کیا، ان سے مقبری نے کہ ابوشریح عدوی رضی اللہ عنہ نے (مدینہ کے

امیر) عمرو بن سعید سے کہا جب کہ عمرو بن سعید (عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف) مکہ کی طرف لشکر بھیج رہے تھے کہ اے امیر! مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ سے ایک حدیث بیان کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمارہے تھے تو میں اپنی آنکھوں سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر فرمایا، بلاشبہ مکہ کو اللہ تعالیٰ نے حرمت والا شہر قرار دیا ہے کسی انسان نے اسے اپنے طرف سے حرمت والا قرار نہیں دیا۔ اس لیے کسی شخص کے لیے بھی جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں کہ اس میں کسی کا خون بہائے اور اس سرزمیں کا کوئی درخت کاٹے اور اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (فتح مکہ کے موقع پر) جنگ سے اپنے لیے بھی رخصت نکالے تو تم اس سے کہہ دینا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے رسول کو (تھوڑی دیر کے لیے) اس کی اجازت دی تھی۔ ہمارے لیے بالکل اجازت نہیں ہے اور مجھے بھی اس کی اجازت دن کے تھوڑے سے حصے کے لیے ملی تھی اور آج پھر اس کی حرمت اسی طرح لوٹ آئی ہے جس طرح کل یہ شہر حرمت والا تھا۔ پس جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ (ان کو میرا کلام) پہنچادیں جو موجود نہیں۔ ابو شریح سے پوچھا گیا کہ عمرو بن سعید نے آپ کو پھر جواب کیا دیا تھا؟ تو انھوں نے بتایا کہ اس نے کہا کہ میں یہ مسائل تم سے زیادہ جانتا ہوں، حرم کسی گنہگار کو پناہ نہیں دیتا، نہ

کسی کا خون کر کے بھاگنے والے کو پناہ دیتا ہے' مفسد کو بھی پناہ نہیں دیتا۔

اس بات کا ذکر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں بھی ملتا ہے؛

حدثنا صدقة بن الفضل، اخبرنا ابن عيينة عن ابن ابی نجيح عن مجاهد، عن ابی معمرٍ، عن عبدالله رضی الله عنه، قال: دخل النبی صلی الله عليه وسلم مكة يوم الفتح، وحول البيت ستون وثلاثُ مائَة نصب، فجعل يطعنها بعودٍ فی يده، ويقول: "جاءَ الحق وزهق الباطل، جاءَ الحق وما يبدءُ الباطل وما يعيد۔"

ہم سے صدقہ بن فضل نے بیان کیا' کہا ہم کو سلیمان بن عیینہ نے خبر دی' انھیں ابن ابی نجیح نے' انھیں مجاہد نے' انھیں ابو معمر نے اور ان سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ فتح مکہ کے دن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو بیت اللہ کے چاروں طرف تین سو ساٹھ بت تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک چھڑی سے جو دست مبارک میں تھی' مارتے جاتے تھے اور اس آیت کی تلاوت کرتے جاتے جاء الحق وزهق الباطل، جاء الحق، وما يبدء الباطل وما يعيد کہ حق قائم ہو گیا اور باطل مغلوب ہو گیا' حق قائم ہو گیا اور باطل سے نہ شروع میں کچھ ہو سکا ہے نہ آئندہ کچھ ہو سکتا ہے۔ [صحیح البخاري/كِتَاب الْمَغَازِي/حديث:۴۲۸۷]

***

فتح مکہ کے موقعے پر آپ ﷺ کی جنگی حکمتِ عملی اور خارجہ پالیسی وسفارت کاری

پچھلے صفحات میں، میں نے قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کی مدد سے فتح مکہ معظمہ کے چند اہم واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس واقعے کی اس سے زیادہ تفصیل اس مقالے کے موضوع سے کافی ہٹ کر ہے۔ میں یہاں ان حالات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جب آپ ﷺ نے مکہ معظمہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا، اس وقت سیاسی اور معاشی حالات کیسے تھے، اور فتح مکہ معظمہ کے بعد آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری میں کیا تبدیلی آئی؟ پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فتح مکہ معظمہ کی خاطر تیار کیے جانے والے لشکر کو آپ ﷺ نے کس طرح تیار کیا، اور کس طرح آپ ﷺ نے جنگی اصولوں کو مدنظر رکھا اور مشرکین مکہ کو نفسیاتی طور پر مغلوب کیا، کہ وہ اس قابل بھی نہ رہے کہ اپنے شہر کا دفاع کر سکیں، جبکہ صرف تین سال قبل وہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ اور اپنے حریف قبائل کی مدد سے مدینہ منورہ پر حملہ بھی کر چکے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ نے فتح مکہ معظمہ کا ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا اور مشرکین مکہ کے مرکز کو بغیر جنگ کے فتح کیا۔ یہ مرکز جو انھیں پناہ دے رہا تھا، وہیں یہ ان کی معاشی اور سیاسی طاقت کا سرچشمہ بھی تھا۔ آپ ﷺ نے اس بار جنگ تلوار کے بجائے دشمن کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لڑی۔ اس موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے چند اہم نکات جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں:

آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں لشکر کی تیاری کے دوران کسی کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہونے دی کہ یہ لشکر کہاں جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی

بندوبست کیا کہ اس دوران کوئی بھی مدینہ منورہ سے باہر نہ جائے۔ جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے ایک عورت کے ہاتھ مشرکین مکہ کے نام ایک خط بھیجا ہے، تو آپ ﷺ نے اسے گرفتار کرنے کے لیے حضرت علیؓ کے ساتھ دو اور صحابہؓ کو بھیجا، جنھوں نے اس عورت سے یہ خط برآمد کیا (اس کی تفصیل صحیح بخاری حدیث نمبر ۶۲۵۹ میں ملتی ہے)۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس بڑی جنگ کے لیے ہر طرح کی رازداری سے کام لیا۔ اگر آپ ﷺ ایسا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ مشرکین مکہ بھی جنگ کے لیے تیار ہو جاتے کیونکہ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک کا سفر ایک ہفتے سے زیادہ کا تھا۔ مشرکین مکہ کے لیے اتنا وقت جنگ کی تیاری کے لیے کافی ہوتا۔

آپ ﷺ نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنی دس ہزار مضبوط فوج کو انتہائی مہارت سے مکہ کی سرحد پر پہنچا دیا اور مشرکین مکہ کو اس کی خبر بھی نہ ہونے دی۔ آپ ﷺ کی اس حکمت عملی کی وجہ سے قریش اور ان کے جاسوسوں اور ایجنٹوں کو آپ ﷺ کی نقل و حرکت کا علم نہ ہو سکا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ فتح مکہ معظمہ بغیر جنگ کے ہو، تاکہ خون خرابے کی نوبت نہ آئے۔ آپ ﷺ کو یہ اندازہ تھا کہ اگر مشرکین مکہ کو جنگ کی تیاری کا موقع نہ ملا تو وہ بغیر کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیں گے، اس طرح اس مقدس شہر کو بغیر خون بہائے فتح کر لیا جائے گا۔

یہاں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے مشرکین مکہ کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کے لیے اپنی فوج کو بلند مقامات پر آگ جلانے کا حکم دیا اور دور دور ہو کر خیمے لگانے کا کہا۔ اس سب کا مقصد مشرکین مکہ کو یہ باور کروانا تھا کہ آپ ﷺ ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے ہیں، اس لیے اب ان سے مقابلہ ممکن

نہیں۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین مکہ نے اجتماعی طور پر جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا (البتہ ایک معمولی جھڑپ ضرور ہوئی)۔

مشرکین مکہ کے سردار ابو سفیان بن حرب اور حکیم بن حزام نے جب ایک بڑے علاقے میں آگ جلتی دیکھی تو وہ مکہ معظمہ سے تفتیش کے لیے نکلے اور مسلمانوں کے لشکر میں آ گئے۔ اس موقع پر ان کی ملاقات آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلبؓ سے ہوئی، جو اس وقت تک مکہ معظمہ میں ہی رہ رہے تھے۔ انھوں نے ابو سفیان اور اس کے ساتھی کو سمجھایا کہ اگر قریش کی طرف سے مسلم فوج کا راستہ روکا گیا تو قریش کے بہت سے لوگ مارے جائیں گے۔ اس لیے مشرکین مکہ کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو جائیں۔

حضرت عباسؓ نے ابو سفیان کو لشکر کے مختلف حصے دکھائے اور مسلمانوں کی عددی طاقت اور جنگی جذبے سے ان کو آگاہ کیا۔ اس سے ابو سفیان کو یہ احساس ہو گیا کہ ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ حضرت عباسؓ نے ابو سفیان کو واپس مکہ معظمہ نہیں جانے دیا، تاکہ وہ قریش کو جنگ کے لیے نہ اکسا سکے۔

سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں یہ بات درج ہے کہ ابو سفیان کو حضرت عباسؓ آپ ﷺ کے حکم کے مطابق اگلے روز صبح کے وقت آپ ﷺ کی بارگاہ میں لے کر آئے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ابو سفیان سے بات کی اور فرمایا: اے ابو سفیان، تجھ کو خرابی ہو، کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو خدا کی وحدانیت کو جانے؟ اس کے بعد ابو سفیان نے اسلام قبول کر لیا اور آپ ﷺ کا ایک صحابی بن گیا۔

فتح مکہ معظمہ کے موقع پر آپ ﷺ نے مکہ معظمہ کے چاروں اطراف سے اپنی فوج کو داخل ہونے کا حکم دیا، جس سے اہلِ مکہ کے پاس فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ انھوں نے ہتھیار ڈالنے میں عافیت سمجھی۔ آپ ﷺ نے یہ اعلان کیا کہ جو ابو

سفیان کے گھر میں پناہ لے گا، اسے مسلمانوں کی طرف سے کسی بھی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اس اعلان نے جنگ کے امکان کو ختم کر دیا۔

جب آپ ﷺ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ آپ ﷺ نے کعبہ کا طواف کیا اور وہاں رکھے ہوئے بتوں کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کیا اور کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا: میں تم سب کو معاف کرتا ہوں، تم سب آزاد ہو۔ اس اعلان نے مکہ والوں کے دل جیت لیے۔

انصار نے یہ دیکھ کر کہا کہ آپ ﷺ اپنے آبائی شہر مکہ معظمہ میں آ گئے ہیں اور اب وہ واپس مدینہ منورہ نہیں جائیں گے۔ جب اس سوچ کا آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میری زندگی بھی تمہارے ساتھ ہے اور موت بھی۔ اس سے آپ ﷺ کی انصار سے محبت اور وفاداری کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ تمام واقعات آپ ﷺ کی حکمت عملی، جنگی مہارت، اور خارجہ پالیسی کی عظیم مثالیں ہیں، جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

یہ حسن سلوک کی ایک شاندار مثال تھی۔

یہ سب دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ فتحِ مکہ کے موقع پر عام معافی آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک بہترین نمونہ (ماڈل) ہے، جو آج بھی بے شمار جنگوں اور قتل و غارت سے انسانیت کو بچا سکتا ہے۔ تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ جزیرۃ العرب میں بسنے والے لوگوں کے لیے یہ نہ صرف اجنبی بلکہ ایک نہایت منفرد اور انوکھا واقعہ تھا۔ اسی غیر معمولی طرزِ عمل سے متاثر ہو کر، اس کے بعد بڑی تعداد میں لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

فتحِ مکہ تاریخِ اسلام کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک ہے، مگر اس کی سب سے نمایاں خصوصیت نبی کریم ﷺ کے مقدس مقاصد اور ان کے حصول کے لیے

آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق ہیں۔ اس واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کی تمام شرائط کو انتہائی اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ پورا کیا، جبکہ دوسری طرف مشرکینِ مکہ کی طرف سے معاہدے کی پاسداری نہ کرنے کا طرزِ عمل بھی واضح ہو جاتا ہے۔

فتحِ مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ کی غیر معمولی تدبیر، دانشمندی اور جنگی حکمت عملی نمایاں ہوتی ہے، جس میں آج بھی ہمارے لیے بہترین رہنمائی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے ایک تجربہ کار سپہ سالار کی طرح بے مثال حکمتِ عملی اختیار کی، جس کے نتیجے میں بغیر کسی بڑی جنگ کے ایک عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور دونوں فریقین کا جانی نقصان نہایت کم رہا۔

فتحِ مکہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی انسانیت سے محبت اور دشمنوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے آپ ﷺ کی غیر معمولی فکر کا بھی پتہ دیتی ہے۔ آپ ﷺ نے قریش کے جرائم کو نظر انداز کیا اور عام معافی کا اعلان فرمایا، جو قیامت تک کے لیے رحم، بردباری اور حکمت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سچائی، خوش اخلاقی، راستبازی اور بے داغ ماضی کے باعث آپ ﷺ کے خاندان اور قریبی رشتہ دار بخوبی جانتے تھے کہ آپ ﷺ امین و صادق ہیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بنی ہاشم کے افراد نے آپ ﷺ کی دعوت کو لبیک کہا اور آپ ﷺ کے قریب ہو گئے۔

آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک بہترین عملی نمونہ ہمیں فتحِ مکہ کے موقع پر نظر آتا ہے۔ یہی حکمتِ عملی تھی، جس کے نتیجے میں جہاں سے آپ ﷺ کو رات کی تاریکی میں ہجرت پر مجبور کیا گیا تھا، وہاں صرف آٹھ سال بعد آپ ﷺ ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے۔ لیکن اس تاریخی موقع پر عام

فاتحین کی طرح قتلِ عام نہیں ہوتا، نہ لوٹ مار کی جاتی ہے، نہ عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جاتا ہے اور نہ ہی کسی کو قید کیا جاتا ہے۔

یہ وہی مکہ تھا جہاں آپ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کو بدترین مظالم کا نشانہ بنایا گیا، جہاں حضرت خبیبؓ کو اذیت دے کر شہید کیا گیا، مگر آپ ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں کو معاف کر دیا۔ یہی وہ بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ہے جو آج بھی ہمارے لیے ایک قابلِ عمل نمونہ ہے، بشرطیکہ مقصد اسلام کی دعوت دینا ہو، نہ کہ مالِ غنیمت اور کشور کشائی۔

***

غزوہ حنین و طائف

فتحِ مکہ کے بعد نبی کریم ﷺ ابھی مکہ معظمہ میں ہی تھے کہ آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنی ہوازن اور بنی ثقیف کے قبائل مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ جنگ کیوں پیش آئی؟اس پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

بنی ہوازن اور بنی ثقیف جزیرۃ العرب کے طاقتور قبائل میں شمار ہوتے تھے۔ ان قبائل کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اگر مکہ مسلمانوں کے زیرِ اثر آچکا ہے تو جلد ہی ان کی سرزمین پر بھی اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ خاص طور پر بنی ہوازن کے سردار مالک بن عوف نے محسوس کیا کہ اگر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف پیشگی اقدام نہ کیا تو وہ بھی مکہ کی طرح رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فوج کو متحرک کیا اور طائف کے قریب وادیِ حنین میں مسلمانوں سے مقابلے کا فیصلہ کیا۔

جنگِ حنین کے لیے نبی کریم ﷺ کی حکمتِ عملی اور فوج کی تیاری

اس موقعے پر نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا اور جنگ کے لیے روانگی کا اعلان کیا۔ اس موقع پر مکہ کے نو مسلم افراد کو بھی لشکر میں شامل کیا گیا تاکہ ان کے دلوں میں اسلام کی قوت اور عظمت کا مشاہدہ ہو سکے۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار تھی، جو اس سے پہلے کسی بھی غزوہ میں سب سے زیادہ تھی۔ جیسے ہی مسلمان وادیِ حنین میں داخل ہوئے، بنی ہوازن نے گھات لگا کر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو ابتدائی طور پر پسپائی کا سامنا کرنا پڑا، اور کچھ مسلمانوں میں بے ترتیبی پیدا ہو گئی۔ تاہم، نبی کریمؐ نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور مسلسل اپنے ساتھیوں کو دوبارہ متحد ہونے کی تلقین

فرمائی۔اس موقعے پر نبی کریم ﷺ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ وہ بلند آواز میں انصار اور مہاجرین کو پکاریں۔ جیسے ہی یہ ندا بلند ہوئی، صحابہ کرامؓ فوراً پلٹ آئے اور انتہائی بہادری سے دشمن پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور بنی ہوازن کو شکست فاش ہوئی۔بنی ہوازن اور بنی ثقیف کے افراد طائف کی طرف فرار ہو گئے، جہاں انھوں نے خود کو ایک قلعے میں محفوظ کر لیا۔رسول اللہ ﷺ نے کچھ دن طائف کا محاصرہ کیا لیکن بعد میں حکمتِ عملی کے تحت وہاں سے واپسی کا فیصلہ فرمایا۔بعد میں بنی ہوازن کے کچھ وفود دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور معافی کی درخواست کی، جسے نبی کریم ﷺ نے قبول کر لیا۔

جنگ حنین کے بعد نجد اور حجاز پر مکمل حکمرانی

یہ جنگ جزیرۃ العرب میں اسلامی اقتدار کے استحکام کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔اس کے بعد کسی بھی قبیلے کو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، سوائے چند چھوٹے واقعات کے، جو جلد ہی دبا دیے گئے۔

میرے نزدیک یہ جنگ نجد اور حجاز پر نبی کریم ﷺ کی مکمل حکمرانی کی تکمیل ثابت ہوئی، کیونکہ:

- بڑے بڑے قبائل جیسے بنی ہوازن اور بنی ثقیف مسلمانوں کے خلاف کھڑے ہونے کی ہمت نہ کر سکے۔
- عرب کے بیشتر علاقے اسلامی ریاست کے تابع ہو گئے۔
- دشمن قبائل کو یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ اب جزیرۃ العرب میں اسلام کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔

❖ یہ جنگ دراصل اللہ کے اس وعدے کی تکمیل تھی کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کر دیا جائے گا، اور اس کا عملی مظاہرہ فتحِ مکہ کے بعد جنگِ حنین میں نظر آیا۔

اس جنگ بارے میں قرآن مجید میں سورۃ توبہ ۹:۲۵ میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیۡ مَوَاطِنَ كَثِیۡرَةٍ ۙ وَّیَوۡمَ حُنَیۡنٍ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَیۡـًٔا وَّضَاقَتۡ عَلَیۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّیۡتُمۡ مُّدۡبِرِیۡنَ۔

اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غَزوۂ حُنَین کے روز (اُس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو۔ اس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

اس آیت کی تفسیر، تفسیر ابنِ کثیر میں تفصیل سے ملتی ہے[61]۔ میں اسے ہی یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

نصرت الٰہی کا ذکر مجاہد کہتے ہیں براۃ کی یہ پہلی آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنا بہت بڑا احسان مومنوں پر ذکر فرما رہا ہے کہ اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی آپ امداد فرمائی انھیں دشمنوں پر غالب کر دیا اور ایک جگہ نہیں ہر جگہ اس

---

[61] https://al-hadees.com/alquran-tafseer/9/25، نے یہ ترجمہ شائع کیا ہے، میں کوشش کے باوجود مترجم کا نام نہ جان سکا۔ البتہ میں نے، عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوبن کثیر قرشی دمشقی شافعی، ابن کثیر، البدایہ و النھایہ، تاریخ ابنِ کثیر اردو مترجم؛ مولانا محمد خالد سیف، شعبہ تحقیق و تصنیف و ترجمہ دار السلام لاہور سے اس ترجمے کا موازنہ کیا تو مجھے کچھ فرق معلوم نہیں ہوا۔

کی مدد شامل حال رہی اسی وجہ سے فتح و ظفر نے کبھی ہم رکابی نہ چھوڑی۔ یہ صرف تائید ربانی تھی نہ کہ مال اسباب اور ہتھیار کی فراوانی اور نہ تعداد کی زیادتی۔ یاد کرلو حنین والے دن تمھیں ذرا اپنی تعداد کی کثرت پر ناز ہو گیا تو کیا حال ہوا؟ پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے تھے۔ معدودے چند ہی اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ٹھہرے اسی وقت اللہ کی مدد نازل ہوئی اس نے دلوں میں تسکین ڈال دی یہ اس لیے کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ مدد اسی اللہ کی طرف سے ہے اس کی مدد سے چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے بڑے بڑے گروہوں کے منہ پھیر دیے ہیں۔ اللہ کی امداد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ واقعہ ہم عنقریب تفصیل وار بیان کریں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

مسند کی حدیث میں ہے بہترین ساتھی چار ہیں اور بہترین چھوٹا لشکر چار سو کا ہے اور بہترین بڑا لشکر چار ہزار کا ہے اور بارہ ہزار کی تعداد تو اپنی کمی کے باعث کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی۔ یہ حدیث ابو داؤد اور ترمذی میں بھی ہے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اسے حسن غریب بتلاتے ہیں۔ یہ روایت سوائے ایک راوی کے باقی سب راویوں نے مرسل بیان کی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی میں بھی یہ روایت اسی طرح مروی ہے۔ واللہ اعلم۔ سنہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد ماہ شوال میں جنگ حنین ہوئی تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ سے فارغ ہوئے اور ابتدائی امور سب انجام دے چکے اور مکہ عام لوگ مسلمان ہو چکے اور انھیں آپ آزاد بھی کر چکے تو آپ کو خبر ملی کہ قبیلہ ہوازن جمع ہو رہا ہے اور آپ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہے۔ ان کا سردار مالک بن عوف نصری ہے۔ ثقیف کا سارا قبیلہ ان کے ساتھ ہے اسی طرح بنو جشم بنو سعد بن بکر بھی ہیں اور بنو ہلال کے کچھ لوگ بھی ہیں اور کچھ لوگ بنو عمرو بن عامر کے اور عون بھی عامر کے بھی ہیں یہ سب لوگ مع اپنی عورتوں اور بچوں اور گھریلو مال کے میدان میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کے اپنی بکریوں اور اونٹوں کو بھی انھوں نے ساتھ

ہی رکھا ہے تو آپ نے اس لشکر کو لے کر جواب آپ کے ساتھ مہاجرین اور انصار وغیرہ کا تھا ان کے مقابلے کے لیے چلے تقریباً دو ہزار نو مسلم بھی آپ کے ساتھ ہو لیے۔ مکہ اور طائف کے درمیان کی وادی میں دونوں لشکر مل گئے اس جگہ کا نام حنین تھا صبح سویرے منہ اندھیرے قبیلہ ہوازن جو کمین گاہ میں چھپے ہوئے تھے انھوں نے بے خبری میں مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیا بے پناہ تیر باری کرتے ہوئے آگے بڑھے اور تلواریں چلانی شروع کر دیں یہاں مسلمانوں میں دفعتاً ابتری پھیل گی اور یہ منہ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بڑھے آپ اس وقت سفید خچر پر سوار تھے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے جانور کی دائیں جانب سے نکیل تھامے ہوئے تھے اور حضرت ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب بائیں طرف سے نکیل پکڑے ہوئے تھے جانور کی تیزی کو یہ لوگ روک رہے تھے آپ باآواز بلند اپنے تئیں پہنچوا رہے تھے مسلمانوں کو واپسی کا حکم فرما رہے تھے اور ندا کرتے جاتے تھے کہ اللہ کے بندو کہاں چلے، میری طرف آؤ۔ میں اللہ کا سچا رسول ہوں میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں۔ میں اولاد عبد المطلب میں سے ہوں۔ آپ کے ساتھ اس وقت صرف اسی یا سو کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہ رہ گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ ، حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ ، حضرت ابو سفیان بن حارث رضی اللہ عنہ حضرت ایمن بن ام ایمن، حضرت اسامہ بن زید وغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی تھے پھر آپ نے اپنے چچا حضرت عباس کو جو بہت بلند آواز والے تھے۔ حکم دیا کہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والے میرے صحابیوں کو آواز دو کہ وہ نہ بھاگیں پس آپ نے یہ کہہ کر اے ببول کے درخت تلے بیعت کرنے والو! اے سورہ بقرہ کے حاملو! پس یہ آواز ان کے کانوں میں پہنچنی تھی کہ انھوں نے ہر طرف سے لبیک لبیک کہنا شروع کیا

اور آواز کی جانب لپک پڑے اور اسی وقت لوٹ کر آپ کے آس پاس آکر کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ اگر کسی کا اونٹ اڑ گیا تو اس نے اپنی زرہ پہن لی اونٹ پر سے کود گیا اور پیدل سرکار نبوت میں حاضر ہو گیا جب کچھ جماعت آپ کے ارد گرد جمع ہو گئی آپ نے اللہ سے دعا مانگنی شروع کی کہ یا باری تعالیٰ جو وعدہ تیرا میرے ساتھ ہے اسے پورا فرما۔ پھر آپ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی بھر لی اور اسے کافروں کی طرف پھینکا جس سے ان کی آنکھوں اور ان کا منہ بھر گیا وہ لڑائی کے قابل نہ رہے۔ ادھر مسلمانوں نے ان پر دھاوا بول دیا ان کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ نکلے۔

مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور مسلمانوں کی باقی فوج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اتنی دیر میں تو انھوں نے کفار کو قید کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈھیر کر دیا مسند احمد میں ہے حضرت عبد الرحمن فہری جن کا نام یزید بن اسید ہے یا یزید بن انیس ہے اور کرز بھی کہا گیا ہے فرماتے ہیں کہ میں اس معرکے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا دن سخت گرمی والا تھا دوپہر کو ہم درختوں کے سائے تلے ٹھہر گئے سورج ڈھلنے کے بعد میں نے اپنے ہتھیار لگا لیے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے پر پہنچا سلام کے بعد میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوائیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں آپ نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے بلال اس وقت بلال ایک درخت کے سائے میں تھے حضور کی آواز سنتے ہی پرندے کی طرح گویا اڑ کر لبیك وسعدیك وانا فداوك کہتے ہوئے حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا میری سواری تیار کرو اسی وقت انھوں نے زین نکالی جس کے دونوں پلے کھجور کی رسی کے تھے جس میں کوئی فخر و غرور کی چیز نہ تھی جب کس چکے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے ہم نے صف بندی کر لی شام اور رات اسی طرح گذری پھر دونوں لشکروں کی مڈ بھیڑ ہو گئی تو مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے جیسے قرآن نے فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ

اے اللہ کے بندو میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں اے مہاجرین، میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں پھر اپنے گھوڑے سے اتر پڑے مٹی کی ایک مٹھی بھر لی اور یہ فرما کر ان کے چہرے بگڑ جائیں کافروں کی طرف پھینک دی اسی سے اللہ نے انھیں شکست دے دی۔

ان مشرکوں کا بیان ہے کہ ہم میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں اور منہ میں یہ مٹی نہ آئی ہو اسی وقت ہمیں ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا زمین و آسمان کے درمیان لوہا کسی لوہے کی طشت پر بج رہا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ بھاگے ہوئے مسلمان جب ایک سو آپ کے پاس واپس پہنچ گئے آپ نے اسی وقت حملے کا حکم دے دیا اول تو منادی انصار کی تھی پھر خزرج ہی پر رہ گئی یہ قبیلہ لڑائی کے وقت بڑا ہی صابر تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر سے میدان جنگ کا نظارہ دیکھا اور فرمایا: اب لڑائی گرما گرمی سے ہو رہی ہے۔ اس میں ہے کہ اللہ نے جس کافر کو چاہا قتل کرا دیا جسے چاہا قید کرا دیا۔ اور ان کے مال اور اولادیں اپنے نبی کو فے میں دلا دیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے کسی نے کہا: اے ابو عمارہ کیا تم لوگ رسول اللہ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے حنین والے دن بھاگ نکلے تھے؟ آپ نے فرمایا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم پیچھے نہ ہٹا تھا بات یہ ہے کہ قبیلہ ہوازن کے لوگ تیر اندازی کے فن کے استاد تھے اللہ کے فضل سے ہم نے انھیں پہلے ہی حملے میں شکست دے دی لیکن جب لوگ مال غنیمت پر جھک پڑے انھوں نے موقع دیکھ کر پھر جو پوری مہارت کے ساتھ تیروں کی بار برسائی تو یہاں بھگدڑ مچ گئی۔ سبحانہ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل شجاعت اور پوری بہادری کا یہ موقع تھا۔ لشکر بھاگ نکلا ہے اس وقت آپ کسی تیز سواری پر نہیں جو بھاگنے دوڑنے میں کام آئے بلکہ خچر پر سوار ہیں اور مشرکوں کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اپنے تئیں چھپاتے نہیں بلکہ اپنا نام اپنی زبان سے پکار پکار کر بتا رہے ہیں کہ نہ پہچاننے والے بھی پہچان لیں۔ خیال فرمایئے کہ کس قدر ذات واحد پر آپ کا توکل ہے اور کتنا کامل یقین ہے آپ کو اللہ کی مدد

پر۔ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ امر رسالت کو پورا کر کے ہی رہے گا اور آپ کے دین کو دنیا کے اور دینوں پر غالب کر کے ہی رہے گا فصلوات اللہ وسلامہ علیہ ابدا ابدا۔ اب اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر اور مسلمانوں کے اوپر سکینت نازل فرماتا ہے اور اپنے فرشتوں کا لشکر بھیجتا ہے جنھیں کوئی نہ دیکھتا تھا۔

ایک مشرک کا بیان ہے کہ حنین والے دن جب ہم مسلمانوں سے لڑنے لگے ایک بکری کا دودھ نکالا جائے اتنی دیر بھی ہم نے انھیں اپنے سامنے جمنے نہیں دیا فوراً بھاگ کھڑے ہوئے اور ہم نے ان کا تعاقب شروع کیا یہاں تک کہ ہمیں ایک صاحب سفید خچر پر سوار نظر پڑے ہم نے دیکھا یہ کہ خوب صورت نورانی چہرے والے کچھ لوگ ان کے ارد گرد ہیں ان کی زبان سے نکلا کہ تمہارے چہرے بگڑ جائیں واپس لوٹ جاؤ بس یہ کہنا تھا کہ ہمیں شکست ہو گئی یہاں تک کہ مسلمان ہمارے کندھوں پر سوار ہو گئے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں بھی اس لشکر میں تھا آپ کے ساتھ صرف اسی مہاجر و انصار رہ گئے تھے ہم نے پیٹھ نہیں دکھائی تھی ہم پر اللہ نے اطمینان و سکون نازل فرما دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفید خچر پر سوار دشمنوں کی طرف بڑھ رہے تھے جانور نے ٹھوکر کھائی آپ زین پر سے نیچے کی طرف جھک گئے میں نے آواز دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونچے ہو جایئے اللہ آپ کو اونچا ہی رکھے آپ نے فرمایا: ایک مٹھی مٹی کی تو بھر دو میں نے بھر دی آپ نے کافروں کی طرف پھینکی جس سے ان کی آنکھیں بھر گئیں پھر فرمایا: مہاجر و انصار کہاں ہیں میں نے کہا یہیں ہیں فرمایا: نہیں آواز دو میرا آواز دینا تھا کہ وہ تلواریں سونتے ہوئے لپک لپک کر آ گئے اب تو مشرکین کی کچھ نہ چلی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

بیہقی کی ایک روایت میں ہے شیبہ بن عثمان کہتے ہیں کہ حنین کے دن جبکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا کہ لشکر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا رہ گئے ہیں تو مجھے بدر والے دن اپنے باپ اور

چچا کا مارا جانا یاد آیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارے گئے ہیں، میں نے اپنے جی میں کہا کہ ان کے انتقام لینے کا اس سے اچھا موقع اور کون سا ملے گا؟ آؤ پیغمبر کو قتل کر دوں اس ارادے سے میں آپ کی دائیں جانب سے بڑھا لیکن وہاں میں نے عباس بن عبد المطلب کو پایا سفید چاندی جیسی زرہ پہنے مستعد کھڑے ہیں میں نے سوچا کہ یہ چچا ہیں اپنے بھتیجے کی پوری حمایت کریں گے چلو بائیں جانب سے جا کر اپنا کام کروں اور ادھر سے آیا تو دیکھا ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب کھڑے ہیں میں نے کہا ان کے بھی چچا کے لڑکے بھائی ہیں اپنے بھائی کی ضرور حمایت کریں گے پھر میں رکاوٹ کاٹ کر پیچھے کی طرف آیا آپ کے قریب پہنچ گیا اب یہی باقی رہ گیا تھا کہ تلوار سونت کر وار کر دوں کہ میں نے دیکھا ایک آگ کا کوڑا بجلی کی طرف چمک کر مجھ پر پڑا چاہتا ہے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پچھلے پاؤں پیچھے کی طرف ہٹا اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری جانب التفات کیا اور فرمایا: شیبہ میرے پاس آؤ، اللہ اس کے شیطان کو دور کر دے۔

اب میں نے آنکھ کھول کر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو واللہ آپ مجھے میرے کانوں اور آنکھوں سے بھی زیادہ محبوب تھے آپ نے فرمایا: شیبہ جا کافروں سے لڑ۔ شیبہ کا بیان ہے کہ اس جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں میں بھی تھا لیکن میں اسلام کی وجہ سے یا اسلام کی معرفت کی بناء پر نہیں نکلا تھا بلکہ میں نے کہا واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ ہوازن قریش پر غالب آ جائیں؟ میں آپ کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا تو میں نے ابلق رنگ کے گھوڑے دیکھ کر کہا یا رسول اللہ میں تو ابلق رنگ کے گھوڑے دیکھ رہا ہوں آپ نے فرمایا: شیبہ وہ تو سوائے کافروں کے کسی کو نظر نہیں آتے۔ پھر آپ نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر دعا کی: یا اللہ شیبہ کو ہدایت

عطا کر پھر دوبارہ سہ بارہ یہی کیا اور یہی کہا۔ واللہ آپ کا ہاتھ ہٹنے سے پہلے ہی ساری دنیا سے زیادہ آپ کی محبت میں اپنے دل میں پانے لگا۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اس غزوے میں آپ کے ہم رکاب تھا میں نے دیکھا کہ کوئی چیز آسمان سے اتر رہی ہے چیونٹیوں کی طرح اس نے میدان گھیر لیا اور اسی وقت مشرکوں کے قدم اکھڑ گئے واللہ ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ آسمانی مدد تھی۔ یزید بن عامر سوائی اپنے کفر کے زمانے میں جنگ حنین میں کافروں کے ساتھ تھا بعد میں یہ مسلمان ہو گئے تھے ان سے جب دریافت کیا جاتا کہ اس موقع پر تمہارے دلوں کا رعب و خوف سے کیا حال تھا؟ تو وہ طشت میں کنکریاں رکھ کر بجا کر کہتے بس یہی آواز ہمیں ہمارے دل سے آ رہی تھی بے طرح کلیجہ اچھل رہا تھا اور دل دہل رہا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مجھے رعب سے مدد دی گئی ہے۔ مجھے جامع کلمات دیے گئے ہیں الغرض کفار کو اللہ نے یہ سزا دی اور یہ ان کے کفر کا بدلہ تھا۔ باقی ہوازن پر اللہ نے مہربانی فرمائی انھیں توبہ نصیب ہوئی مسلمان ہو کر خدمت مخدوم میں حاضر ہوئے اس وقت آپ فتح مندی کے ساتھ لوٹتے ہوئے مکہ شریف جعرانہ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

جنگ کو بیس دن کے قریب گذر چکے تھے اس لیے آپ نے فرمایا کہ اب تم دو چیزوں میں سے ایک پسند کر لو یا تو قیدی یا مال؟ انھوں نے قیدیوں کا واپس لینا پسند کیا ان قیدیوں کی چھوٹوں بڑوں کی مرد عورت کی بالغ نابالغ کی تعداد چھ ہزار تھی۔ آپ نے یہ سب انھیں لوٹا دیے ان کا مال بطور غنیمت کے مسلمانوں میں تقسیم ہوا اور نو مسلم جو مکہ کے آزاد کردہ تھے انھیں بھی آپ نے اس مال میں سے دیا کہ ان کے دل اسلام کی طرف پورے مائل ہو جائیں ان میں سے ایک ایک کو سو سو اونٹ عطا فرمائے۔ مالک بن عوف نصری کو بھی آپ نے سو اونٹ دیے اور اسی کو اس کی قوم کا سردار بنا دیا جیسے کہ وہ تھا اسی کی تعریف میں اس نے اپنے مشہور قصیدے میں کہا ہے کہ میں نے تو حضرت محمد

مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم جیسانہ کسی اور کو دیکھا نہ سنا۔ دینے میں اور بخشش وعطا کرنے میں اور قصوروں سے درگزر کرنے میں دنیا میں آپ کا ثانی نہیں آپ کل قیامت کے دن ہونے والے تمام امور سے مطلع فرماتے رہتے ہیں یہی نہیں شجاعت اور بہادری میں بھی آپ بے مثل ہیں میدان جنگ میں گرجتے ہوئے شیر کی طرح آپ دشمنوں کی طرف بڑھتے ہیں۔

غزوہ حنین بارے میں کئی احادیث ملتی ہیں۔ ان میں سے میں دو احادیث یہاں نقل کر رہا ہوں؛

(مرفوع) حدثنا محمد بن كثير، حدثنا سفيان، عن ابي إسحاق، قال: سمعت البراء رضى الله عنه، وجاءه رجل، فقال: يا ابا عمارة، اتوليت يوم حنين؟ فقال: اما انا فاشهد على النبى صلى الله عليه وسلم انه لم يول، ولكن عجل سرعان القوم فرشقتهم هوازن وابو سفيان بن الحارث آخذ براس بغلته البيضاء، يقول: انا النبى لا كذب انا ابن عبد المطلب۔

(صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۳۱۵)

ہم سے محمد بن کثیر نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان ثوری نے بیان کیا، ان سے ابواسحاق نے، کہا کہ میں نے براء رضی اللہ عنہ سے سنا، ان کے یہاں ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ اے ابو عمارہ! کیا تم نے حنین کی لڑائی میں پیٹھ پھیر لی تھی؟ انھوں نے کہا، میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔ البتہ جو لوگ قوم میں جلد باز تھے، انھوں نے اپنی جلد بازی کا ثبوت دیا تھا، پس قبیلہ ہوازن والوں نے ان پر تیر برسائے۔ ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سفید خچر کی لگام تھامے ہوئے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے أنا النبي لا كذب، أنا ابن عبد المطلب میں نبی ہوں اس میں بالکل جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کی اولاد ہوں۔

حدثنا يحيى بن يحيى ، اخبرنا ابو خيثمة ، عن ابي إسحاق ، قال: قال رجل، للبراء "يا ابا عمارة: افررتم يوم حنين؟، قال: لا والله ما ولى رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولكنه خرج شبان اصحابه واخفاؤهم حسرا ليس عليهم سلاح او كثير سلاح، فلقوا قوما رماة لا يكاد يسقط لهم سهم جمع هوازن، وبني نصر، فرشقوهم رشقا ما يكادون يخطئون، فاقبلوا هناك إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، ورسول الله صلى الله عليه وسلم على بغلته البيضاء وابو سفيان بن الحارث بن عبد المطلب يقود به، فنزل فاستنصر، وقال: انا النبي لا كذب، انا ابن عبد المطلب، ثم صفهم.

(صحیح مسلم حدیث نمبر ۴۶۱۵)

ابوخیثمہ نے ہمیں ابواسحاق سے خبر دی، انھوں نے کہا: ایک آدمی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے کہا: ابو عمارہ! کیا آپ لوگ حنین کے دن بھاگے تھے؟ انھوں نے کہا: نہیں، اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخ تک نہیں پھیرا، البتہ آپ کے ساتھیوں میں سے چند نوجوان اور جلد باز (جنگ کے لیے) نہتے نکلے تھے جن (کے جسم) پر اسلحہ یا بڑا اسلحہ نہیں تھا، تو ان کی مڈ بھیڑ ایسی تیر انداز قوم سے ہوئی جن کا کوئی تیر (زمین) پر نہ گرتا تھا، (نشانے پر لگتا تھا) وہ بنو ہوازن اور بنو نضر کے جتھے تھے، انھوں نے ان (نوجوانوں) کو اس طرح سے تیروں سے چھیدنا شروع کیا

کہ کوئی نشانہ خطا نہ جاتا تھا، پھر وہ لوگ وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بڑھے، آپ اپنے سفید خچر پر تھے اور ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اسے چلا رہے تھے، آپ نیچے اترے (اللہ سے) مدد مانگی اور فرمایا: میں نبی ہوں، یہ جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ پھر آپ نے (نئے سرے سے) ان کی صف بندی کی (اور پانسہ پلٹ گیا)۔

تفسیر ابنِ کثیر میں موجود تحریر اور پچھلے صفحات میں درج دو احادیث کے علاوہ بھی سیرت کی کتابوں میں ان دو واقعات جو بظاہر تو مختلف مقامات پر پیش آئے لیکن یہ دونوں کا آپس میں گہرا تعلق بھی ہے، تفصیل موجود ہے۔ اس سے زیادہ اس واقعے کی تفصیل اس مقالے کی حدود سے باہر ہے۔

جنگِ حنین اور اس کے بعد کے واقعات:

نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری

فتح مکہ کے بعد بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب جزیرۃ العرب میں کوئی بھی طاقت مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلے پر آباد دو طاقتور قبائل، بنی ہوازن اور بنی ثقیف، جو کئی دیگر قبائل کے ساتھ متحد ہو چکے تھے، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ قبائل اس سوچ میں مبتلا تھے کہ اگر نبی کریم ﷺ نے اپنے ہی قبیلے (قریش) کو نہیں بخشا، تو ہمیں کیسے معاف کریں گے؟ ان کے لیے مسلمانوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا عزتِ نفس کے خلاف تھا، لہٰذا انھوں نے مالک بن عوف نصری کی قیادت میں جنگ کا فیصلہ کیا۔ اس طرح جنگِ حنین کا آغاز ہوا۔ اس جنگ کی تفصیلات پچھلے صفحات میں درج کی

جاچکی ہیں، یہاں میں نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی، سفارت کاری، اور اس جنگ کے بعد کے اہم واقعات پر گفتگو کروں گا۔

جنگِ حنین کے حوالے سے تفصیلی مطالعے کے لیے سیرت ابن ہشام ایک بہترین کتاب ہے۔ اسی کتاب میں درج واقعات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

1. **مسلمانوں نے جنگ نہیں چھیڑی، بلکہ دفاع کیا:** نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے بعد واپسی کی تیاری میں تھے کہ آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنی ہوازن، بنی ثقیف اور ان کے حلیف قبائل (بنی نصر، بنی جشم، بنی سعد بن بکر اور بنی ہلال کے چند افراد) جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس لشکر میں بنی کعب اور بنی کلاب شامل نہیں تھے۔ بنی جشم کے ایک عمر رسیدہ اور تجربہ کار فرد نے سردار مالک بن عوف نصری کو جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیا، مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس موقع پر نبی کریم ﷺ کو یہ جاننے کا موقع ملا کہ کون سے قبائل دشمن ہیں اور کون سے غیر جانبدار۔

2. **دشمن کی جنگی تیاریوں کی تصدیق اور مسلمانوں کی روانگی:** جب دشمن کی جنگی تیاریوں کی تصدیق ہو گئی، تو نبی کریم ﷺ نے ۱۲ ہزار افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ مکہ معظمہ سے وادیٔ حنین کی طرف کوچ کیا۔ ۱۰ ہزار افراد وہ تھے جو مدینہ منورہ سے آئے تھے۔ دو ہزار افراد وہ نومسلم تھے جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔

3. **مکہ کی حرمت کا لحاظ اور فوری کارروائی:** نبی کریم ﷺ نے جنگ کے لیے مکہ سے باہر نکلنے کا فیصلہ مکہ معظمہ کی حرمت کے پیشِ نظر کیا، تاکہ مقدس شہر کو جنگ سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ساتھ ہی آپ ﷺ نے کسی تاخیر کے بغیر کارروائی کی تاکہ دشمن کو مزید تیاری کا موقع نہ ملے، ورنہ ان کا حملہ اور بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔

4. **نومسلموں پر اعتماد کی حکمت:** اس جنگ میں نبی کریم ﷺ نے نومسلم

افراد کو بھی ساتھ شامل کیا، جو اس بات کی دلیل تھی کہ آپ ﷺ نے ان پر اعتماد کیا اور ان کی سابقہ غلطیوں کو معاف کر دیا ہے۔ اس سے ان کے دلوں میں اسلام کے لیے محبت اور وفاداری مزید مضبوط ہو گئی۔

5. جنگ کے دوران اسلحہ ادھار لینا: نبی کریم ﷺ نے جنگی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے صفوان بن امیہ سے اسلحہ ادھار لیا۔ یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ جنگ میں جدید اور بہترین اسلحے کا استعمال اہمیت رکھتا ہے اور حکمتِ عملی کے مطابق تیاری کرنی چاہیے۔

6. جنگ میں عارضی شکست اور نبی کریم ﷺ کا استقلال: جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو دھچکا لگا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ شکست کھا جائیں گے۔ تاہم، نبی کریم ﷺ نے ثابت قدمی دکھائی اور مسلمانوں کو مجتمع کر کے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ آپ ﷺ کی استقامت اور قیادت کی بدولت مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور دشمن میدان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

7. جنگ میں غیر جنگی افراد کو قتل نہ کرنے کا حکم: نبی کریم ﷺ نے میدانِ جنگ میں ایک عورت کی لاش دیکھی، تو سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے حکم دیا کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے۔ یہ اسلامی جنگی اصولوں کی بہترین مثال ہے۔

8. بنی سعد کے قیدیوں کی رہائی اور صلہ رحمی: جنگ کے بعد بنی سعد (جس قبیلے سے نبی کریم ﷺ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کا تعلق تھا) کے قیدی لائے گئے۔ ان میں نبی کریم ﷺ کی رضاعی بہن شیماء بھی شامل تھیں۔ جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو انھیں باعزت رخصت کیا۔ اس عمل سے ایک بڑی تعداد متاثر ہوئی اور

کئی افراد نے اسلام قبول کر لیا۔

9. طائف کا محاصرہ اور کفار کی دوبارہ بغاوت روکنا: ہوازن کے فرار ہونے والے افراد طائف کی طرف چلے گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فیصلہ کیا کہ انھیں دوبارہ مجتمع ہونے کا موقع نہ دیا جائے، اور ان کا تعاقب کیا۔ طائف پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے مالک بن عوف کے قلعے کو مسمار کیا تاکہ اہلِ طائف کو سخت پیغام دیا جا سکے۔ اہلِ طائف نے اپنے قلعوں میں پناہ لی، جس پر مسلمانوں نے پہلی بار منجنیق کا استعمال کیا۔

10. قیدیوں کی رہائی: حکمتِ عملی کا ایک بہترین نمونہ: جنگ کے نتیجے میں ۶ ہزار عورتیں اور بچے قیدی بنائے گئے اور بے شمار مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ بنی ہوازن کے لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور اپنی عورتوں اور بچوں کی رہائی کی درخواست کی۔

نبی کریم ﷺ چاہتے تو انھیں فوراً رہا کرنے کا حکم دے سکتے تھے، مگر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب میں ظہر کی نماز ادا کر لوں تو میرے پاس آؤ، میں اپنے حصے کے قیدی آزاد کر دوں گا۔ جب صحابہؓ نے یہ دیکھا تو سب نے قیدیوں کو رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔

11. مالِ غنیمت کی تقسیم اور قریش کے سرداروں کو نوازنا: نبی کریم ﷺ نے مالِ غنیمت کئی قریشی سرداروں کو وافر مقدار میں دیا تاکہ ان کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا ہو۔

انصار نے محسوس کیا کہ قریش کو زیادہ نوازا جا رہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا تم خوش نہیں کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو

لے کر جاؤ؟

یہ سن کر انصار جذباتی ہو گئے اور کہا: ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ ہی کافی ہیں! یہ سب جان کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ جنگِ حنین اور اس کے بعد کے واقعات میں نبی کریم ﷺ کی عالی شان خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا بہترین مظاہرہ نظر آتا ہے۔

یہ واقعات درگزر، حکمت، جنگی مہارت، اور اسلام کی پرامن دعوت کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آج بھی اگر ہم اسی سفارت کاری اور حکمت پر عمل کریں تو دنیا میں اسلام کا پیغام امن اور انصاف کے ساتھ پھیل سکتا ہے۔

***

عام الوفود: جس کا ایک مدت سے انتظار تھا

یوں تو ہر دور میں عرب اور دیگر علاقوں سے وفود آپ ﷺ کی بارگاہ میں آتے رہے، لیکن فتحِ مکہ کے بعد نو ہجری میں ایک بڑی تعداد میں وفود آپ ﷺ سے ملاقات کے لیے آئے۔ ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے اس سال کو "عام الوفود" یعنی وفود کا سال کہا جاتا ہے۔ ان وفود میں کچھ لوگ اسلام قبول کرنے کے لیے آئے، کچھ مذاکرات کے لیے، اور کچھ ایسے بھی تھے جو (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فتحِ مکہ کے بعد آپ ﷺ جزیرۃ العرب کے وسیع خطے کے تنِ تنہا سربراہ تھے اور مسلمان ایک بڑی طاقت بن چکے تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے آنے والے وفود کا احترام کیا اور کسی بھی طرح انھیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک فاتح سے گفتگو کر رہے ہیں، بلکہ آپ ﷺ نے ان کی خدمت کی، انھیں تحائف عطا کیے، اور یہ سب کچھ ان کے دل جیتنے کے لیے کیا۔ آپ ﷺ ان کے لیے دعا بھی فرماتے، جو دلی ہمدردی کا ایک حسین مظہر تھا۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ جہاں کسی معاملے میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہ تھا، وہاں آپ ﷺ نے دوٹوک مؤقف اختیار فرمایا، لیکن جہاں رعایت دی جاسکتی تھی، وہاں لچک کا مظاہرہ بھی کیا۔ یہ قبائل نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ آگے بڑھ کر امت مسلمہ کا بہترین اور اہم حصہ بنے اور مسلمانوں کے تمام معاملات میں شریک رہے۔ یوں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ صرف مسلمانوں کے حلیف تھے، بلکہ حقیقت میں وہ ریاستِ مدینہ کے جاں نثار سپاہی بن چکے تھے۔

فتحِ عرب کے بعد جب مسلمانوں نے شام، روم اور ایران وغیرہ کی طرف پیش قدمی کی تو یہی لوگ ان کے شانہ بشانہ تھے۔ اب وہ امتِ مسلمہ کے ایک اہم فرد بن چکے تھے، اور یہی وہ حقیقی کامیابی تھی جو آپ ﷺ کی خواہش تھی۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اکثر قبائل کے دینی و تعلیمی اصلاح کے لیے صحابہ کرام کو بھیجا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دل جیتنے کے لیے محبت، حکمت اور خیر خواہی بہترین ہتھیار ہیں۔ جب مفتوح کی عزتِ نفس کا خیال رکھا جائے گا تو نہ صرف جسموں پر بلکہ دلوں پر بھی حکمرانی ممکن ہو گی۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل جزیرۃ العرب میں قریش کو ایک سپر پاور کا درجہ حاصل تھا، اور وہ حرمِ مکہ کے متولی بھی تھے۔ جزیرۃ العرب کی معیشت کا دار و مدار بھی قریش کے طرزِ عمل پر تھا، اس لیے قبائل ان کی مخالفت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ اور مشرکینِ مکہ کے درمیان کشمکش جاری تھی، تب بہت سے قبائل اور افراد نتائج کے منتظر تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ باطل قوت کبھی بھی مسجدِ حرام پر قابض نہیں ہو سکتی۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے قریش کو شکست دے دی ہے اور مکہ معظمہ پر آپ ﷺ کا قبضہ ہو گیا ہے، تو انھیں یہ یقین ہو گیا کہ محمد ﷺ واقعی سچے نبی ہیں۔ اس کے بعد فتحِ مکہ کے بعد مختلف علاقوں سے بڑی تعداد میں وفود آنے لگے۔ ان کی تعداد دیکھ کر ۹ ہجری کو عام الوفود یعنی وفود کا سال کہا جانے لگا۔ اس طرح چند ہی دنوں میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنے والوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو گیا اور جزیرۃ العرب کا بیشتر حصہ آپ ﷺ کے زیرِ نگیں آ گیا۔

یہاں وفود کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ آپ ﷺ کی نبوت کے آغاز سے ہی وفود کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں یثرب (مدینہ منورہ) کا وفد تھا، جو دو مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (بیعتِ عقبہ اول اور دوم)۔

اصل مقصد یہاں یہ دیکھنا ہے کہ آپ ﷺ نے ان وفود کے ساتھ کیا سلوک فرمایا اور کون سی حکمتِ عملی اختیار کی، جو آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو تھی، اور اس سے ہمیں کیا سیکھنے کو ملتا ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ آپ ﷺ نے ان وفود کی مہمان نوازی کس طرح فرمائی، انھیں کیسا پروٹوکول دیا، اور مذاکرات کے دوران کن امور کو زیادہ اہمیت دی۔ کئی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے ہر وفد کے ساتھ انتہائی حسنِ اخلاق اور شفقت کا برتاؤ فرمایا، جس سے ہر آنے والا بے حد متاثر ہوا۔ جو شخص اسلام قبول کر لیتا، وہ خود کو خوش نصیب سمجھتا اور تبلیغِ اسلام کو اپنا فرض جان لیتا۔ ان وفود کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کی تفصیل سیرت کی کتب میں ملتی ہے، جسے یہاں بیان کرنا مقصود نہیں۔

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کے مطابق، ان وفود کی تعداد ستر سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہاں ان کی تفصیلات بیان کرنا ممکن نہیں، سوائے چند اہم وفود کے، جو تاریخی لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ میں یہاں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ نے ان وفود سے معاملات کرتے ہوئے کس طرح ایک بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ وفود کے ساتھ آپ ﷺ کے مبارک سلوک کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

عزتِ نفس کا خیال اور حسنِ سلوک: آپ ﷺ نے دیگر قبائل کے وفود کے ساتھ ایک فاتح کے انداز میں سلوک نہیں کیا، بلکہ ان کی عزتِ نفس کا مکمل خیال رکھا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف ان کی بات توجہ سے سنی، بلکہ ان کی مہمان نوازی بھی اس انداز میں کی کہ وہ خود اپنے ماضی کے رویے پر شرمندہ ہوئے۔ اس کی ایک مثال طائف سے آنے والے وفد کی ہے، جس کے ساتھ آپ ﷺ نے عدل و انصاف، امن، امدادِ باہمی، ایفائے عہد، حریتِ فکر اور غیر جانبداری جیسے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے معاملات طے کیے۔

مذاکرات میں نرمی اور معاملہ فہمی: وفود سے معاملات طے کرتے وقت آپ ﷺ نے "کچھ لو، کچھ دو" کے اصول کو بھی اپنایا۔ اس کی مثال ہوازن کے وفد کے ساتھ ہونے والے مذاکرات ہیں، جو طائف کی جنگ کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اپنے مال و قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آپ ﷺ نے ان سے طویل گفت و شنید کی، بعض مطالبات تسلیم کیے اور بعض کو رد فرمایا۔ اس حوالے سے صحیح بخاری میں ایک طویل حدیث بھی ملتی ہے، جس میں آپ ﷺ نے ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کا تذکرہ فرمایا ہے۔

امین اور دیانت دار افراد کی تعیناتی: جب نجران کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گیا، تو انھوں نے درخواست کی کہ ان کے ساتھ کوئی امین شخص بھیجا جائے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو ان کے ساتھ روانہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: یہ میری امت کے امین ہیں۔ اس طرح آپ ﷺ نے سفارتی امور میں بہترین افراد کا انتخاب فرمایا۔

قبائلی شناخت اور روایات کا احترام: قبائل اپنے وفود میں نامور افراد، سردار، شعرا، خطبا اور باشعور شخصیات کو شامل کر کے بھیجتے تھے۔ وہ اپنے روایتی لباس اور انداز کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں مطیع ہو کر آتے، لیکن اپنی روایات کی پاسداری بھی کرتے۔ آپ ﷺ نے ان کے ثقافتی پس منظر کا خیال رکھا، ان کی عزت و تکریم کی، ان کی بہترین مہمان نوازی فرمائی اور ان کے رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سے معاملات طے کیے۔

دعاؤں اور خیر خواہی کا عملی اظہار: آپ ﷺ نہ صرف وفود کی گرمجوشی سے میز بانی فرماتے بلکہ ان کے لیے دعا بھی کیا کرتے تھے۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ آپ ﷺ ان کی دنیا اور آخرت، دونوں میں بھلائی چاہتے ہیں۔ مسند احمد کی حدیث (حدیث نمبر ۱۸۸۳۴) کے مطابق، آپ ﷺ نے بجیلہ قبیلے کی آمد پر ان کے لیے دعا فرمائی تھی۔ یہی خیر خواہی کا انداز اکثر وفود کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا، جو آپ ﷺ کے مقصدِ نبوت کا اصل ہدف تھا۔

وفود کا پر تپاک استقبال: آپ ﷺ وفود کو دلی مسرت کے ساتھ خوش آمدید کہتے۔ صحیح بخاری (حدیث نمبر ۶۱۷۶) میں مذکور ہے کہ جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد حاضر ہوا، تو آپ ﷺ نے انھیں "مرحبا" کہہ کر خوش آمدید کہا اور فرمایا: نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرو۔ یہ رویہ وفود سے آپ ﷺ کے دلی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

اسلام کی ترویج اور تبلیغ میں وفود کا کردار: آپ ﷺ کے حسنِ سلوک اور شفقت کا یہ اثر ہوتا کہ وفود میں شامل افراد نہ صرف خود اسلام قبول کرتے بلکہ

اپنے علاقوں میں جا کر اس کی تبلیغ بھی کرتے۔ ان کے ذریعے دینِ اسلام کی تعلیمات تیزی سے پھیلیں، اور ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی۔ اس کے نتیجے میں تعلیم و تربیت کا باضابطہ سلسلہ بھی شروع ہوا۔ دور دراز سے مسلمان بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر احکامِ دین سیکھتے اور اپنے قبیلوں کو سکھاتے۔ بعد میں انھی افراد نے دنیا کے مختلف خطوں میں جا کر اسلام کا پیغام پہنچایا۔

ایک مؤثر خارجہ پالیسی اور سفارتی حکمتِ عملی: آپ ﷺ کا وفود کے ساتھ طرزِ عمل ایک بہترین خارجہ پالیسی اور سفارتی حکمتِ عملی کا عملی نمونہ تھا۔ کسی بھی حکمتِ عملی کی کامیابی کا اندازہ اس کے نتائج سے لگایا جاتا ہے، اور تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ آپ ﷺ نے وفود کے سامنے دعوتِ حق کو نہایت دانائی سے پیش کیا۔ ان کی قبائلی اور علاقائی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے دعوت دی، جس کے نتیجے میں ایک بڑی تعداد حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئی۔

***

بنی ثقیف کا وفد اور آپ ﷺ کا حسنِ سلوک

سیرت کی کتابوں میں دو اہم وفود کا ذکر ملتا ہے: بنی ثقیف اور نجران کے عیسائیوں کا وفد، جو مدینہ منورہ آیا۔ ان دونوں واقعات میں ہمارے لیے بے حد مفید رہنمائی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے ان وفود سے طویل مذاکرات کیے، بعض مطالبات مسترد فرمائے اور بعض کو قبول فرمایا۔ یہاں ہم بنی ثقیف کے وفد کی آمد اور اس کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو کہ آپ ﷺ نے کس دانشمندی کے ساتھ اپنے سب سے بڑے دشمن قبیلے سے معاملات طے کیے اور کیسے محض ایک سال کے اندر بنی ثقیف مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو گیا۔

عرب میں بنی ثقیف کو عزت و شان حاصل تھی۔ وہ نہایت طاقتور جنگجو تھے اور کوئی قبیلہ ان سے جنگ کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ طائف میں آپ ﷺ کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوا تھا، اس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ تاہم، جب بنی ثقیف کا وفد مدینہ پہنچا تو یہ ایک بڑی خبر تھی، جس پر تمام مسلمان بے حد خوش تھے۔ ان وفود کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا تاکہ وہ اسلام کے ماحول کو قریب سے دیکھ سکیں اور قرآن کی تعلیمات سن سکیں۔

اس واقعے کا تفصیلی ذکر سیرت ابن ہشام (جلد دوم، صفحہ ۳۷۱) میں ملتا ہے، جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

بنی ثقیف طائف میں آباد ایک طاقتور قبیلہ تھا۔ جب آپ ﷺ طائف سے واپسی پر تھے، تو راستے میں حضرت عروہ بن مسعود ثقفیؓ سے ملاقات ہوئی۔ وہ طائف جا رہے تھے۔ انھوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اپنے قبیلے میں اسلام کی دعوت دینے کی اجازت طلب کی۔

آپ ﷺ نے اجازت تو دی، لیکن ساتھ ہی فرمایا: تمہاری قوم سخت مزاج ہے اور اپنے عقائد پر پختہ یقین رکھتی ہے، وہ تم سے لڑیں گے۔

یہ آپ ﷺ کی بہترین حکمت عملی تھی کہ انھیں ممکنہ رد عمل سے آگاہ کر دیا۔ حضرت عروہؓ پر یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوگا، مگر جب انھوں نے اپنی قوم میں اسلام کی دعوت دی تو انھیں شہید کر دیا گیا۔

حضرت عروہ بن مسعود ثقفیؓ کی شہادت کی خبر جب آپ ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں سورہ یٰسین میں آیا ہے۔

بنی ثقیف قبیلہ کئی مہینوں تک خاموش رہا، لیکن اس دوران جزیرۃ العرب کے کئی دیگر قبائل اسلام قبول کر چکے تھے۔ جب بنی ثقیف نے دیکھا کہ چاروں طرف اسلام پھیل رہا ہے اور وہ اب مزید مزاحمت کے قابل نہیں رہے، تو انھوں نے صلح کا فیصلہ کیا۔

بنی ثقیف کا وفد مدینہ میں: بنی ثقیف نے عبد یالیل کی قیادت میں سات افراد پر مشتمل ایک وفد مدینہ بھیجا۔ سیرت ابن ہشام میں اس وفد کی تفصیلات درج ہیں، جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی ان سے پہلی ملاقات، حضرت ابو بکرؓ کا آپ ﷺ کو اطلاع دینا، بنی ثقیف کی شرائط کا تذکرہ، مسجد نبوی کے ایک گوشے میں ان کا قیام، یہ سب تفصیلات شامل ہیں۔

بنی ثقیف ابتدائی طور پر اسلام کے سخت مخالف تھے۔ فتح مکہ کے بعد بھی غزوہ حنین میں انھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے عقائد پر کس قدر سختی سے کاربند تھے۔ یہی قبیلہ، جس نے طائف میں آپ ﷺ کو بے پناہ تکلیف دی تھی، اب مدینہ میں آپ ﷺ کے حضور حاضر تھا۔ آپ ﷺ نے ماضی کو

فراموش کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور انھیں مسجد نبوی میں ٹھہرنے کی اجازت دی۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ گفت و شنید کے لیے حضرت خالد بن سعید بن عاصؓ کو مقرر کیا، جنھوں نے ان کے ساتھ مذاکرات کیے اور صلح کی شرائط طے کیں۔ بنی ثقیف کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ ان کے بتوں کو نہ گرایا جائے، جسے آپؐ نے سختی سے مسترد کر دیا۔ تاہم، آپ ﷺ نے ان کے قبیلے کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو سردار مقرر فرمایا، حالانکہ وہ سب سے کم عمر تھے۔

بنی ثقیف کا قبولِ اسلام اور اس کے اثرات: یہ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک عظیم نمونہ تھا کہ جو قبیلہ کل تک اسلام دشمنی میں سب سے آگے تھا، وہ اب اسلام قبول کر چکا تھا۔ بنی ثقیف کے افراد، جو کبھی آپ ﷺ کے شدید مخالف تھے، اب آپ کے جاں نثار صحابہؓ میں شامل ہو چکے تھے۔ یہاں ہمیں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی، درگزر، صبر، اور بہترین سفارت کاری کا عملی مظاہرہ نظر آتا ہے، جس کی بدولت ایک دشمن قبیلہ اسلام کا علم بردار بن گیا۔

بنی ثقیف کا قبولِ اسلام صرف ایک سیاسی یا قبائلی معاملہ نہیں تھا، بلکہ یہ نبی کریم ﷺ کی بے مثال حکمتِ عملی اور صبر کا نتیجہ تھا۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ؛

- ❖ آپ ﷺ نے ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر کے انھیں اسلام کی روشنی میں داخل ہونے کا موقع دیا۔
- ❖ آپ ﷺ نے قبائلی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے ساتھ نرمی اور دانائی سے معاملہ کیا۔

❖ آپ ﷺ نے انھیں سفارتی حکمتِ عملی کے ساتھ اسلام میں داخل کیا، جس کا نتیجہ عظیم فتح کی صورت میں نکلا۔

یہی آپ ﷺ کی عظمت، فراست اور سفارت کاری کا سب سے بڑا ثبوت ہے، جس نے دشمنوں کو دوست بنا دیا اور اسلام کو جزیرۃ العرب میں ایک ناقابلِ تسخیر قوت بنا دیا۔

بنی ثقیف کے ساتھ جو معاہدہ ہوا وہ سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام میں بیان کیا گیا ہے۔

عہد نامہ بنی ثقیف:

> "یہ عہد نامہ ہے محمد نبی رسول کا خدا کی طرف سے مومنوں کے واسطے کہ یہاں کی گھاس کاٹی جائے اور نہ یہاں کے جانور کا شکار کیا جائے۔ اور جو شخص ایسا کرتا ہوا پایا جائے اس کو کوڑے لگیں گے اور کپڑے اتار لیے جائیں گے اور اگر اور زیادہ زیادتی کرے گا تب وہ گرفتار کر کے محمد رسول خدا کی خدمت میں بھیجا جائے گا۔ یہ حکم محمد نبی رسول خدا کا ہے اور انھی کے حکم سے اس فرمان کو خالد بن سعیدؓ نے لکھا ہے۔ بس ہر شخص پر لازم ہے اس فرمان کے خلاف نہیں کرے نہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا یہ حکم محمد رسول خدا ﷺ کا ہے۔"

یہ معاہدہ بنی ثقیف کے اسلام قبول کرنے کے بعد کی جانے والی سفارتی اور سماجی حکمتِ عملی کی بہترین مثال ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ نے اس معاہدے کو تفصیل سے تحریر کیا، اور اس کے نکات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے نہ صرف بنی ثقیف کو ایک محفوظ اور مساوی حیثیت دی بلکہ ان کے حقوق اور خود مختاری کو بھی تسلیم کیا۔

یہ معاہدہ درج ذیل اصولوں پر مبنی تھا:

1. جان ومال کی حفاظت: بنی ثقیف کی وادیوں اور کھیتوں سے کسی بھی چیز کو لینا حرام قرار دیا گیا۔ان کے علاقے میں کسی بھی قسم کا شکار ممنوع تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی زمین کو ایک محفوظ علاقہ قرار دیا گیا۔

2. ظلم اور چوری کی ممانعت: ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کا مال چوری ہو گا۔اسلامی ریاست میں ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی۔

3. امن وامان اور خود مختاری: ان کے خلاف کوئی خفیہ سازش یا حملہ نہیں کیا جائے گا، جو ایک مضبوط سفارتی تعلقات کی علامت تھی۔وہ اپنے علاقے میں عمارتیں اور دیگر ترقیاتی کام کرنے میں آزاد ہوں گے۔

4. فوجی خدمات سے استثنا: انھیں کسی جنگ میں شرکت کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا، جو ایک منفرد شرط تھی، کیونکہ زیادہ تر معاہدوں میں قبائل کو فوجی معاونت فراہم کرنی ہوتی تھی۔

5. مساویانہ حیثیت: وہ مسلمانوں میں ایک آزاد جماعت کے طور پر شامل ہوں گے، جہاں چاہیں شامل ہو سکتے ہیں اور جہاں چاہیں داخل ہو سکتے ہیں، بغیر کسی پابندی کے۔

6. قیدیوں کے حقوق: اگر ان کے پاس کوئی قیدی ہو، تو وہ باقی قبائل کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہوں گے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔

7. تجارت اور معیشت کی خود مختاری: ان کی منڈیاں اور تجارتی سرگرمیاں ان کے اپنے علاقوں میں برقرار رہیں گی، جو ان کے اقتصادی استحکام کے لیے ضروری تھا۔

8. قیادت کا حق: اگر انھیں کسی موقع پر اپنا امیر منتخب کرنا پڑا تو وہ خود ہی اپنے میں سے کسی کو منتخب کریں گے، جو ایک بڑی خود مختاری کی علامت تھی۔

9. دیگر شرائط: معاہدے میں قرضوں اور مالی معاملات کے حوالے سے بھی شرائط درج تھیں، تاکہ ان کے اقتصادی حقوق کو بھی تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

اس معاہدے کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ یہ معاہدہ ہمیں نبی کریم ﷺ کی مدبرانہ قیادت، عدل، اور سفارتی حکمتِ عملی کا ایک بہترین نمونہ فراہم کرتا ہے۔ اس میں:

بنی ثقیف کے جان و مال کی حفاظت، ان کی معاشی و سماجی خودمختاری، ان کے ساتھ امن و عہد کی پاسداری، ان کی ثقافت اور قیادت کا احترام، یہ سب کچھ اس معاہدے میں شامل تھا، جو اسلامی عدل و مساوات کی اعلیٰ مثال ہے۔

بنی ثقیف اور ان کے بت

بنی ثقیف کے وفد اور ان کے ایمان لانے کے متعلق سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنی ثقیف کے وفد نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ان کے بڑے بت کو تین سال تک نہ گرایا جائے، لیکن آپ ﷺ نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بنی ثقیف نے یہ بھی درخواست کی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بتوں کو نہ توڑیں گے، اور آپ ﷺ نے ان کی یہ شرط قبول کر لی۔ بعد میں، آپ ﷺ نے حضرت ابو سفیان بن حربؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو اس بت کو توڑنے کے لیے بھیجا۔

بنی ثقیف کے ایک اور مطالبے میں یہ بھی شامل تھا کہ انھیں نماز سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: جس دین میں نماز نہ ہو، اس دین میں کچھ نہیں۔ چنانچہ، آپ ﷺ نے اس مطالبے کو بھی رد کر دیا۔ اس واقعے کی مکمل تفصیل

سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں درج ہے۔ یہاں اس واقعے کے تناظر میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

بنی ثقیف کے ساتھ آپ ﷺ کے معاہدے سے سامنے آنے والے اہم نکات:

سفارت کاری اور حکمتِ عملی: بنی ثقیف ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے ابتدا میں آپ ﷺ کی شدید مخالفت کی۔ ان کے ظلم و ستم کی داستانیں دل دہلا دینے والی ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے مطابق، آپ ﷺ نے فرمایا کہ غزوہ اُحد کے دن سے زیادہ سخت دن وہ تھا جب میں طائف سے واپس آیا۔

اب وہی لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے، اور آپ ﷺ نے ان کے ماضی کو فراموش کرتے ہوئے نہ صرف انھیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا بلکہ ان کی بہترین مہمان نوازی بھی کی۔ یہ سب کچھ آپ ﷺ کی سفارت کاری اور خارجہ پالیسی کا حصہ تھا، جس کا مقصد ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر لوگوں کو اسلام کے قریب کرنا تھا، اور یہی آپ ﷺ کو آپ کے رب کا حکم تھا۔

علاقائی خود مختاری اور امن کی ضمانت: اس معاہدے میں واضح طور پر درج کیا گیا کہ طائف کو مفتوحہ علاقہ نہیں سمجھا جائے گا اور نہ ہی کوئی مسلمان وہاں جا کر ان کے مال و دولت پر قبضہ کرے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ ﷺ کا مقصد صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بندگی کی طرف دعوت دینا تھا، نہ کہ کسی مادی فائدے کے حصول کے لیے جنگ کرنا۔ اس حکمت عملی سے بنی ثقیف کے دلوں میں آپ ﷺ کی عزت و وقار مزید بڑھ گیا اور وہ اخلاص کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے۔

بنیادی اسلامی اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں: معاہدے میں اسلام کے بنیادی عقائد پر کسی قسم کی رعایت نہیں دی گئی، جیسے نماز کا معاملہ یا بت پرستی کا خاتمہ۔ البتہ، انھیں سیاسی، اقتصادی، اور سماجی امور میں مکمل آزادی دی گئی اور تحفظ فراہم کیا گیا۔

بت شکنی اور نفسیاتی حکمت عملی: جب آپ ﷺ نے حکم دیا کہ لات (ان کا سب سے بڑا بت) گرایا جائے تو بنی ثقیف خوفزدہ ہو گئے، کیونکہ وہ اسے اپنا معبود سمجھتے تھے اور ان کے دل ابھی مکمل طور پر توحید کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "ہم یہ کام خود نہیں کر سکتے"، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم خود اسے توڑیں گے۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو بھیجا، اور انھوں نے جا کر لات کو گرا دیا۔ یہاں آپ ﷺ نے ان کی یہ شرط قبول کر لی کہ وہ خود بتوں کو نہیں توڑیں گے، جو ایک نفسیاتی حکمت عملی تھی تاکہ وہ خود کو کسی دباؤ میں محسوس نہ کریں اور اسلام کو مزید آسانی سے قبول کریں۔

قبائلی روایات کا احترام اور صبر و تحمل: آپ ﷺ نے بنی ثقیف کے ساتھ بے حد صبر و تحمل سے گفت و شنید کی، ان کے قبائلی رسم و رواج کا احترام کیا، اور ان کے خدشات کو دور کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے سماجی اور ثقافتی پس منظر کو مد نظر رکھ کر بات چیت کی، تاکہ انھیں اسلام کی طرف مائل کیا جا سکے۔

ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر امن و اصلاح کی راہ: آپ ﷺ نے بنی ثقیف کے وفد کے ساتھ بات چیت کے دوران کبھی بھی ان کے ماضی کے مظالم کی یاد دہانی نہیں کروائی۔ آپ ﷺ کا مقصد معافی، سفارت کاری، دیرپا تعلقات، اور پرامن مذاکرات کے ذریعے انھیں اسلام کی طرف راغب کرنا تھا۔

دیگر قبائل کے لیے مثال: جب جزیرۃ العرب کے دوسرے قبائل نے دیکھا کہ اگر بنی ثقیف کو معافی مل سکتی ہے تو انھیں بھی مل سکتی ہے، تو کئی مخالف قبائل نے آپ ﷺ کی خدمت میں آکر اسلام قبول کر لیا۔

اسلام کی ترویج میں آپ ﷺ کی صبر و حکمت: بنی ثقیف جیسے طاقتور قبیلے کا اسلام قبول کرنا، آپ ﷺ کی پر امن تبلیغ، صبر، اور حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ آپ ﷺ نے ان پر زبردستی نہیں کی بلکہ احترام، بردباری اور نرمی سے انھیں قائل کیا، جس کی بدولت وہ ایک مضبوط اسلامی ریاست کا حصہ بن گئے۔

اسلامی حکومت کے استحکام اور معاشی فوائد: بنی ثقیف کے اسلام قبول کرنے کے بعد، جزیرۃ العرب میں اب کوئی طاقت آپ ﷺ کے خلاف باقی نہ رہی۔ اس معاہدے کے ذریعے بنی ثقیف نے آپ ﷺ کی حاکمیت کو قبول کیا، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے پورے جزیرۃ العرب میں اسلامی حکومت کے استحکام کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ اس سے مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی فوائد بھی حاصل ہوئے اور خوف کی فضا ختم ہو گئی۔

***

معاہدہ نجران:
عیسائیوں کے وفد کی مدینہ منورہ آمد

نو ہجری میں ایک اہم معاہدہ اہلِ نجران کے ساتھ ہوا۔ یہ معاہدہ صوبہ نجران میں بسنے والے عیسائیوں اور آپ ﷺ کے درمیان طے پایا۔ نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ آیا، جہاں مسلمانوں نے ان کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ اس وفد کا قیام مسجدِ نبوی میں ہوا، اور وہاں آپ ﷺ نے ان سے ملاقات فرمائی۔ آپ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انھیں تفصیل سے بتایا اور ان کے تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات دیے۔ یہ در حقیقت عیسائیوں پر حق واضح کرنے کی ایک کوشش تھی، جو علمی لحاظ سے کامیاب رہی، لیکن انھوں نے جان بوجھ کر اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کے بارے میں قرآن کریم میں آیات نازل فرمائیں۔

اس وفد کی آمد کا ذکر درج ذیل حدیث میں بھی ملتا ہے؛

حَدَّثَنِي عَبَّاسُ بْنُ الْحُسَيْنِ، حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ آدَمَ، عَنْ إِسْرَائِيلَ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ صِلَةَ بْنِ زُفَرَ، عَنْ حُذَيْفَةَ، قَالَ: جَاءَ الْعَاقِبُ، وَالسَّيِّدُ صَاحِبَا نَجْرَانَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرِيدَانِ أَنْ يُلَاعِنَاهُ، قَالَ: فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ: لَا تَفْعَلْ، فَوَاللَّهِ لَئِنْ كَانَ نَبِيًّا فَلَاعَنَّا لَا نُفْلِحُ نَحْنُ، وَلَا عَقِبُنَا مِنْ بَعْدِنَا، قَالَا: إِنَّا نُعْطِيكَ مَا سَأَلْتَنَا، وَابْعَثْ مَعَنَا رَجُلًا أَمِينًا وَلَا

تَبْعَثْ مَعَنَا إِلَّا أَمِينًا، فَقَالَ:" لَأَبْعَثَنَّ مَعَكُمْ رَجُلًا أَمِينًا حَقَّ أَمِينٍ"، فَاسْتَشْرَفَ لَهُ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ:" قُمْ يَا أَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ"، فَلَمَّا قَامَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:" هَذَا أَمِينُ هَذِهِ الْأُمَّةِ -"صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۳۸۰.

مجھ سے عباس بن حسین نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ بن آدم نے بیان کیا، ان سے اسرائیل نے، ان سے ابواسحاق نے، ان سے صلہ بن زفر نے اور ان سے حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نجران کے دو سردار عاقب اور سید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مباہلہ کرنے کے لیے آئے تھے لیکن ایک نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ اللہ کی قسم! اگر یہ نبی ہوئے اور پھر بھی ہم نے ان سے مباہلہ کیا تو ہم پنپ نہیں سکتے اور نہ ہمارے بعد ہماری نسلیں رہ سکیں گی۔ پھر ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جو کچھ آپ مانگیں ہم جزیہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ کوئی امین بھیج دیجیے، جو بھی آدمی ہمارے ساتھ بھیجیں وہ امین ہونا ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ایک ایسا آدمی بھیجوں گا جو امانت دار ہو گا بلکہ پورا پورا امانت دار ہو گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظر تھے، آپ نے فرمایا کہ ابوعبیدہ بن الجراح! اٹھو۔ جب وہ کھڑے ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اس امت کے امین ہیں۔

نجران کے وفد کے بارے میں ایک آیت سورۃ ال عمران میں بھی ملتی ہے (آیت نمبر ۶۱)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ۔ (آل عمران ۳:۶۱)

یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمدؐ! اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

اس آیت کی تفسیر سید مودودیؒ نے تفہیم القران میں کچھ اس طرح سے لکھی ہے؛

فیصلے کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفد نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا جواب بھی ان لوگوں کے پاس نہ تھا۔ مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امر واقعے کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہر گز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہل وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل

بھی ہو گئے تھے یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلے میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری، جن کے تقدس کا سکہ دور دور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

تفسیر عثمانی میں اس آیت کی تفسیر کچھ اس طرح سے بیان کی گئی ہے؛

اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نصاریٰ نجران اس قدر سمجھانے پر بھی اگر قائل نہ ہوں تو ان کے ساتھ مباہلہ کرو جس کی زیادہ مؤثر اور مکمل صورت یہ تجویز کی گئی کہ دونوں فریق اپنی جان سے اور اولاد سے حاضر ہوں اور خوب گڑگڑا کر دعا کریں کہ جو کوئی ہم میں جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت اور عذاب پڑے۔ یہ مباہلے کی صورت پہلے ہی قدم پر اس بات کا اظہار کر دے گی کہ کون فریق کس حد تک خود اپنے دل میں اپنی صداقت و حقانیت پر وثوق و یقین رکھتا ہے۔ چناچہ دعوت مباہلہ سُن کر وفد نجران نے مہلت لی کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ آخر مجلس مشاورت میں ان کے ہوشمند تجربہ کار ذمہ داروں نے کہا کہ اے گروہ نصاریٰ! تم یقیناً دلوں میں سمجھ چکے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی مرسل ہیں اور حضرت مسیحؑ کے متعلق انھوں نے صاف صاف فیصلہ کن باتیں کہی ہیں تم کو معلوم ہے کہ

اللہ نے بنی اسماعیل میں نبی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ بعید نہیں یہ وہی نبی ہوں، پس ایک نبی سے مباہلہ و ملاعنہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہ ہی نکل سکتا ہے کہ ان کا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذاب الٰہی سے نہ بچے۔ اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچ کر رہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی طاقت ہم میں نہیں"۔ یہ ہی تجویز پاس کر کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ آپؐ حضرت حسن، حسین، فاطمہ، علیؓ کو ساتھ لیے باہر تشریف لا رہے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے، ان سے مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو، ورنہ ایک نصرانی بھی زمین پر باقی نہ رہے گا۔ آخر انھوں نے مقابلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔ حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر ان پر برستی اور خدا تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال کر دیتا۔ ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔ (تنبیہ) قرآن نے یہ نہیں بتلایا کہ مباہلے کی صورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی اختیار کی جاسکتی ہے اور یہ کہ مباہلے کا اثر کیا ہمیشہ وہی ظاہر ہونا چاہیے جو آپؐ کے مباہلے میں ظاہر ہونے والا تھا۔ بعض سلف کے طریق عمل اور بعض فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلے کی مشروعیت اب بھی باقی ہے مگر ان چیزوں

میں جن کا ثبوت بالکل قطعی ہو، یہ ضروری نہیں کہ مباہلے میں بچوں، عورتوں کو بھی شریک کیا جائے۔ نہ مباہلین پر اس قسم کا عذاب آنا ضروری ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مباہلے پر آتا۔ بلکہ ایک طرح کا اتمام حجت کر کے بحث و جدال سے الگ ہو جانا ہے۔ اور میرے خیال میں مباہلہ ہر ایک کاذب کے ساتھ نہیں صرف کاذب معاند کے ساتھ ہونا چاہیے۔

ابن کثیر کہتے ہیں ثم قال تعالیٰ اٰمراً رسوله صلی الله علیه وسلم ان یباهل من عاند الحق فی امر عیسیٰ بعد ظهور البیان والله اعلم۔

جعفر سبحانی نے اس وفد کی آمد کی وجہ تفصیل سے بیان کی ہے۔ ان کے مطابق، نجران ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا، جہاں 72 دیہاتوں میں لوگ آباد تھے۔ یہ خطہ حجاز اور یمن کی سرحد پر واقع تھا اور جزیرۃ العرب میں حجاز کا واحد علاقہ تھا جہاں عیسائی آباد تھے۔ یہاں کے لوگوں نے بت پرستی ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ جب آپ ﷺ نے دنیا کے مختلف حکمرانوں کو دعوتی خطوط بھیجے، تو اسی دوران نجران کے بشپ ابو حارث کو بھی خط لکھا اور وہاں کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی[62]۔ جب یہ خط نجران کے بشپ تک پہنچا تو اس نے مشاورت کے لیے مذہبی شخصیات کا اجلاس بلایا۔ مشاورت کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ نجران کا ایک وفد مدینہ جائے تاکہ وہ براہِ راست آپ ﷺ سے ملاقات کر کے گفتگو کرے۔ اس مقصد کے لیے نجران کے ساٹھ معزز اور دانشمند افراد کو منتخب کیا گیا، جن کی قیادت تین مذہبی رہنما کر رہے تھے۔

---

[62] (اس خط کا ذکر جعفر سبحانی نے بحوالہ: البدایہ النہایہ، ص ۵۳، بہار الانوار، ج ۲۱، ص ۲۸۵)

یہ وفد نو ہجری میں مدینہ منورہ پہنچا، اور اس کی سربراہی تین اہم افراد کر رہے تھے، جن میں ایک شخص عاقب تھا جو وفد کا امیر تھا۔ وفد نے مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ سے ملاقات کی اور سوالات و جوابات کا سلسلہ ہوا۔ آپ ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دی، مگر انھوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ طویل گفت و شنید کے باوجود انھوں نے آپ ﷺ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

جب نجران کے وفد نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا، تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے انھیں مباہلے کی دعوت دی، جس کا ذکر سورہ آل عمران (آیت ۶۱) میں موجود ہے۔ مگر عیسائیوں نے باہمی مشورے کے بعد مباہلے سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس واقعے کا ذکر احادیث میں بھی ملتا ہے۔ بعد ازاں، آپ ﷺ نے ان سے جزیہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس کے بدلے میں انھیں ان کے دین پر قائم رہنے کی مکمل آزادی دی۔ اس پر نجران کے نمائندوں نے کہا کہ آپ ﷺ اپنے کسی ایماندار شخص کو ہماری طرف بھیج دیں۔ اس پر آپ ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو نجران بھیج دیا۔

یہ پہلا وفد تھا جو عیسائیوں پر مشتمل تھا، کیونکہ اس سے قبل آنے والے وفود میں اکثر دینِ ابراہیمی کے پیروکار تھے، جو مشرک تھے لیکن بعد میں اسلام قبول کر چکے تھے۔ نجران کے عیسائیوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا، مگر آپ ﷺ نے انھیں قطعی طور پر مجبور نہیں کیا، نہ ہی جنگ کی دھمکی دی۔ بلکہ آپ ﷺ نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے تحفظات کو کھل کر سننے اور بیان کرنے کا موقع دیا۔

بعد ازاں، ایک باہمی معاہدہ طے پایا، جسے حضرت عروہ بن زبیرؓ نے تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اس معاہدے کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- یہ تحریر آپ ﷺ کی طرف سے ایک حکم سمجھی جائے گی، اور ہر آزاد و غلام، کالا و گورا، عرب و غیر عرب اس پر عمل کرنے کا پابند ہو گا۔
- اہلِ نجران سالانہ دو ہزار جوڑے (لباس) بطور خراج دیں گے، جن میں ایک ہزار مردوں کے اور ایک ہزار عورتوں کے ہوں گے۔
- اہلِ نجران خود خراج کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوں گے۔
- مسلمان وفود نجران میں بیس راتوں تک قیام کر سکتے ہیں، اور اس دوران تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس زرہیں استعمال کے لیے لیں گے۔
- اگر میرے (آپ ﷺ کے) نمائندے کوئی چیز ادھار لیں گے، اور وہ ضائع ہو جائے تو اس نقصان کے ذمہ دار بھی میرے نمائندے ہوں گے۔
- اہلِ نجران کے خون، مال، عبادت گاہوں، مذہبی رہنماؤں اور تمام حقوق کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے قبول کی۔
- ہر چیز کی حفاظت کی ذمہ داری بھی آپ ﷺ پر ہو گی، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔
- اہلِ نجران کے کسی بھی پادری، بشپ یا مذہبی رہنما کو معزول نہیں کیا جائے گا۔
- انھیں جنگ میں حصہ لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، نہ ہی ان سے عشر (زکوٰۃ) لیا جائے گا، اور نہ ہی کوئی قافلہ ان کی زمینوں کو نقصان پہنچائے گا۔
- ان کے مال میں سود کی آمیزش نہیں ہو گی، اور جو سود کھائے گا، اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں بلکہ وہ خود اس کا ذمہ دار ہو گا۔
- یہ معاہدہ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت معیقیبؓ کے دستخط سے تحریر کیا گیا تھا۔

معاہدۂ نجران اور آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی

یہ واقعہ سیرت کی اکثر کتب میں تفصیل سے موجود ہے، لہٰذا یہاں اس کا ذکر کرنے کے بجائے، اس معاہدے کے محرکات اور اس موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری پر روشنی ڈالنا زیادہ مفید ہوگا۔ میں نے جو کچھ سمجھا، وہ یہاں بیان کر رہا ہوں، وَاللّٰہُ اَعلَمُ بِالصَّواب۔

1. عیسائیوں کے خوف کا خاتمہ اور بین المذاہب تعلقات: آپ ﷺ کی طرف سے نجران کے عیسائیوں کو جان و مال کی مکمل حفاظت کی ضمانت دی گئی، جس میں ان کی جائیداد اور اثاثوں پر ان کا مکمل اختیار برقرار رکھنے کی یقین دہانی بھی شامل تھی۔ اس اعلان نے جزیرۃ العرب کے تمام عیسائیوں کے دلوں سے یہ خوف نکال دیا کہ مسلمان ان کے دشمن ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، یہ پیغام پھیل گیا کہ آپ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ (میثاقِ مدینہ) اور مشرکینِ مکہ کے ساتھ (بیعتِ رضوان) جیسے معاہدے کیے، بالکل اسی طرح آپ ﷺ نے عیسائیوں کے ساتھ بھی صلح اور بقائے باہمی کا معاہدہ کیا۔

2. مذہبی آزادی کی ضمانت: اس معاہدے میں یہ واضح کیا گیا کہ عیسائیوں کے مذہبی ادارے انھی کی نگرانی میں کام کریں گے، اور مسلمان ان کے گرجا گھروں اور مال و دولت کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ آپ ﷺ نہ صرف دیگر آسمانی مذاہب کا احترام کرتے تھے، بلکہ ان کی عبادت گاہوں کو کسی بھی قسم کے نقصان سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہاں ایک اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا بت پرستی کے

بارے میں رویہ عیسائیت سے مختلف تھا۔ جب بنی ثقیف نے بار بار درخواست کی کہ ان کے بتوں کو باقی رکھا جائے، تو آپ ﷺ نے صاف انکار کر دیا اور انھیں گرائے جانے کا حکم دیا۔ لیکن نجران کے عیسائیوں کے معاملے میں آپ ﷺ نے ان کے عقائد اور عبادت گاہوں کو مکمل تحفظ دیا۔ یہ رویہ جزیرۃ العرب میں آباد عیسائیوں کے لیے انتہائی خوشی اور اطمینان کا باعث بنا۔

3. فوجی خدمات سے استثنا اور جزیے کی شرط: اس معاہدے میں یہ واضح طور پر تسلیم کیا گیا کہ عیسائیوں پر فوجی خدمات فرض نہیں ہوں گی، یعنی ریاستِ مدینہ کی جنگی مہمات میں انھیں شریک نہیں ہونا پڑے گا۔ البتہ، انھیں ذمی (اقلیتی شہری) کی حیثیت سے ایک مخصوص رقم (جزیہ) ریاست کو ادا کرنا ہوگی۔ یہ شرط اہلِ نجران کے لیے ایک اطمینان بخش معاملہ تھی، کیونکہ وہ نہ صرف جنگ سے محفوظ رہے، بلکہ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی بھی دی گئی۔

4. فوج کی عدم تعیناتی اور مال و دولت کا تحفظ: نجران کے لوگوں کو یہ ضمانت دی گئی کہ ان کے علاقوں میں مسلمانوں کی فوج تعینات نہیں کی جائے گی، اور نہ ہی ان کے مال و دولت کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔ یہ اقدام بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے مترادف تھا۔ اس کے علاوہ، معاہدے میں کئی اور ایسے نکات بھی شامل کیے گئے، جو عیسائیوں کے ساتھ منصفانہ اور دوستانہ تعلقات کی بنیاد پر طے کیے گئے تھے۔

5. آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی: امن کو جنگ پر فوقیت: یہ سب آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور خارجہ پالیسی کا حصہ تھا، جس کا بنیادی اصول امن کو جنگ پر ترجیح دینا تھا۔ نجران کے ساتھ معاہدہ آج تک سفارت کاری کی ایک اعلیٰ مثال

کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، کہ کس طرح آپ ﷺ نے نہ صرف عیسائیوں کی مہمان نوازی کی، بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو پروان چڑھایا۔

نجران کے عیسائیوں کے ساتھ آپ ﷺ کے معاہدے میں ایک خوب صورت پیغام چھپا ہوا ہے، جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ یہ آج کے دور میں انسانی حقوق کے علمبرداروں کے لیے بھی ایک سبق ہے، کہ آپ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی حقوق کا جو تصور دیا، وہ آج بھی عدل و انصاف کا اعلیٰ معیار ہے۔

***

غزوہ تبوک: جنگ کے بغیر فتح

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں غزوہ تبوک ایک نہایت اہم اور تاریخی واقعہ ہے۔ یہ اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی اور آخری فوجی مہم تھی، جس میں نبی کریم ﷺ نے براہِ راست شرکت فرمائی۔ اس غزوے کی اہمیت اس لیے بھی نمایاں ہے کہ یہ ایک غیر معمولی سفارتی اور عسکری اقدام تھا، جو اسلامی ریاست کے استحکام اور بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں خاصا مؤثر ثابت ہوا۔

تبوک، جو موجودہ جغرافیائی اعتبار سے سعودی عرب کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے، مدینہ منورہ سے تقریباً ۶۲۷ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے[63]۔ اس دور میں، جب ذرائع نقل و حمل انتہائی محدود تھے، یہ ایک طویل اور دشوار گزار سفر تھا، جس میں سخت موسمی حالات اور دیگر چیلنجز درپیش تھے۔ اس مہم کے دوران نہ صرف اسلامی فوج کو عسکری حکمتِ عملی اپنانا پڑی، بلکہ سفارتی تعلقات کو بھی مؤثر انداز میں استوار کیا گیا۔

غزوہ تبوک کے اسباب، اس کے نتائج اور اس کے سیاسی و سماجی اثرات اسلامی تاریخ میں گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ یہ جنگ اگرچہ عملی طور پر وقوع پذیر نہیں ہوئی، تاہم اس کے نتیجے میں کئی قبائل نے اسلام قبول کیا، اور اسلامی ریاست کی سرحدیں مزید مستحکم ہوئیں۔ اس مہم کے ذریعے نبی اکرم ﷺ نے دوررس

---

[63] فاصلے کا تعین اس پر بھی ہوتا ہے کہ آپ نے کون سا راستہ اختیار کیا ہے۔ میں نے اپریل ۲۰۲۴ء میں تبوک سے مدینہ منورہ تک کا سفر بذریعہ کار کیا تھا۔ اس سفر میں میں نے دیکھا کہ زیادہ تر علاقے صحرا پر مشتمل تھے۔ گوگل کے مطابق تبوک سے مدینہ منورہ ساڑھے چھ سو کلومیٹر ہے۔

حکمتِ عملی اختیار کرتے ہوئے اسلامی ریاست کی دفاعی طاقت کا مظاہرہ کیا اور بین الاقوامی سطح پر اس کے وقار کو بلند کیا۔

اس جنگ کا ذکر کئی احادیث میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری سے ایک حدیث درج ذیل ہے:

(مرفوع) حدثنا مسدد، حدثنا يحيى، عن شعبة، عن الحكم، عن مصعب بن سعد، عن ابيه: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج إلى تبوك واستخلف عليا، فقال: اتخلفني في الصبيان والنساء، قال:" الا ترضى ان تكون مني بمنزلة هارون من موسى؟ إلا انه ليس نبي بعدي"،وقال ابو داود: حدثنا شعبة، عن الحكم، سمعت مصعبا. (حدیث نمبر ۴۴۱۶)

ہم سے مسدد بن مسرہد نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ بن سمیر قطان نے بیان کیا، ان سے شعبہ نے، ان سے حکم بن عتبہ نے، ان سے مصعب بن سعد نے اور ان سے ان کے والد نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے لیے تشریف لے گئے تو علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب بنایا۔ علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے لیے تم ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔ اور ابوداؤد طیالسی نے اس حدیث کو یوں بیان کیا کہ ہم سے شعبہ نے بیان کیا، ان سے حکم بن عتبہ نے اور انھوں نے کہا میں نے مصعب سے سنا۔

اسی جنگ میں جو تین صحابہ اکرامؓ بغیر کسی خاص عذر کے غزوے میں شریک نہ ہوئے تھے کے متعلق قرآن مجید میں سورۃ توبہ ۹:۱۱۸ میں یہ آیت اتری تھی۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

اور اُن تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے، تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے

اس آیت کی تفسیر، تفسیر عثمانی میں کچھ یوں بیان کی گئی ہے:

یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن امیّہ اور مرارہ بن الربیع ہیں جو باوجود مومن مخلص ہونے کے محض تن آسانی اور سہل انگاری کی بناء پر بدون عذر شرعی کے تبوک کی شرکت سے محروم رہے۔ جب حضور ﷺ واپس تشریف لائے تو نہ انھوں نے منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش کیے اور نہ بعض صحابہ کی طرح اپنے آپ کو ستونوں سے باندھا جو واقعہ تھا صاف صاف عرض کر دیا، اور اپنی کوتاہی اور تقصیر کا علانیہ اعتراف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی طرف سے بظاہر اغماض کر کے ان

کے بواطن کو خدا کے سپرد کیا گیا۔ اصحاب سواری کی (یعنی جو مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے) توبہ قبول کرلی گئی۔ اور ان تینوں کا فیصلہ تادیباً کچھ مدت کے لیے ملتوی رکھا گیا۔ پچاس دن گزرنے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی پیچھے رکھے جانے کا یہی مطلب ہے جیسا کہ بخاری میں خود کعب بن مالک سے نقل کیا ہے۔

غزوۂ تبوک: پس منظر، وجوہات اور خارجہ پالیسی

نبی کریم حضرت محمد ﷺ کی سفارت کاری اور خارجہ پالیسی کو سمجھنے کے لیے غزوۂ تبوک کے اسباب اور اس کے پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ اس مہم کی وجوہات جاننے سے پہلے، غزوۂ تبوک کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ہمیں آپ ﷺ اور روم (بازنطینی سلطنت) کے درمیان ٹکراؤ کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہو۔

تبوک کا جغرافیہ اور تاریخی حیثیت

تبوک سعودی عرب کے شمال مغرب میں، اردن کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اس کے شمال میں اردن اور شام، شمال مغرب میں اسرائیل، مغرب میں بحیرۂ احمر، اور جنوب مشرق میں مدینہ منورہ واقع ہے۔ تبوک، جزیرہ نمائے عرب کے شمال مغربی دروازے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم تاریخی شہر ہے، جس کا ذکر عربی شاعری اور تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں، برطانوی قبضے کے بعد عرب افواج نے تبوک کو فتح کیا تھا۔ یہاں متعدد آثارِ قدیمہ موجود ہیں، جن میں قدیم قلعے، محلات اور حجاز ریلوے اسٹیشن شامل ہیں۔ اسی علاقے میں ایک پانچ ہزار سال پرانا قلعہ بھی واقع ہے۔ یہ مہم انتہائی مشکل حالات میں سر کی گئی کیونکہ شدید گرمی کا موسم تھا۔ مدینہ سے ایک طویل سفر درپیش تھا۔ سواری اور زادِ راہ کی کمی تھی، فوجی وسائل محدود تھے۔ اسی

وجہ سے اسے جیش العسرہ (تنگ دستی کا لشکر) بھی کہا جاتا ہے۔ اگر رومیوں کو تبوک میں نہ روکا جاتا، تو وہ آسانی سے مدینہ تک پہنچ سکتے تھے۔

رومی سلطنت: ایک زوال پذیر طاقت

غزوۂ تبوک کو سمجھنے کے لیے روم (بازنطینی سلطنت) کی تاریخ اور اس کے عروج وزوال کا مطالعہ ضروری ہے۔

قرآنِ کریم میں سورۃ الروم میں بھی رومیوں کا ذکر موجود ہے۔ اسلام سے قبل، عرب اور بازنطینی سلطنت کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔ نبی کریم ﷺ نے نبوت سے قبل اپنے چچا کے ساتھ شام کا سفر بھی کیا تھا۔

قسطنطنیہ اور بازنطینی سلطنت، رومی سلطنت کی دو شاخیں تھیں۔ مغربی روم (جو پانچویں صدی عیسوی میں ختم ہو گیا) مشرقی روم (بازنطینی سلطنت) جو مزید ایک ہزار سال تک قائم رہی، یہاں تک کہ عثمانی خلافت نے اسے فتح کر لیا۔ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) بازنطینی دارالحکومت تھا، جسے شہنشاہ Constantine نے بسایا اور عیسائیت کو سرکاری مذہب کا درجہ دیا۔ رومی سلطنت کی سب سے بڑی دشمن ساسانی سلطنت (ایران) تھی، جو مسلسل جنگوں کی وجہ سے کمزور ہو رہی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب اسلام کا ظہور ہوا اور مسلمان ایک طاقت کے طور پر ابھرے۔ ان جنگوں نے روم اور ایران دونوں کو کمزور کر دیا، اور مسلمانوں کے لیے فتوحات کے دروازے کھل گئے۔

اہم سوالات جو ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے:

- رومی سلطنت اتنی جلدی کیوں زوال پذیر ہوئی؟
- عربوں کی فتح کا سبب اسلامی جذبہ تھا یا رومیوں کی کمزوری؟
- یہ جنگ صرف ایک موقع سے فائدہ اٹھانے کے مترادف تھی، یا مسلمانوں کی طویل المدتی حکمتِ عملی کا حصہ تھی؟

بازنطینیوں کی شکست صرف قسطنطنیہ تک محدود رہی، یا مسلمانوں نے اس کے بعد بھی اپنی فتوحات جاری رکھیں؟

یہ تمام سوالات نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

میرے خیال میں غزوۂ تبوک ایک دفاعی اقدام تھا، جس میں مسلمانوں نے رومیوں کی ممکنہ پیش قدمی کو روکنے کے لیے پہل کی۔ رومی سلطنت کا زوال اور مسلمانوں کی فتح، صرف عسکری حکمتِ عملی کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک طویل المدتی خارجہ پالیسی کا حصہ تھا۔ نبی کریم ﷺ کی سفارت کاری نے مسلمانوں کو ایک عالمی طاقت بنانے کی بنیاد رکھی، جو خلفائے راشدین کے دور میں مزید مستحکم ہوئی۔ یہ تمام نکات ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حکمتِ عملی ایک مضبوط، دیرپا اور کامیاب سفارت کاری کا عملی نمونہ تھی۔

ایران: ایک زوال پذیر سلطنت

رومی سلطنت کے بعد، ایران ایک عظیم اور طاقتور سلطنت کے طور پر جانی جاتی تھی۔ تاہم، تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایرانی حکمرانوں کے جابرانہ طرزِ عمل نے عام لوگوں کی زندگی کو شدید مشکلات سے دوچار کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس، عرب ایک آزاد منش قوم تھی، جن پر کسی بیرونی طاقت کی حکمرانی نہ تھی۔

ایران کی مطلق العنان بادشاہت کے برعکس، عربوں میں ایک ابتدائی مشاورتی نظام موجود تھا۔ دار الندوہ اس کی ایک مثال ہے، جو ایک بین القبائلی مشاورتی اسمبلی کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب ایک جمہوریت نما نظام کے ذریعے اپنے معاملات چلاتے تھے، جبکہ ایران میں بادشاہت کا راج تھا۔

جب اسلام کا ظہور ہوا، تو ایران میں خسرو پرویز کی حکومت تھی، جبکہ روم ایک بڑی طاقت کے طور پر موجود تھا۔ یہ دونوں سلطنتیں اس وقت کی دنیا کے ایک بڑے

حصے پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف طویل جنگوں میں مصروف تھیں، جن کا مقصد دنیا پر غلبہ حاصل کرنا تھا۔ ہجرت سے کچھ عرصہ قبل، روم اور ایران کی جنگ کے بارے میں سورۃ الروم میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مشرکینِ مکہ، ایران کی فتح کے خواہشمند تھے، کیونکہ ایرانی مجوس (آگ کے پجاری) تھے اور مشرکین کے زیادہ قریب سمجھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس، مسلمان رومیوں کی فتح کے خواہشمند تھے، کیونکہ رومی اہلِ کتاب (عیسائی) تھے اور مسلمانوں کے عقیدے کے زیادہ قریب سمجھے جاتے تھے۔ (اس موضوع کی مزید تفصیل اس مقالے کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔)

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان طویل جنگوں کا آغاز نوشیروان کے دور میں ہوا اور یہ جنگیں بیس سال سے زائد عرصے تک جاری رہیں۔ ان طویل اور خونریز جنگوں نے دونوں سلطنتوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ مسلسل جنگوں کے باعث معاشی وسائل ختم ہو گئے، معیشت کمزور ہو گئی، اور فوجی طاقت بکھر گئی۔ یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے ایران اور روم کو زوال پذیر کر دیا۔

نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ان حالات سے بخوبی واقف تھے۔ آپ ﷺ نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ دونوں عظیم سلطنتیں جنگوں سے کمزور ہو چکی ہیں، اور یہ وقت مسلمانوں کے لیے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا بہترین موقع ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے روم کے ساتھ ٹکر لینے کا فیصلہ کیا، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت ایک نئی طاقت کے طور پر ابھرنے کا نادر موقع تھا۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایران اور روم اپنی طویل جنگوں کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے، جبکہ عرب ایک نئی طاقت کے طور پر ابھر رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس صورت حال کا درست اندازہ لگایا اور ایک مدبر حکمتِ عملی کے تحت روم کے

خلاف قدم اٹھایا۔ یہ فیصلہ نہ صرف عربوں کی سیاسی طاقت کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بنا، بلکہ آنے والے وقت میں مسلمانوں کی فتوحات کی راہ بھی ہموار کر دی۔

تبوک مہم کا پس منظر

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے تبوک جیسے سخت ترین سفر کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس وقت کے سیاسی حالات پر نظر ڈالنی ہو گی۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ مہم سن ۹ ہجری، رجب کے مہینے میں پیش آئی۔ یہ مقام مدینہ کے شمال میں، موجودہ اردن کی سرحد کے قریب تھا۔ یہ بحیرہ احمر سے تقریباً سو کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے، جہاں آج نیوم شہر بسایا جا رہا ہے۔ یہ علاقہ ایک طرح سے عرب اور روم کی سرحد سمجھا جاتا تھا، اور اس کی جغرافیائی اہمیت اس کا سمندر کے قریب ہونا تھا۔ رومی ایک طاقتور بحری بیڑا رکھتے تھے اور وہ اپنی بحری فوج کے ذریعے یہاں فوجی کمک بھیج سکتے تھے۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کا مرکز مدینہ، اس مقام سے تقریباً ۷۰۰ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس لیے یہ مہم نہایت مشکل اور طویل سفر پر مشتمل تھی۔

اس سے قبل، مسلمانوں کی تمام جنگیں عربوں کے ساتھ ہوئیں، جن میں ان کے اپنے قبیلہ قریش اور ان کے اتحادی شامل تھے۔ جنگِ موتہ وہ پہلا موقع تھا جب مسلمانوں کا سامنا ایک غیر عرب طاقت یعنی رومیوں سے ہوا۔ یہ جنگ بغیر کسی واضح فیصلے کے ختم ہوئی، لیکن اس نے رومیوں کو مسلمانوں کی عسکری صلاحیت سے آگاہ کر دیا۔ اب تبوک دوسری بڑی جنگ تھی، جہاں مسلمانوں کو ایک غیر عرب سپر پاور کے خلاف کھڑا ہونا تھا۔

فتح مکہ کے بعد، رومیوں کو پہلی مرتبہ اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ عرب ایک نئی طاقت بن چکے ہیں۔اس سے پہلے، تاریخ میں ہمیں کہیں یہ نہیں ملتا کہ کسی نے عرب کو اتنی اہمیت دی ہو کہ ان پر حملہ کرے۔البتہ، حبشہ کے بادشاہ کا کعبہ کو گرانے کے لیے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ آنا عرب پر حملہ نہیں تھا، بلکہ کعبہ کی مذہبی حیثیت کو کم کرنے کی ایک سازش تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے ناکام بنادیا۔

رومیوں کی عرب میں مداخلت: غسانی خاندان کا کردار

رومی براہ راست جزیرۃ العرب پر حکمرانی نہیں کرتے تھے، لیکن عرب کا ایک قبیلہ، غسانی خاندان، روم کے زیرِ اثر ضرور تھا۔ غسانی حکمران، عرب کے شمالی علاقوں پر قابض تھے، لیکن وہ رومیوں کے حلیف سمجھے جاتے تھے۔غسانی حکمران اور رومی، دونوں عیسائی تھے، اس لیے ان کے تعلقات کافی گہرے تھے۔یہی وجہ تھی کہ جب مدینہ ایک طاقتور اسلامی ریاست بن کر ابھرا، تو غسانی حکمران خوفزدہ ہو گئے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا تیزی سے پھیلنا، ہر بڑی طاقت کے لیے خطرے کی گھنٹی تھا۔ حجاز میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کو نہ صرف عرب قبائل، بلکہ ہمسایہ ممالک بھی تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔رومیوں کو یہ خطرہ لاحق ہو چکا تھا کہ مسلمان کہیں شام پر حملہ نہ کر دیں۔اسی خطرے کے پیش نظر، رومی قیصر نے مدینہ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ اس حملے کا منصوبہ رومیوں نے بنایا، جبکہ غسانی حکمران محض آلہ کار تھے۔بعض کا ماننا ہے کہ دونوں کو یکساں خطرہ لاحق تھا، اور دونوں ہی مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روکنا چاہتے تھے۔

تاریخ یہ بات سامنے لاتی ہے کہ تبوک کی مہم صرف ایک جنگی حکمتِ عملی نہیں تھی، بلکہ یہ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے خلاف ایک بین الاقوامی رد عمل کا نتیجہ تھی۔رومیوں اور ان کے حلیف غسانی حکمرانوں نے مدینہ پر حملے کی سازش کی،

لیکن نبی کریم ﷺ نے اس سے پہلے ہی قدم اٹھالیا۔ یہ مہم ثابت کرتی ہے کہ اسلامی ریاست اب ایک طاقتور حقیقت بن چکی تھی، جسے نظرانداز کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

واقعہ ایلاء اور غسانی حملے کا ڈر

یہ تفصیل اس دور کے سیاسی اور عسکری پس منظر کو واضح کرتی ہے۔ نو ہجری میں جب نبی کریم ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات سے علیحدہ ہو کر بالا خانے میں قیام فرماتھے، اسی دوران مدینہ میں یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ غسانی قبائل اور رومی سلطنت مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ خبریں شام سے آنے والے سوداگروں کے ذریعے مدینہ پہنچی تھیں، جو اس وقت کے تجارتی راستوں اور حکومتی حرکات و سکنات سے بخوبی واقف تھے۔ ان اطلاعات کے مطابق رومی سلطنت نے شام میں ایک بڑی فوج مجتمع کر لی تھی، اور کئی عرب عیسائی قبائل بھی ان کے ساتھ مل چکے تھے۔ اس قسم کی خبریں ایک غیر معمولی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھیں، جسے نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

یہی وہ محرکات تھے جن کے باعث نبی اکرم ﷺ نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور جنگِ تبوک کی مہم کا آغاز کیا، تاکہ دشمن کو مدینہ پر حملے سے پہلے ہی روک دیا جائے۔

سید مودودیؒ نے سورۃ توبہ کے دیباچے میں جنگِ تبوک بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ میں سید مودودی کی تحریر یہاں نقل کر رہا ہوں۔ اس تحریر میں انھوں نے جہاں غزوہ تبوک کے محرکات پر بات کی ہے وہیں پر آپ نے اس جنگ کے احوال بھی بیان کیے ہیں۔ ان کے مطابق؛

> عرب میں حدیبیہ کے بعد دعوت و تبلیغ اور استحکام قوت کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان کی بدولت دو سال کے اندر رومی سلطنت کے ساتھ

کشمکش کی ابتدا فتح مکہ سے پہلے ہو چکی تھی۔ نبی ﷺ نے حدیبیہ کے بعد اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے جو وفود عرب کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان میں سے ایک شمال کی طرف سرحد شام سے متصل قبائل میں بھی گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیر اثر تھے۔ ان لوگوں نے ذات الطّلح (یا ذات اطلاح) کے مقام پر اس وفد کے پندرہ آدمیوں کو قتل کر دیا اور صرف رئیس وفد کعب بن عمیر غفاری بچ کر واپس آئے۔ اسی زمانے میں حضور نے بصریٰ کے رئیس شرحبیل بن عمرو کے نام بھی دعوت اسلام کا پیغام بھیجا تھا، مگر اس نے آپ کے ایلچی حارث بن عمیر کو قتل کر دیا۔ یہ رئیس بھی عیسائی تھا اور براہ راست قیصر روم کے احکام کا تابع تھا۔ ان وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الاولیٰ سن ۸ ہجری میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج سرحد شام کی طرف بھیجی تاکہ آئندہ کے لیے یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے پر امن ہو جائے اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ فوج جب مَعَان کے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلہ پر آ رہا ہے، خود قیصر روم حمص کے مقام پر موجود ہے اور اس نے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی ہے۔ لیکن ان خوفناک اطلاعات کے باوجود تین ہزار سرفروشوں کا یہ مختصر دستہ آگے بڑھتا چلا گیا اور مؤتَہ کے مقام پر شرحبیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا۔ اس تہوّر کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مجاہدین

اسلام بالکل پس جاتے، لیکن سارا عرب اور تمام شرق اوسط یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلے میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو، بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی، جو کسریٰ کے زیر اثر تھے، اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔

بنی سُلیم (جن کے سردار عباس بن مرداس سلمی تھے) اور اشجع اور غَطفان اور ذبیان اور فزارہ کے لوگ اسی زمانے میں داخل اسلام ہوئے۔ اور اسی زمانے میں سلطنت روم کی عربی فوجوں کا ایک کمانڈر فروہ بن عمرو الجذامی مسلمان ہوا جس نے اپنے ایمان کا ایسا زبردست ثبوت دیا کہ گرد و پیش کے سارے علاقے اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ قیصر کو جب فروہ کے قبول اسلام کی اطلاع ملی تو اس نے انھیں گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلوایا اور ان سے کہا کہ دو چیزوں میں سے ایک کو منتخب کر لو۔ یا ترک اسلام جس کے نتیجے میں تم کو نہ صرف رہا کیا جائے گا بلکہ تمھیں اپنے عہدے پر بھی بحال کر دیا جائے گا، یا اسلام، جس کے نتیجے میں تمھیں سزائے موت دی جائے گی۔ انھوں نے ٹھنڈے دل سے اسلام کو چن لیا اور راہ حق میں جان دے دی۔ یہی واقعات تھے جنھوں نے قیصر کو اس ''خطرے'' کی حقیقی اہمیت محسوس کرائی جو عرب سے اٹھ کر اس کی سلطنت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دوسرے ہی سال قیصر نے مسلمانوں کو غزوہ مؤتہ کی سزا دینے کے لیے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بے خبر نہ تھے۔ آپ ہر وقت ہر اس چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی خبر دار رہتے تھے جس کا اسلامی تحریک پر کچھ بھی موافق یا مخالف اثر پڑتا ہو۔ آپ نے ان تیاریوں کے معنی فوراً سمجھ لیے اور بغیر کسی تامل کے قیصر کی عظیم الشان طاقت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر ذرہ برابر بھی کمزوری دکھائی جاتی تو سارا بنا بنایا کام بگڑ جاتا۔ ایک طرف عرب کی دم توڑتی ہوئی جاہلیت، جس پر حُنَین میں آخری ضرب لگائی جا چکی تھی، پھر جی اٹھتی۔ دوسری طرف مدینہ کے منافقین، جو ابو عامر راہب کے واسطے سے غسان کے عیسائی بادشاہ اور خود قیصر کے ساتھ اندرونی ساز باز رکھتے تھے، اور جنھوں نے اپنی ریشہ دوانیوں پر دین داری کا پردہ ڈالنے کے لیے مدینہ سے متصل ہی مسجد ضرار تعمیر کر رکھی تھی، بغل میں چھرا گھونپ دیتے۔ سامنے سے قیصر، جس کا دبدبہ ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد تمام دور و نزدیک کے علاقوں پر چھا گیا تھا، حملہ آور ہوتا۔ اور ان تین زبردست خطروں کی متحدہ یورش میں اسلام کی جیتی ہوئی بازی یکایک مات کھا جاتی۔

اس لیے باوجود اس کے کہ ملک میں قحط سالی تھی، گرمی کا موسم پورے شباب پر تھا، فصلیں پکنے کے قریب تھیں، سواریوں اور سروسامان کا انتظام سخت مشکل تھا، سرمایے کی بہت کمی تھی اور دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک کا مقابلہ درپیش تھا، خدا کے نبی نے یہ دیکھ کر کہ یہ دعوت حق کے لیے زندگی و موت کے فیصلے کی گھڑی ہے، اسی حال میں تیاری جنگ کا اعلان عام کر دیا۔ پہلے تمام غزوات میں تو حضور کا قاعدہ تھا کہ آخر وقت تک کسی کو نہ بتاتے تھے کہ کدھر جانا ہے اور کس سے مقابلہ درپیش ہے، بلکہ مدینے سے نکلنے کے بعد بھی منزل مقصود کی

طرف سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے پھیر کی راہ سے تشریف لے جاتے تھے۔ لیکن اس موقع پر آپ نے یہ پردہ بھی نہ رکھا اور صاف صاف بتادیا کہ روم سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے۔

رجب سن ۹ ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے جن میں دس ہزار سوار تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ اس پر گرمی کی شدت اور پانی کی قلت مستزاد۔ مگر جس عزم صادق کا ثبوت اس نازک موقع پر مسلمانوں نے دیا اس کا ثمرہ تبوک پہنچ کر انھیں نقد مل گیا۔ وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ قیصر اور اس کے تابعین نے مقابلے پر آنے کے بجائے اپنی فوجیں سرحد سے ہٹالی ہیں اور اب کوئی دشمن موجود نہیں ہے کہ اس سے جنگ کی جائے۔ سیرت نگار بالعموم اس واقعے کو اس انداز سے لکھ جاتے ہیں کہ گویا وہ خبر ہی سرے سے غلط نکلی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رومی افواج کے اجتماع کے متعلق ملی تھی۔ حالانکہ دراصل واقعہ یہ تھا کہ قیصر نے اجتماع افواج شروع کیا تھا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی مقابلے پر پہنچ گئے تو اس نے سرحد سے فوجیں ہٹالینے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا۔ غزوہ موتہ میں تین ہزار اور ایک لاکھ کے مقابلے کی جو شان وہ دیکھ چکا تھا اس کے بعد اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جہاں ۳۰ ہزار فوج آرہی ہو وہاں وہ لاکھ دو لاکھ آدمی لے کر میدان میں آجاتا۔

قیصر کے یوں طرح دے جانے سے جو اخلاقی فتح حاصل ہوئی اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے پر کافی سمجھا اور بجائے اس کے تبوک سے آگے بڑھ کر سرحد شام میں داخل ہوتے، آپ نے اس بات کو ترجیح دی کہ اس فتح سے انتہائی ممکن سیاسی و حربی فوائد حاصل کرلیں۔ چناچہ آپ نے تبوک میں ۲۰ دن ٹھیر کر ان بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنت روم اور دارالاسلام کے درمیان واقع

تھیں اور اب تک رومیوں کے زیر اثر رہی تھیں، فوجی دباؤ سے سلطنت اسلامی کا باجگذار اور تابع امر بنالیا۔ اس سلسلے میں دومۃ الجندل کے عیسائی رئیس اُکیدر بن عبدالمالک کندی، ایلہ کے عیسائی رئیس یوحنّا بن رُؤبہ، اور اسی طرح مقنا، جَرباء اور اذرح کے نصرانی رؤسا نے بھی جزیہ ادا کر کے مدینہ کی تابعیت قبول کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حدود اقتدار براہ راست رومی سلطنت کی سرحد تک پہنچ گئے اور جن عرب قبائل کو رومی اب تک عرب کے خلاف استعمال کرتے رہے تھے، اب ان کا بیشتر حصہ رومیوں کے مقابلے پر مسلمانوں کا معاون بن گیا۔ پھر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سلطنت روم کے ساتھ ایک طویل کشمکش میں الجھ جانے سے پہلے اسلام کو عرب پر اپنی گرفت مضبوط کر لینے کا پورا موقع مل گیا۔ تبوک کی اس فتح بلا جنگ نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیت قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے، خواہ وہ علانیہ مشرک ہوں یا اسلام کے پردہ میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر و بیشتر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں اور اگر خود نعمت ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم از کم ان کی آئندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔ اس کے بعد جو ایک برائے نام اقلیت شرک و جاہلیت میں ثابت قدم رہ گئی، وہ اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اس اصلاحی انقلاب کی تکمیل میں کچھ بھی مانع نہ ہو سکتی تھی جس کے لیے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا تھا۔

غزوہ تبوک کے بارے میں سیرت النبی ﷺ ابن ہشام میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ میں یہاں اس واقعے کی تفصیل میں جانے کے بجائے، اس موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس میں ہم سب کے لیے بے حد رہنمائی موجود ہے۔

جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ رومی سلطنت جزیرہ نما عرب کی سرحد پر آباد عیسائی قبائل کی مدد سے جنگ کی تیاری کر رہی ہے، تو ان حالات میں آپ ﷺ کے پاس تین ممکنہ حکمتِ عملی کے راستے تھے:

مدینہ میں رہ کر دشمن کا انتظار کرنا— جیسا کہ غزوہ اُحد اور غزوہ خندق کے موقع پر کیا گیا تھا۔ اس حکمتِ عملی میں رومی فوج کو مدینہ تک طویل سفر طے کرنا پڑتا، لیکن اگر وہ کامیاب ہو جاتے، تو مدینہ پر قبضہ کر کے اسلامی ریاست کو شدید نقصان پہنچا سکتے تھے۔

قیصرِ روم سے مذاکرات کرنا— تاکہ اسے اس حملے سے باز رکھا جائے، جیسا کہ تاریخ میں کئی مرتبہ قوموں کے درمیان سفارتی کوششیں کی گئیں۔

دشمن کے علاقے میں جا کر پیش قدمی کرنا— اور تبوک کے مقام پر رومیوں کا سامنا کرنا۔

آپ ﷺ نے تیسری حکمت عملی اختیار کی اور تبوک کی جانب پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ بے حد مشکل تھا، کیونکہ:

1- فاصلہ بہت زیادہ تھا۔
2- شدید گرمی کا موسم تھا۔
3- ساز و سامان کی قلت تھی۔
4- فصل کی کٹائی کا وقت تھا، جب لوگ سال بھر کے لیے اناج اور کھجوریں جمع کرتے تھے۔

اس کے باوجود، آپ ﷺ نے اس فیصلے پر عمل کیا، کیونکہ یہ ایک دفاعی اور حکمتِ عملی کے لحاظ سے بہترین اقدام تھا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ مسلمانوں کا سامنا اس وقت کی سپر پاور سے تھا، جس کے خلاف عرب کبھی کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ رومی ایک بڑی اور منظم فوج کے ساتھ

میدان میں اترنے کے لیے تیار تھے۔ اس موقع پر مدینہ میں کچھ لوگ، جو دل سے ایمان نہیں لائے تھے (منافقین)، خوف و ہراس پھیلانے لگے۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ رومیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ ایک عظیم سلطنت کے مالک ہیں۔ لیکن دوسری طرف، سچے اہلِ ایمان نے فوری تیاری شروع کر دی اور سخت گرمی میں تیار فصلیں چھوڑ کر نبی کریم ﷺ کی قیادت میں تبوک کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہ سفر صرف عسکری نہیں تھا، بلکہ اس سے مسلمانوں کے ایمان اور عزم کا امتحان بھی ہوا۔ جنگ کے اخراجات کے لیے ایک بڑی رقم درکار تھی، اور صحابہ کرامؓ نے دل کھول کر مال خرچ کیا۔ اس موقع پر حضرت عثمان بن عفانؓ نے دس ہزار سپاہیوں کے لیے گھوڑے اور ہتھیار فراہم کیے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے گھر کا سارا سامان لا کر راہِ خدا میں دے دیا۔ سات صحابہ کرامؓ ایسے بھی تھے، جو سواری کی عدم دستیابی کے باعث جنگ میں شرکت نہ کر سکے اور روتے ہوئے واپس چلے گئے۔ دوسری طرف، رومیوں کو یقین تھا کہ مسلمان اس شدید گرمی اور صحرائی سفر کو برداشت نہیں کر سکیں گے اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو جائیں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رومی فوج نے مدینہ پر حملہ کرنے سے اجتناب کیا۔ اس سفر میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب پانی ختم ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے بارش کی دعا فرمائی، اور اللہ کے حکم سے موسلا دھار بارش نے پانی کی قلت کو پورا کر دیا۔ یہ ایک ایسا معجزہ تھا جس کا رومی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

آخر کار، نبی کریم ﷺ کی قیادت میں تیس ہزار کا لشکر تبوک پہنچا، جہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ رومی فوج پیچھے ہٹ چکی ہے۔ در حقیقت، یہ ان کی پسپائی اور میدان جنگ سے فرار تھا۔ آپ ﷺ نے کچھ وقت انتظار کیا، اور جب یہ یقین ہو گیا

کہ رومی لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے، تو آپ ﷺ نے لشکر کو مدینہ واپس جانے کا حکم دیا۔

یہاں دو ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق مزید جاننے کی ضرورت ہے۔ایک یہ نبی پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر رومی فوج کا تعاقب کیوں نہ کیا اور دوسری ایسی کیا بات ہوئی کہ رومی میدان جنگ سے بھاگ گئے؟

نبی پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں بیس دن ٹھہرنے کے بعد واپس مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔اس موقع پر خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا ایک بہترین مظہر بھی سامنے آتا ہے۔ تبوک میں جو جزیرۃ العرب کا ایک حصہ تھا، جنگ کی صورت میں آپ ﷺ کی کامیابی کے زیادہ امکان تھے۔ لیکن اگر آپ ﷺ رومیوں کے علاقے میں جا کر جنگ کرتے تو ممکن تھا کہ حالات مختلف ہوتے۔اس لیے آپ ﷺ کے اس مبارک فیصلے کی وجہ سے آپ ﷺ کو بے حد سیاسی اور معاشی فائدے ہوئے۔

غزوہ تبوک کے موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے چند اہم پہلو کچھ اس طرح سے ہیں جن میں ہمارے لیے آج بھی رہنمائی موجود ہے۔

یہ رومیوں کی تاریخ کا ایک بہت ہی شرمناک واقعہ تھا۔ اس مہم میں مسلمانوں نے بغیر کسی لڑائی کے فتح حاصل کی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومی جزیرہ نمائے عرب میں اپنی عزت کھو بیٹھے۔ان کا رعب بھی ختم ہو گیا۔اس سے پہلے کوئی یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ صرف اسی صورت ممکن ہوا کہ آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک حجاز اور نجد میں کوئی بھی طاقت آپ ﷺ کے ہم پلہ نہ تھی۔ جنوب میں نجران کے عیسائیوں کے ساتھ آپ ﷺ معاہدے کر چکے تھے۔اس لیے آپ ﷺ کی مدینہ منورہ سے دور جانے کی صورت میں مدینہ منورہ کو کوئی بھی خطرہ نہیں تھا۔

دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں قائم اسلامی ریاست ایک واضح اور مضبوط طاقت بن گئی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ وہ قبائل جو اسلام لانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے کھل کر اسلام کے حامی بن گئے اور مدینہ کی ریاست کے ایک وفادار سپاہی کے طور پر جانے جانے لگے۔

آپ ﷺ نے غزوہ تبوک کے موقع پر مقامی قبائل سے معاہدے بھی کیے۔ ایک طرح سے آپ ﷺ نے انھیں پیغام دیا کہ اب وہ رومی سلطنت کی سرپرستی میں نہیں ہیں بلکہ مسلمان ان کے حلیف ہیں۔ آپ ﷺ نے ایلہ والہ جو ایک مقامی عیسائی حکمران تھا، کے ساتھ معاہدہ کیا، اس معاہدے کی تفصیل سیرت النبی ﷺ ابنِ ہشام صفحہ نمبر ۳۶۳ پر موجود ہیں۔ اس معاہدے میں آپ ﷺ نے اس قبیلے کو ہر طرح کے امن کی ضمانت دی ہے۔ اس سے آپ ﷺ نے صدیوں سے ان عرب قبائل کو اپنے ساتھ ملایا جو روم کی طاقت کے خوف سے ان کی ماتحتی پر مجبور تھے۔ اس طرح سے آپ ﷺ نے رومیوں کا ایک بازو کاٹ دیا۔

غزوہ تبوک کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مختلف قبیلوں کے درمیان کئی معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ بعض قبائل سے جزیہ (ٹیکس) کی ادائیگی کے لیے معاہدے بھی ہوئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ غزوہ تبوک کا ہی اثر تھا کہ رسول اللہؐ نے حضرت اسامہؓ کی قیادت میں لشکر کو شام کی طرف جانے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ کی رحلت کی وجہ سے یہ لشکر کچھ دیر کے لیے رکا رہا بعد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ لشکر شام کی طرف روانہ ہوا۔ اس لشکر کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی اور رومی حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس کامیابی کی بنیاد بھی غزوہ تبوک ہی تھا۔

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کی نبی پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آگے بڑھ کر رومی افواج پر حملہ کرنے کی جو خارجہ پالیسی بنائی تھی یہ سب اسی کا

نتیجہ تھا۔اس موقع پر اس بات کا اظہار بے حد ضروری ہے کہ جنگِ تبوک کے موقع پر نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے بڑھ کر جنگ کرنے کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کے لیے آئندہ کے لیے کامیابی کی راہیں کھول دیں۔

غزوہ تبوک کے بعد باز نطینی خطرہ ختم ہو گیا۔ اس غزوہ میں آپ ﷺ کا آگے بڑھ کر حملہ کرنے سے جزیرۃالعرب کے ارد گرد پڑوسی ریاستوں کی ممکنہ جارحیت کو روکنے میں بھی مدد ملی۔ اس کے بعد ہی جزیرۃالعرب کا شمال بھی آپ ﷺ کے زیرِ اثر آگیا۔اس جنگ کے بعد آپ ﷺ کی حکمرانی بے حد مضبوط ہوئی۔ کئی قبائل کو آپ ﷺ نے اپنے ساتھ ملایا۔ اس طرح اسلام کی توسیع پسندانہ سوچ کو بھی تقویت ملی۔

***

خطبہ الوداع: تکمیل دین کا اعلان

نبی اکرم حضرت محمد مصطفی ﷺ نے سن ۱۰ ہجری میں حج ادا فرمایا، جو تاریخِ اسلام میں حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر متعدد خطبات ارشاد فرمائے، جن میں اسلامی تعلیمات اور بنیادی اصولوں کو جامع انداز میں بیان کیا گیا۔ مختلف سیرت نگاروں نے ان خطبات کو جمع کر کے ایک مکمل خطبے کی صورت دی ہے۔

مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان خطبات میں بیان کردہ تعلیمات کو منظم انداز میں مرتب کرتے ہوئے سولہ بنیادی احکامات کی نشاندہی کی ہے، جو اسلامی معاشرت، سماجی عدل، انسانی حقوق، مساوات، اور دیگر اہم موضوعات پر مشتمل ہیں[64]۔

سیرت النبی ﷺ از ابن ہشام میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حج کے دوران مختلف مقامات پر اجتماع سے خطاب فرمایا اور اسلامی اصولوں کو واضح انداز میں پیش کیا۔ انھی خطبات کو مجموعی طور پر خطبہ حجۃ الوداع کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ خطبہ نہ صرف اسلامی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، بلکہ اسے عالمی سطح پر انسانی حقوق، عدل و انصاف، اور سماجی مساوات کا ایک اہم منشور بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اسے تاریخ میں انسانیت کا سب سے پہلا منشور انسانی حقوق ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ ابنِ ہشام کے مطابق آپ ﷺ نے ذیقعد دس ہجری میں حج کا ارادہ فرمایا۔ ہجرت

[64] انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا مکمل عربی متن ابنِ ہشام، البیان و البتیین، تاریخ یعقوبی، طبری، حجتہ الوداع (محب الطبری)، میں موجود ہیں۔ البتہ مختلف احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

کے بعد آپ کا یہ آخری حج تھا، اسی لیے اسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس حج کے موقع پر آپؐ کے ساتھ کم و بیش ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرامؓ تھے۔ اس موقع پر آپؐ کا خطبہ اسلامی تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔ اس خطبے میں آپؐ نے اسلام کے سماجی، سیاسی اور تمدنی اصولوں کے اہم نکات اور ان کی مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس سفر کی تفصیل اس مقالے کے موضوع سے ہٹ کر ہے، یہاں میں آپ ﷺ کے ارشادات جو در حقیقت ان کی خارجی اور داخلی پالیسی کا ایک شاندار مظہر ہے کا ہی ذکر کرنا چاہوں گا۔ سورۃ المائدہ کی تیسری آیت:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۚ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۔ (المائدہ ۵:۳)

تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھُٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔۔۔ سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔۔۔ اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت

معلوم کرو۔ یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پُوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے (لہٰذا حرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کر دی گئی ہیں اُن کی پابندی کرو)۔ البتہ جو شخص بُھوک سے مجبُور ہو کر اُن میں سے کوئی چیز کھالے، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر سید مودودیؒ نے کچھ اس طرح بیان کی ہے؛

مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر سن ۱۰ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن جس سلسلہ کلام میں یہ واقع ہوئی ہے وہ صلح حدیبیہ سے متصل زمانہ (سن ٦ ہجری) کا ہے اور سیاق عبارت میں دونوں فقرے کچھ ایسے پیوستہ نظر آتے ہیں کہ یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ ابتداء میں یہ سلسلہ کلام ان فقروں کے بغیر نازل ہوا تھا اور بعد میں جب یہ نازل ہوئے تو انھیں یہاں لا کر نصب کر دیا گیا۔ میرا قیاس یہ ہے، وَ الْعِلْمُ عِنْدَ اللہ، کہ ابتداءً یہ آیت اسی سیاق کلام میں نازل ہوئی تھی اس لیے اس کی حقیقی اہمیت لوگ نہ سمجھ سکے۔ بعد میں جب تمام عرب مسخر ہو گیا اور اسلام کی طاقت اپنے شباب پر پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہ فقرے اپنے نبی پر نازل فرمائے اور ان کے اعلان کا حکم دیا۔

اسی آیت کی تفسیر معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے کچھ اس طرح سے کی ہے؛

"یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے یوم عرفہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ جبکہ مکہ اور تقریباً سارا عرب فتح ہو چکا تھا۔ پورے جزیرۃ العرب پر اسلامی قانون جاری تھا۔ اس پر فرمایا کہ آپ سے پہلے جو کفار یہ منصوبے بنایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی جماعت ہمارے مقابلے میں کم بھی ہے اور کمزور بھی ان کو ختم کر دیا جائے۔ اب نہ ان میں یہ حوصلے باقی رہے، نہ ان کی وہ طاقت رہی۔ اس لیے مسلمان ان سے مطمئن ہو کر اپنے رب کی اطاعت و عبادت میں لگ جائیں۔"

اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے، عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سید الایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا۔ جس کے فضائل معروف ہیں۔ مقام میدان عرفات، جبل رحمت کے قریب ہے، جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے، جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور خصوصاً یوم جمعہ میں قبولیت دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے اور عرفہ کے روز اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔

حج کے لیے مسلمانوں کا سب سے بڑا پہلا عظیم اجتماع ہے۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ شریک ہیں۔ رحمۃ للعالمین صحابہ کرامؓ کے ساتھ جبل رحمت کے نیچے اپنی ناقہ عضباء پر سوار ہیں۔ اور حج کے اب بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں۔

ان فضائل و برکات اور رحمتوں کے سائے میں یہ آیت کریمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ جب آپ پر یہ آیت بذریعہ

وحی نازل ہوئی تو حسب دستور وحی کا ثقل اور بوجھ اتنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جا رہی تھی یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت ہے۔اس کے بعد کوئی آیت احکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی۔ صرف ترغیب و ترہیب کی چند آیتیں ہیں جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول کریم ﷺ اس دنیا میں صرف اکیاسی روز بقید حیات رہے، کیونکہ ۱۰ ہجری کی نویں ذی الحجہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ۱۱ ہجری کی بارہویں ربیع الاول کو آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی۔

یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم بھی ملت اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری اور بھاری انعام اور اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دین حق اور نعمت الہٰی کا انتہائی معیار جو اس عالم میں بنی نوع انسان کو عطا ہونے والا تھا، آج وہ مکمل کر دیا گیا۔ گویا حضرت آدمؑ کے زمانے سے جو دین اور نعمت الٰہیہ کا نزول اور ترویج شروع کی گئی تھی اور ہر زمانے اور ہر خطے کے مناسب حال اس نعمت کا ایک حصہ اولاد آدم کو عطا ہوتا رہا آج وہ دین اور نعمت مکمل صورت میں خاتم الانبیار سول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو عطا کر دی گئی۔

حجتہ الوداع کے موقع کی مناسبت سے کئی احادیث موجود ہیں۔ان میں سے ایک احادیث کے الفاظ یہاں درج کیے جا رہے ہیں:

(مرفوع) حدثنی محمد بن المثنی، حدثنا عبد الوهاب، حدثنا ایوب، عن محمد، عن ابن ابی بکرة، عن ابی بکرة، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال:" الزمان قد استدار کهیئة یوم خلق السموات والارض، السنة: اثنا عشر شهرا، منها اربعة حرم، ثلاثة متوالیات: ذو القعدة، وذو الحجة، والمحرم، ورجب مضر الذی بین جمادی، وشعبان، ای شهر هذا؟" قلنا: الله

ورسوله اعلم، فسكت حتى ظننا انه سيسميه بغير اسمه، قال:" اليس ذو الحجة؟" قلنا: بلى، قال:" فاى بلد هذا؟" قلنا: الله ورسوله اعلم، فسكت حتى ظننا انه سيسميه بغير اسمه، قال:" اليس البلدة؟" قلنا: بلى، قال:" فاى يوم هذا؟" قلنا: الله ورسوله اعلم، فسكت حتى ظننا انه سيسميه بغير اسمه، قال:" اليس يوم النحر؟" قلنا: بلى، قال:" فإن دماءكم واموالكم"، قال محمد واحسبه، قال:" واعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا، فى بلدكم هذا، فى شهركم هذا، وستلقون ربكم فيسالكم عن اعمالكم، الا فلا ترجعوا بعدى ضلالا يضرب بعضكم رقاب بعض، الا ليبلغ الشاهد الغائب فلعل بعض من يبلغه ان يكون اوعى له من بعض من سمعه"، فكان محمد إذا ذكره، يقول: صدق محمد صلى الله عليه وسلم ثم قال:" الا هل بلغت مرتين؟". (صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۴۰۶)

مجھ سے محمد بن مثنیٰ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبدالوہاب ثقفی نے بیان کیا، کہا ہم سے ایوب سختیانی نے بیان کیا، ان سے محمد بن سیرین نے، ان سے عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہما نے اور ان سے ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمانہ اپنی اصل حالت پر گھوم کر آ گیا ہے۔ اس دن کی طرح جب اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ دیکھو! سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں۔ چار ان میں سے حرمت والے مہینے ہیں۔ تین لگاتار ہیں، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم (اور چوتھا) رجب مضر جو جمادی الاولیٰ اور شعبان کے بیچ میں پڑتا ہے۔ (پھر آپ نے دریافت فرمایا) یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو بہتر علم

ہے۔اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ہم نے سمجھا شاید آپ مشہور نام کے سوا اس کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ لیکن آپ نے فرمایا: کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے؟ ہم بولے کہ کیوں نہیں۔ پھر دریافت فرمایا اور یہ شہر کون سا ہے؟ ہم بولے کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ بہتر علم ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ ہم نے سمجھا شاید اس کا کوئی اور نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکھیں گے، جو مشہور نام کے علاوہ ہو گا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ مکہ نہیں ہے؟ ہم بولے کیوں نہیں (یہ مکہ ہی ہے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا اور یہ دن کون سا ہے؟ ہم بولے کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ بہتر علم ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے اور ہم نے سمجھا شاید اس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مشہور نام کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ یوم النحر (قربانی کا دن) نہیں ہے؟ ہم بولے کہ کیوں نہیں۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس تمہارا خون اور تمہارا مال۔ محمد نے بیان کیا کہ میرا خیال ہے کہ ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا، اور تمہاری عزت تم پر اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن تمہارے اس شہر اور تمہارے اس مہینے میں اور تم بہت جلد اپنے رب سے ملو گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کرے گا۔ ہاں، پس میرے بعد تم گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ ہاں اور جو یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو

موجود نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ جسے وہ پہنچائیں ان میں سے کوئی ایسا بھی ہو جو یہاں بعض سننے والوں سے زیادہ اس (حدیث) کو یاد رکھ سکتا ہو۔ محمد بن سیرین جب اس حدیث کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو کیا میں نے پہنچادیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ یہ جملہ فرمایا۔

جزیرۃ العرب کے حالات اور خطبہ حجۃ الوداع

دس ہجری میں جب آپ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا، اس وقت جزیرۃ العرب کے معروضی حالات کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ پس منظر ہمیں اس موقع پر آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

آپ ﷺ نے اس سے قبل تئیس سال تک دینِ اسلام کی دعوت میں مشغول رہنے کا طویل سفر طے کیا تھا۔ ان میں سے تیرہ سالہ مکی دور آزمائشوں اور صبر سے بھرا ہوا تھا۔ مشرکینِ مکہ کی شدید مخالفت اور جان لیوا مظالم کے سبب آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ جس دعوت کا آغاز آپ ﷺ نے مکہ کے کوہِ صفا سے کیا تھا، اور جس مقصد کے تحت آپ ﷺ کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا، آج تئیس سال بعد اسی مقام پر اس دین کی تکمیل کا اعلان کیا جارہا تھا۔ ان تئیس سالوں کے دوران قرآن مجید نازل ہوتا رہا، اور اب اس کی تکمیل کا اعلان بھی اسی قرآن میں آیا:

> آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔ (المائدہ ۵:۳)

جب آپ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع دیا، تو اس وقت جزیرۃ العرب کے حالات کچھ یوں تھے۔

1- اسلام پورے جزیرۃ العرب میں پھیل چکا تھا اور مختلف قبائل ایک جھنڈے تلے جمع ہو چکے تھے۔
2- رومی سلطنت کمزور ہو چکی تھی اور شمال میں ان کا کوئی فوری خطرہ موجود نہیں تھا۔
3- یہودیوں کی عسکری طاقت ختم ہو چکی تھی اور وہ مدینہ میں اب کوئی اثر و رسوخ نہیں رکھتے تھے۔
4- جنوبی عرب کے عیسائی حکمرانوں نے آپ ﷺ سے معاہدہ کر لیا تھا۔
5- مکہ، جو جزیرۃ العرب کا مذہبی و تجارتی مرکز تھا، اب اسلام کے زیرِ انتظام تھا اور مشرکین بت پرستی چھوڑ چکے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب آپ ﷺ نے انسانی حقوق کے تحفظ کا عالمی اور ابدی منشور پیش کیا، جسے خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع کے اہم نکات

ابن ہشام اور دیگر سیرت نگاروں کے مطابق، آپ ﷺ نے مختلف مقامات پر خطبات دیے، جنھیں اکٹھا کر کے خطبہ حجۃ الوداع کی شکل دی گئی۔ ان کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

شاید آئندہ سال میری یہاں تم سے ملاقات نہ ہو۔

❖ تمہارے خون اور تمہارا مال ایک دوسرے پر حرام ہیں، جیسے یہ دن اور یہ جگہ مقدس ہے۔
❖ تم سب اپنے رب کے حضور پیش ہو گے اور اپنے اعمال کا حساب دو گے۔

- جس کے پاس کسی کی امانت ہو، وہ اسے واپس کرے۔ سود کو ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیا گیا، حتیٰ کہ حضرت عباس بن عبد المطلب کا سود بھی معاف کر دیا گیا۔
- زمانۂ جاہلیت کے تمام انتقامی قتل (خون بہا) معاف ہیں، سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے قتل (ابنِ ربیعہ بن حارث) کو معاف کرتا ہوں۔
- شیطان اب جزیرۃ العرب میں اپنی پرستش سے مایوس ہو چکا ہے، مگر وہ تمھیں گمراہ کرنے کے لیے چھوٹے معاملات میں دخل دیتا رہے گا، اس سے خبردار رہو۔
- حرام مہینوں (ذیقعد، ذوالحجہ، محرم اور رجب) کو ان کے مقررہ وقت پر رکھو، ان میں چھیڑ چھاڑ جائز نہیں۔
- عورتوں پر تمہارا حق ہے اور ان کا تم پر۔ ان کی خوراک، لباس اور بنیادی ضروریات کا خیال رکھنا تم پر فرض ہے۔
- عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، کیونکہ وہ تمہاری مددگار ہیں۔
- میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر انھیں مضبوطی سے پکڑو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے: قرآن اور میری سنت۔
- مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، کسی کی چیز اس کی اجازت کے بغیر لینا جائز نہیں۔
- تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر فوقیت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔
- آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا؟ تمام صحابہؓ نے کہا: ہاں، یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے تین بار فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہنا۔
- ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔

❖ آپ ﷺ نے وراثت، زنا کی سزا، حج کے آداب اور غلاموں کے حقوق کے بارے میں بھی ہدایات دیں۔

خطبہ حجۃ الوداع در حقیقت اسلام کے سماجی، معاشرتی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی اصولوں کا جامع منشور ہے۔اس میں نہ صرف انسانی حقوق کا تحفظ بیان کیا گیا، بلکہ بین الاقوامی تعلقات، حکمرانی اور عدل و انصاف کے اصول بھی واضح کیے گئے۔یہ خطبہ اسلام کی خارجہ اور داخلہ پالیسی کا ایک بہترین نمونہ ہے، جہاں طاقتور ترین حکمران بھی عدل،امانت، دیانت اور مساوات کے پابند ہیں۔یہی اصول آگے چل کر اسلامی ریاستوں کی بنیاد بنے اور رہتی دنیا تک کے لیے انسانی حقوق اور عالمی امن کا ایک بہترین منشور قرار پائے۔یہ خطبہ ایک طرف اسلامی معاشرتی نظام کا خلاصہ تھا، تو دوسری طرف بین الاقوامی تعلقات، سفارت کاری، اور انسانی حقوق کی بنیادی دستاویز بھی تھا۔ یہی اصول آگے چل کر اسلامی خلافتوں اور سلطنتوں کی بنیاد بنے، اور دنیا نے ایک نئے عہد کی بنیاد رکھی، جس میں عدل، مساوات، اور امن کے اصولوں کو فوقیت دی گئی۔

***

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجہ حکمتِ عملی:
مختلف مراحل کا مطالعہ

اب تک ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زندگی کے چند اہم واقعات کا ذکر کیا، اور اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ ان واقعات سے ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف اوقات میں مختلف طرح کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری اختیار کی۔
اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوی زندگی کو مختلف ادوار میں دیکھیں تو اسے پانچ مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور وہ ہے جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا، لیکن ابھی کھل کر دعوت دینے کا حکم نہیں آیا تھا۔ یہ عرصہ تقریباً تین سال پر مشتمل ہے۔ اس دوران چالیس کے قریب افراد، جو زیادہ تر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ خانہ اور قریبی عزیز واقارب تھے، اسلام قبول کر چکے تھے۔

دوسرا دور اس وقت کا ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھل کر دعوت دینے کا حکم دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے اپنے خاندان اور قبیلے کو اسلام کی دعوت دی اور پھر دیگر قبائل تک یہ پیغام پہنچایا۔ یہ مرحلہ تقریباً دس سال پر محیط ہے۔ نبوت کے تیرہویں سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے۔

تیسرا دور ہجرت کے بعد سے صلح حدیبیہ تک کا ہے، جو چھ ہجری میں واقع ہوئی۔ اس دوران مشرکینِ مکہ کے ساتھ تین بڑی جنگیں ہوئیں، علاوہ ازیں کئی دیگر جنگیں بھی لڑی گئیں۔ یہ مرحلہ تقریباً چھ سال پر مشتمل ہے۔

چوتھا دور صلح حدیبیہ (چھ ہجری) سے لے کر فتح مکہ (آٹھ ہجری) تک کا ہے۔ اس دوران جنگ بندی کا معاہدہ ہوا، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ کو دعوتِ دین پھیلانے اور اپنی جماعت کو مزید مضبوط کرنے کا موقع ملا۔ اس معاہدے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ دس سال تک کوئی جنگ نہیں ہو گی۔

پانچواں اور آخری دور فتح مکہ (آٹھ ہجری) سے آپ ﷺ کی وفات (گیارہویں ہجری) تک کا ہے۔ اس دوران اسلام پورے جزیرۃ العرب میں پھیل چکا تھا، اور مختلف اقوام کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے گئے۔

یہ پانچوں ادوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی لیے ان میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری بھی مختلف نظر آتی ہے۔ ان ہی ادوار میں ہمارے لیے، اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے رہنمائی موجود ہے کہ بدلتے حالات کے مطابق خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو کیسے ترتیب دیا جائے۔

یہی وہ ماڈل ہے، جسے میں اس مقالے میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہو گا کہ ایک ہی طرح کی پالیسی ہر زمانے اور ہر ماحول میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ بعض مواقع پر درگزر اور برداشت کا رویہ اپنانا ضروری ہوتا ہے، جبکہ بعض اوقات دشمن کے خلاف دفاعی یا جارحانہ اقدام ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کبھی حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے دفاعی حکمتِ عملی اپنائی جاتی ہے، اور کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے کہ ایک بڑی طاقت کے خلاف مضبوط موقف اختیار کیا جاتا ہے۔

لہٰذا، میں اگلے صفحات میں آپ ﷺ کی ترتیب دی ہوئی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کو ان مختلف ادوار کے تناظر میں پیش کروں گا۔ میں اس کام میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہوں، یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

پہلا دور: نبوت کے پہلے تین سال

نبوت کے اس پہلے دور کے متعلق سورۃ الشعراء کی آیت نمبر ۲۱۴) سے رہنمائی ملتی ہے؛

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ

اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ،

سید مودودی اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار کر صاف صاف کہہ دیا کہ یابنی عبد المطلب، یا عباس، یا صفیه عم رسول الله ، یا فاطمه بنت محمد، انقذو ا انفسکم من النار، فانی لا املك لكم من الله شيئاً، سلونی من مالی ما شئتم ۔اے بنی عبد المطلب، اے عباس، اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ محمد کی بیٹی تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔ پھر آپ نے صبح سویرے صفا کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر پکارا: یاصباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ)، اے قریش کے لوگو، اے بنی کعب بن لوئی، اے بنی مرہ، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبد شمس، اے بنی ہاشم، اے آل عبد المطلب۔ اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب

صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتہ چل جاتا وہ اسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضورؐ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے، اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ام نے فرمایا: لوگو! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ سب نے کہا: ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔ آپ نے فرمایا: اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتے دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمد، میری طرف دیکھیے، مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا۔ (اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت زبیر بن عمرو اور حضرت قبیصہ بن مخارق سے مروی ہیں)۔

اس دور میں آپ ﷺ کی حکمت عملی کے چند اہم پہلو کچھ اس طرح سے ہیں؛

1- اسلام کی دعوت کو انفرادی طور پر دینا شروع کیا اور اپنے قریبی دوستوں اور عزیز و اقارب کو اپنا ہمنوا بنایا۔

2- قبیلے سے باہر نکل کر دعوت نہیں دی۔

3- اپنے ہم خیال لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک مناسب تعداد میں لوگ آپ ﷺ کے صحابی بنے۔

4- کسی بھی قسم کی کشمکش اور دشمنی سے دوری اختیار کی۔

5- یہ کام خفیہ طریقے سے کرتے رہے، یعنی راز داری سے کام لیا۔

6- مختلف خاندانوں کے افراد کو ساتھ لے کر ایک خاندان وجود میں لائے (یعنی اسلامی برادری)

7- اس دور میں آپ ﷺ نے مشرکین مکہ کے سخت رد عمل سے محفوظ رہنے کے لیے عام لوگوں سے رابطے کی بجائے لوگوں کو فرد اًفرداًدعوت حق دی اور باصلاحیت، باکردار، اہل ثروت اور معاشرے میں اہم مقام رکھنے والے افراد سے انفرادی ملاقات کر کے، ان کے سامنے دین الٰہی کو پیش کیا۔ کئی لوگوں نے آپ ﷺ کی بات کو تسلیم بھی کیا، لیکن ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی کہ وہ اپنے دین کو مشرکین مکہ سے پوشیدہ رکھیں اور عبادت کا فریضہ عام کو لوگوں کی نظروں سے دور رہ کر انجام

دیں۔

8- مشرکین مکہ کے عقائد یا ان کے معبودوں بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ جس کی وجہ سے مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کی باتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

آپ ﷺ کی اس دور کی حکمت عملی سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب بھی کسی ایسے علاقے میں دعوت کا کام کرنا پڑے تو ہمیشہ راز داری سے، کسی بھی طرح کی کشمکش سے دامن بچاتے ہوئے، اپنے قریبی، با اثر اور صاحب حیثیت افراد کے ساتھ ساتھ معاشرے کے کمزور لوگوں کو اپنی دعوت دینی چاہیے اور ان کا ایک گروہ تیار کرنا چاہیے، جو کلی طور پر یکسو ہو۔ ان کے ایمان اور اخلاق کی بہتری پر توجہ دینی چاہیے۔ اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں جہاں خاندان بے حد اہم مانا جاتا تھا، دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے اپنے ساتھ ملانا دعوت کے لیے بے حد اہم تھا، جو ہمیں آپ ﷺ کی حکمت عملی میں نظر آتا ہے۔ اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ دعوت کی ترویج کے لیے اپنے خاندان کا ساتھ ہونا بے حد فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

پہلے تین برسوں میں دعوت و تبلیغ کا کام صرف افراد تک محدود رہا، کسی بھی مجلس یا مجمع میں آپ ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان نہیں کیا۔ لیکن مشرکین مکہ کو اس بات کا علم ہو رہا تھا لیکن انھوں نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ آپؐ صرف اور صرف اپنے قریبی لوگوں کو انفرادی طور پر اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ مشرکین مکہ کو آپ ﷺ کی دعوت سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا اور وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول میں خفیہ طریقے سے آنے والی جوہری تبدیلی سے بھی بے خبر تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ رسول خدا ﷺ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی ایک جماعت تیار کی اور اسے پروان چڑھایا۔ اس سے ایک فائدہ یہ

بھی ہوا کہ آپ ﷺ آنے والے دنوں میں دشمنان اسلام کے خلاف ایک مضبوط دفاعی محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے کیونکہ آپ ﷺ کے قبیلے کے اکثر افراد آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے تھے۔ جیسا کہ عرب میں رواج تھا کہ ہر قبیلہ اپنے فرد کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ اس طرح اگر آپ ﷺ کے قبیلے کے جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا انھوں نے بھی رشتہ داری اور قرابت کی بنا پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ و دفاع کے لیے آپ ﷺ کا ساتھ دیا۔

اس دور کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو یا آپ ﷺ کے کسی ساتھی کو جسمانی تکلیف نہیں پہنچائی۔ مگر ایسا ضرور ہوا کہ جب کسی گھر کا فرد اسلام قبول کر لیتا تو اس کے گھر میں اس کی مخالفت ضرور شروع ہو جاتی۔

دوسرا دور: نبوت کے دس سال: جب کھلے عام تبلیغ کا حکم ہوا:

نبوت کے چوتھے سال، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ مشرکینِ مکہ کی پروا کیے بغیر دینِ اسلام کی دعوت کھلے عام دی جائے۔ اس کا ذکر سورۃ الحجر کی آیت نمبر ۹۴ میں ہے:

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ۔

پس اے نبی، جس چیز کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے، اسے کھلم کھلا بیان کرو اور مشرکین کی ذرا پروا نہ کرو۔

مفتی محمد قاسم القادری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ چوتھے سال، جب اعلانِ نبوت ہو چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجر کی یہ آیت نازل فرمائی اور نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ جو کچھ آپ کو وحی کے ذریعے بتایا جا رہا ہے، اسے کھلے عام بیان فرمائیں۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ﷺ نے علانیہ تبلیغِ اسلام شروع کی، شرک اور بت پرستی کی کھلم کھلا تردید فرمائی۔ اس کے نتیجے میں پورے قریش اور اہلِ مکہ کی مخالفت شدید ہو گئی،

اور رسولِ کریم ﷺ اور مسلمانوں کو سخت اذیتوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔یہی وہ وقت تھا جب آزمائشوں اور مشکلات کا وہ دور شروع ہوا جس کا پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے۔اس دس سالہ دور کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا حصہ (چوتھے سے چھٹے سال تک):ابتدائی مخالفت اور ظلم و ستم کا آغاز:

اس عرصے میں مشرکینِ مکہ نے آپ ﷺ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا، طعن و تشنیع کی گئی، جھوٹے الزامات لگائے گئے، اور آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر، مجنون اور کاہن کہا جانے لگا (نعوذ باللہ)۔کمزور مسلمانوں پر ظلم و ستم کیا جانے لگا، جس کی وجہ سے کچھ صحابہؓ کو شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسرا حصہ (ساتویں سے نویں سال تک):ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد سختیوں میں شدت

اس دور میں حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی، جن کی وجہ سے قریش کی طرف سے ہونے والی سختیوں میں کمی تھی۔ان دونوں عظیم ہستیوں کی رحلت کے بعد مشرکینِ مکہ کی مخالفت اور ظلم و ستم میں شدت آگئی۔اسی دوران آپ ﷺ کی اجازت سے کئی صحابہ کرامؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تاکہ مشرکینِ مکہ کے ظلم سے بچ سکیں۔قریش نے آپ ﷺ اور آپ کے خاندان کا معاشرتی بائیکاٹ کیا، جس کی وجہ سے شعبِ ابی طالب میں تین سال کا محاصرہ ہوا۔

تیسرا حصہ (دسویں سے بارہویں سال تک): ہجرت کی تیاری اور مدینہ کی طرف توجہ

اس دور میں قریش نے آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے۔آپ ﷺ نے مدینہ کے انصار سے ملاقاتیں کیں اور انھیں اسلام کی دعوت دی، جس کے نتیجے میں بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ عمل میں آئیں۔آپ ﷺ

نے اپنے صحابہ کرامؓ کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دی، اور آخر میں خود بھی مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

ان دس سالوں میں نبی کریم ﷺ کی حکمتِ عملی اور اہم نکات

- صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا: آپ ﷺ نے ہر طرح کی اذیتوں اور مشکلات کا سامنا صبر اور ہمت کے ساتھ کیا، اور اپنی دعوت کا کام مسلسل جاری رکھا۔
- مشرکینِ مکہ کے مظالم کے جواب میں صبر و خاموشی اختیار کرنا: قریش کی جانب سے دی جانے والی تکالیف کا جواب صبر، حلم اور حکمت سے دیا۔
ہر قسم کے حالات کا ہمت اور حوصلے سے سامنا کرنا
- دین سے ہٹانے کے لیے دی جانے والی لالچ کو مسترد کرنا: قریش نے دولت، اقتدار اور عورتوں کی پیشکش کی، مگر آپ ﷺ نے اپنی دعوت جاری رکھی۔
- تصادم سے گریز کرنا: ان دس سالوں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جہاں آپ ﷺ نے کسی بھی قسم کی جارحیت یا تصادم کا راستہ اختیار کیا ہو۔
- اخلاقِ حسنہ کا بہترین نمونہ پیش کرنا: مشرکین کے برے الفاظ کا جواب دعا سے دیا۔ پتھر کھانے کے باوجود نرمی کا مظاہرہ کیا۔ دل آزاری کے بدلے شفقت اور محبت سے پیش آئے۔

جب حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے تو ہجرت کی اجازت دی:

- آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کو دو مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔

❖ دیگر قبائل کا دورہ کیا طائف کا سفر اسی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ مختلف مقامات پر اسلام کی دعوت دی: مکہ کے بازاروں، میلوں اور اجتماع میں جاکر تبلیغ فرمائی۔ یثرب (مدینہ) کے لوگوں سے معاہدے کیے

❖ بیعتِ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے ذریعے انصار سے حمایت حاصل کی۔اہم خاندانوں میں دعوت پہنچائی، قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں اسلام قبول کرنے کی وجہ سے گھرانوں میں اختلافات پیدا ہوئے، جس سے مشرکینِ مکہ کی وحدت ٹوٹ گئی۔ صحابہ کرامؓ کو پہلے مدینہ ہجرت کی اجازت دی، پھر خود بھی ہجرت فرمائی۔

میں نبوت کے ان دس سالوں میں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی کا خلاصہ کچھ یوں بیان کر سکتا ہوں۔

صبر ،استقامت اور مسلسل دعوتِ دین (عملِ مسلسل)

1. نبوت کا کھل کر اعلان اور سب کو اسلام کی دعوت دینا
2. مکہ سے باہر کے قبائل سے رابطے اور تبلیغِ اسلام کی توسیع
3. ایک مرکز کا قیام (دارِ ارقم) جہاں صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی

ہجرت کا فیصلہ (حبشہ اور مدینہ: نئے لوگ، نیا شہر، نئی امید)

4. تصادم سے مکمل گریز اور حکمتِ عملی کے تحت صلح کی پالیسی اختیار کرنا

یہ دس سال آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے لیے سخت آزمائش کا دور تھا۔ تاہم، اس حکمتِ عملی کے نتیجے میں اسلام ایک مضبوط بنیاد پر استوار ہوا، اور بالآخر مدینہ منورہ میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ ان تمام مراحل سے ہمیں صبر، حکمت، تدبر، استقامت اور عملی منصوبہ بندی کا درس ملتا ہے، جو ہر دور میں دعوتِ دین کے لیے ضروری ہے۔

تیسرا دورِ نبوت: ہجرت کے بعد سے لے کر صلح حدیبیہ سے پہلے تک

مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے آپ ﷺ نے کئی قبائل کو اسلام کی دعوت دی۔ ان میں سے یثرب سے حج کی خاطر آنے والے لوگوں نے آپ ﷺ کی بات تسلیم کی اور آپ نے انھیں اپنے ہاں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے پیغمبر اور اپنے امام و فرمانروا کی حیثیت سے دعوت دی، جو آپ ﷺ نے قبول کی اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ اس طرح یثرب اب آپ ﷺ کا مرکز بنا اور اس کا نام بھی بدل گیا اور اسے مدینۃ النبی کہا جانے لگا۔ پہلی سن ہجری سے لے کر پانچ سن ہجری تک کا دور کئی نئی آزمائشیں بھی لے کر آیا۔ اس دور کی تفصیلات پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہیں۔ یہاں میں اس بات کا مطالعہ پیش کروں گا کہ آپ ﷺ نے اس دور میں کسی طرح کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری ترتیب دی، جس میں آج بھی ہم سب کے لیے ایک بہترین رہنمائی ہے۔

اس دور میں اختیار کی گئی حکمت عملی کے چند اہم پہلو کچھ اس طرح سے ہیں؛

- اوس و خزرج کے ساتھ ایک معاہدہ جس کی رو سے وہ اس دعوت کی خاطر ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار تھے۔
- مدینہ منورہ پہنچتے ہی یثرب میں بسنے والے تمام لوگوں کے ساتھ جن میں یہودی بھی شامل تھے کا میثاق مدینہ پر راضی ہونا۔ اس معاہدے کی رو سے مدینہ منورہ کی حفاظت سب کی مشترکہ ذمہ داری ٹھہری۔ میثاق مدینہ کی بنیاد پر مساوات، عدل اور مذہبی آزادی کے اصولوں پر ایک اسلامی ریاست کے قیام کی ایک عملی مثال۔ اس معاہدے کی رو سے آپ ﷺ نے مسلمانوں سمیت سب شہریوں کو برابر حقوق فراہم کیے۔ لوگوں کے اتحاد سے نہ صرف استحکام آیا، بلکہ اسلام کی تحریک کو بھی دیرپا اثرات میسر آئے۔

- ❖ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں واقع قبائل کے ساتھ معاہدے کیے، مدینہ منورہ کے دفاع کی خاطر ایک مربوط حکمت عملی ترتیب دی، جنگ کی صورت میں دفاعی حکمت عملی کا منصوبہ بنایا، مشرکین مکہ کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی، جنگ کی صورت میں مشرکین مکہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔
- ❖ معاشی مسائل کے حل کے لیے مواخات کا تصور پیش کیا۔
- ❖ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا۔
- ❖ آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کی۔
- ❖ مدینہ منورہ میں مسلمانوں نے معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لیے اقدامات کیے۔
- ❖ یہودیوں نے جب معاہدے کی خلاف ورزی کی تو ان کے خلاف سخت کارروائی عمل میں لائی گئی۔
- ❖ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لیے ایک محفوظ ماحول فراہم کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں دین اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔
- ❖ بھائی چارے اور تعاون کی بنیاد پر ایک مضبوط معاشرہ قائم ہوا اور آپ ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں کے درمیان عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی حکومت قائم کی۔
- ❖ مدینہ کی ریاست کے قیام کے بعد مسلمانوں نے مشرکین مکہ کے خلاف بدر، احد اور خندق کی جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں میں مسلمانوں نے دشمنوں کے

خلاف اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور اسلام کی قوت کو ثابت کیا۔

- ❖ مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرتی نظام کی بنیاد رکھی گئی جو حقوق و فرائض کی منصفانہ تقسیم اور انصاف کے اصولوں پر مبنی تھا۔ یہی نظام بعد میں اسلامی تہذیب کی بنیاد بنا۔
- ❖ مدینہ منورہ میں باقاعدہ ایک ریاست کے قیام نے جزیرۃ العرب میں آباد لوگوں کو ایک واضح پیغام دیا کہ اب ایک باقاعدہ ریاست جزیرۃ العرب میں قائم ہو چکی ہے۔

اب تک جو باتیں میں نے بیان کی ہیں، ان کی روشنی میں اس دور میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے؟

- ❖ قریبی قبائل اور مدینہ منورہ کے آس پاس آباد یہودیوں کے ساتھ دوستانہ معاہدے (ایک ریجنل معاہدہ)
- ❖ حملہ کرنے کی بجائے دفاعی حکمت عملی، معاشی اور معاشرتی ترقی پر توجہ، منافقین کا خاتمہ، اپنی افرادی قوت میں اضافہ۔
- ❖ جنگ کی بجائے امن کو ترجیح دی اور مشرکین مکہ پر حملہ کرنے کی بجائے دفاع پر توجہ دی۔ لیکن اگر کسی نے جنگ مسلط کی تو اس کا بھرپور جواب دیا گیا۔

چوتھا دور: صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک

صلح حدیبیہ میں جزیرۃ العرب میں آپ ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست کو مشرکین مکہ نے بطور ریاست تسلیم کر لیا تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس معاہدے کی رو

سے مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو بھی کھلے عام اسلام پر عمل کرنے کی آزادی تھی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ اب آپ ﷺ مغربی عرب کے کچھ حصوں پر ایک حقیقی حکمران ہیں۔ میرے نزدیک اس معاہدے کی شق کہ آئندہ دس سال تک کوئی جنگ نہیں ہو گی، نے آپ ﷺ کو ایک ایسا موقع فراہم کر دیا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے بیرونی دنیا سے رابطے شروع کر دیے۔

میں نے اس دور میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری کا جب مطالعہ کیا تو درج ذیل چند اہم نکات سامنے آئے؛

- جنگ خندق کے بعد آپ ﷺ نے یہ جان لیا تھا اور اس بات کا اعلان بھی کیا تھا کہ اب کبھی بھی مشرکین مکہ، مدینہ منورہ پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے۔ اس دور میں آپ ﷺ نے مشرکین مکہ سے صلح حدیبیہ کی جس کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں جو امن قائم ہوا اور جس کی بنیاد پر آپ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ اکرامؓ کو جزیرۃ العرب میں آزادی سے سفر کرنے کا موقع ملا۔
- امن کسی بھی نظریے کی ترویج کے لیے بے حد اہم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک بڑے مقصد کی خاطر صلح حدیبیہ کے موقع پر سخت شرائط بھی تسلیم کیں۔ یہ بات بھی آپ ﷺ کے علم میں تھی کہ مشرکین جو بہت سے قبائل کا مجموعہ تھا اس معاہدے پر عمل نہ کر سکیں گے، جبکہ مسلمان اس معاہدے کی سختی سے پابندی کریں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ صرف دو سال کے اندر اندر قریش نے اس معاہدے کی ایک اہم شق کی خلاف ورزی کی۔ اس دوران مسلمان اپنی قوت میں بھی اضافہ کر چکے تھے اور یوں آپ ﷺ نے مکہ پر حملہ کیا اور اسے فتح کیا۔

- امن کی فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی قبائل کے ساتھ ساتھ قریبی ممالک کے سربراہوں کو خطوط لکھے۔ ایک بڑی تعداد میں تبلیغی وفود کو روانہ کیا اور اس طرح کئی قبائل مسلمان بھی ہوئے۔ مدینہ منورہ سے یہودیوں کو باہر نکالا۔ کئی اہم قبائل کو اپنا حلیف بھی بنایا۔

اب تک کی گئی بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد عرب میں امن قائم ہو چکا تھا، بظاہر جنگ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب، غیر عرب قبائل اور دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے اور اپنی دعوت کو پھیلانے کے لیے کئی اقدامات اٹھائے۔ ایک بار جب مسلمانوں کو اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ اب مشرکین مکہ ان پر حملہ آور نہیں ہوں گے تو انھوں نے یہودیوں کے مراکز خیبر اور فدک کو فتح کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قبائل جو مشرکین مکہ کے اتحادی بھی تھے اور جو یہودیوں کے ڈر سے اسلام قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے، اسلام لے آئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دور کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے؛

امن کو جنگ پر ترجیح اور امن کی وجہ سے دعوت کا کام پھیلا اور ایک بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ اسلام کی دعوت کو جزیرۃ العرب سے بھی باہر تک پہنچایا اور اس وقت کی بڑی طاقتوں سے براہ راست رابطہ کیا۔ اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت کی، ریاست مدینہ کی شکل میں اسلام کے فوائد دنیا کے سامنے رکھے۔

پانچواں دور فتح مکہ سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت تک

صلح حدیبیہ کے بعد جزیرۃ العرب میں سیاسی حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اب ایک مضبوط مسلم ریاست قائم ہو چکی تھی۔ اٹھویں ہجری میں مشرکینِ مکہ کے اتحادی قبیلے بنو بکر نے مسلمانوں کے اتحادی قبیلے بنو خزاعہ پر حملہ کیا، اور مشرکینِ قریش نے اس حملے میں بنو بکر کی مدد کی۔ یہ صلح حدیبیہ کی کھلی خلاف ورزی تھی، جس کے نتیجے میں معاہدہ ختم ہو گیا۔ اس دوران مسلمان کافی طاقتور ہو چکے تھے۔ جب ابو سفیان کو احساس ہوا کہ مسلمان مکہ پر حملہ کر سکتے ہیں، تو اس نے معاہدے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ قبیلہ بنو خزاعہ نے رسول اللہ ﷺ سے مدد کی فریاد کی، جس پر آپ ﷺ نے فتح مکہ کا فیصلہ کیا۔

میں اس حملے کی تفصیلات پچھلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں، یہاں صرف آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری پر توجہ دوں گا، جو ہمارے لیے ایک بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

***

فتح مکہ کی حکمت عملی اور سفارتی اقدامات

مکمل رازداری اور اچانک حملہ:

لشکر کی تیاری کے دوران کامل رازداری رکھی گئی، تاکہ مشرکینِ مکہ کو حملے کی کوئی اطلاع نہ ملے۔ مسلمانوں نے اچانک حملہ کیا، جس سے مشرکین کو تیاری کا موقع نہ مل سکا۔

نفسیاتی برتری: مشرکینِ مکہ پر خوف طاری ہو گیا، کیونکہ انھیں اس وقت خبر ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ کی سرحد پر پہنچ چکے تھے۔

بلا جنگ فتح کی حکمت عملی: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کوشش تھی کہ مکہ بغیر جنگ کے فتح ہو اور خونریزی نہ ہو۔

شہر کا مؤثر محاصرہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ میں چاروں طرف سے فوج داخل کرنے کا حکم دیا، تاکہ اہلِ مکہ کے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔

اس حکمت عملی نے اہلِ مکہ کو مجبور کر دیا کہ وہ یا تو جنگ کریں یا ہتھیار ڈال دیں۔

ابوسفیان کے لیے امان: مشرکینِ مکہ کے سردار ابوسفیان کے گھر کو امان دی گئی، جس کے بعد جنگ کا امکان بالکل ہی ختم ہو گیا۔

کعبہ کی تطہیر: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کعبہ کا طواف کیا اور وہاں رکھے ہوئے بتوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب جزیرۃ العرب میں صرف اللہ کی عبادت ہو گی۔

عام معافی کا اعلان: مشرکینِ مکہ کو عام معافی دی گئی، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے مسلمانوں پر ظلم کیے تھے۔ یہ معافی ان کے دلوں کو جیتنے کا ذریعہ بنی۔

وفاداری کی اعلیٰ مثال: آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا: میری زندگی بھی تمہارے ساتھ ہے اور میری موت بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔یہ مشکل وقت میں ساتھیوں کے ساتھ وفاداری کی بے مثال نظیر ہے۔

فتح کے بعد سفارتی سرگرمیاں: وفود کی مہمان نوازی اور معاہدے کرنا۔قبائل کو اسلام کی دعوت دینا اور ان کی باتیں سننا۔بنی ثقیف کے خلاف مہم کی تیاری۔روم کی سرحد تک تبوک کا سفر۔

فتح مکہ کے بعد خارجہ پالیسی اور سفارت کاری

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ کی سفارت کاری اور خارجہ پالیسی کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے:

عام معافی کا اعلان: دیرینہ دشمنوں کی زیادتیوں کو بھلا کر عام معافی دی گئی۔

پوری قوت کے ساتھ جنگیں لڑنا: جب ناگزیر ہو، تو بھرپور طاقت سے جنگ (جنگ حنین اور جنگ تبوک)۔

ریاستی قوانین کی تیاری: اسلامی حکومت کے نظامِ ریاست کے لیے قوانین مرتب کیے گئے۔

افرادی قوت میں اضافہ: حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد مسلمان اکٹھے ہوئے، جو اسلامی ریاست کی طاقت میں اضافے کی علامت تھا۔

صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت: صحابہ کرام کو قیادت کی تربیت دی گئی تاکہ وہ اسلام کو مزید پھیلائیں۔

قبائل اور غیر مسلم ریاستوں سے معاہدے:

جزیرۃ العرب میں امن قائم کرنے کے لیے عیسائیوں اور دیگر قبائل سے معاہدے کیے گئے۔

فتح مکہ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ ایک بہترین سفارت کار اور مدبر حکمران تھے۔ جہاں سے آپ ﷺ ایک رات کی تاریکی میں ہجرت کر کے نکلے تھے، وہاں آٹھ سال بعد ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ اس موقع پر نہ قتل عام ہوا، نہ لوٹ مار، نہ عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا گیا، اور نہ کسی کو قید کیا گیا۔ اسی شہر میں جہاں آپ ﷺ اور صحابہ کرام پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، آپ ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں کو معاف کر دیا۔

یہ وہ بہترین خارجہ پالیسی اور سفارت کاری تھی جو آج بھی ہمارے لیے ایک عملی نمونہ ہے — بشرطیکہ مقصد اسلام کی دعوت دینا ہو، نہ کہ صرف مالِ غنیمت اور کشور کشائی۔

***

آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری: حکمت، تدبر اور عملی کامیابی

اب تک آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی و سفارت کاری بارے جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے؛

امن کو جنگ پر ترجیح دینا: آپ ﷺ نے ہمیشہ معاف کرنے کو سزا دینے پر فوقیت دی اور جنگ و جدل کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ہر حال میں آپ ﷺ نے امن قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی سب سے بڑی مثال فتحِ مکہ ہے، جہاں آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا، حالانکہ اہلِ مکہ نے برسوں تک آپ ﷺ اور صحابہ کرام کو تکالیف پہنچائی تھیں۔ اس حسنِ سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتحِ مکہ کے بعد بڑی تعداد میں لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

مہمان نوازی اور حسنِ سلوک: تاریخ میں یہ نظیر نہیں ملتی کہ کسی فاتح نے اپنے دشمنوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہو جو آپ ﷺ نے کیا۔ آپ ﷺ نے مدینہ میں آنے والے وفود کا بے حد احترام کیا۔ ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے عیسائیوں کے ایک وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرنے کی اجازت دی، جو بین المذاہب رواداری کی روشن مثال ہے۔

معاہدوں کی پاسداری: آپ ﷺ نے ہمیشہ کیے گئے معاہدوں کی پاسداری کی، خواہ وہ مسلمانوں کے حق میں ہوں یا خلاف۔ جب ایک یہودی اور ایک مسلمان کے درمیان تنازعہ ہوا، تو آپ ﷺ نے بغیر کسی جانبداری کے یہودی کے

حق میں فیصلہ دیا کیونکہ وہ حق پر تھا۔ یہی انصاف پسندی آپ ﷺ کی کامیاب سفارت کاری کا ایک اہم عنصر تھا۔

سچائی اور دیانت داری: آپ ﷺ کی سب سے نمایاں خوبی سچائی اور دیانت داری تھی، جس کی وجہ سے لوگ آپ ﷺ پر مکمل بھروسا کرتے تھے۔ **الصادق و الامین** کا لقب آپ ﷺ کو بعثت سے پہلے ہی حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ ﷺ کوئی معاہدہ کرتے، تو لوگ اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے تھے۔

انصاف کی بالادستی: نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات میں عدل کے اصول کا ہر صورت میں خیال رکھنا تھا۔ اس کی وجہ اس بارے میں قرآنی احکامات ہیں۔ اسلامی نظام کی بنیاد ہی عدل اور اس کے استحکام میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور آئینی نظام میں انصاف ہی صحیح راستہ ہے جس سے لوگوں کے درمیان دیرپا اور پرامن ماحول قائم کیا جاتا ہے۔

آزادی کا اصول: شخصی آزادی اسلام میں سیاسی نظام کی ایک طرح سے اساس ہے۔ اس اسلامی قانون کے تحت افراد اور گروہوں کے لیے کسی بھی مذہب کو اپنانے اور اس پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ اس میں مذہب کی آزادی کے ساتھ ساتھ رائے کی آزادی، اور سیاسی اور سماجی آزادی بھی شامل ہیں۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی طاقت بھی کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی ان لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جنھوں نے آپ ﷺ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپ ﷺ نے قرآن کے حکم کے مطابق کہ دین میں کوئی جبر نہ ہو، کبھی بھی کسی کو زبردستی اسلام قبول کرنے کے لیے نہیں کہا۔

اتحاد اور وقار انسانیت کا اصول: اس اصول کا مقصد ہر حال میں انسانی وقار کا خیال کرتا ہے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوران جنگ اور جنگ کے بعد انسانی وقار کی

دھجیاں اڑائی جاتی تھیں۔ لیکن نبی پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی مفتوحہ علاقے میں ایسا کچھ نہیں کیا۔اس کی ایک اہم مثال فتح مکہ کے وقت عام معافی کا اعلان ہے۔ آپ ﷺ کا یہ کہنا تھا دوسرا فریق بھی انسان ہے خواہ اس کا تعلق دشمن قبیلے سے ہی کیوں نہ ہو۔اس لیے ضروری ہے کہ اس کا احترام کیا جائے، اس کی عزت و آبرو اور خون اور مال کی حفاظت کی ذمہ داری لی جائے۔

باہمی تعاون: نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ عدل وانصاف کے ساتھ ساتھ ریاستوں کے درمیان مضبوط اور دیرپا باہمی تعلقات کا قیام عمل میں لایا ہے۔ یاد رہے کہ باہمی تعاون کے لیے اصول واخلاق اور رواداری کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اس موقع پر اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی صورت میں باہمی تعلقات اخلاق، حسن سلوک اور رواداری جیسے طرز عمل پر نئے سرے سے غور کرنا ضروری ہو گا۔

جنگ سے حتی الامکان بچاؤ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کبھی بھی اپنے دشمنوں سے مقابلے کرنے کی تمنا نہ کرو، اللہ سے دعا کرو کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہوں جو دوسروں کے ساتھ امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، لیکن اگر کبھی ان کا سامنا ہو تو صبر کرو اور حکمت کے ساتھ مقابلہ کرو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے کی طرح تمہارے قریب ہے۔ امن کو جنگ پر ترجیح دینے کا ایک اور ثبوت صلح حدیبیہ بھی ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ جب بھی کفار مکہ نے صلح کی تجویز پیش کی، آپ ﷺ نے کھلے دل سے اسے تسلیم کیا اور جنگ کی بجائے معاہدہ کرنے کو پسند فرمایا۔

آپ ﷺ کا امن کو ترجیح دینا: امن اپنی بات کو آگے پہنچانے میں مددگار ہوتا رہے، یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو دعوت کے میدان میں کام کرتے ہیں۔ اگر منصوبہ علاقہ فتح کرنا ہو تو پھر جنگ ہی ایک مناسب طریقہ ہے۔ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کو اگر یہ کہا

جائے کہ وہ امن کی خواہاں ایک پالیسی تھی تو بات بالکل درست ہو گی۔ امن تو ایک ہم آہنگی یا پر سکون ماحول کا نام ہے۔

رحم دلی اور معافی: آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو رحم دلی اور معافی بھی ہے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب آپؐ تیرہ سال تک مکہ میں رہے۔ اس وقت قریش مکہ نے آپ ﷺ کی شدید مخالفت کی اور آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر جس قدر ممکن تھا معاشی اور معاشرتی ظلم کے ساتھ ساتھ جسمانی تشدد بھی کیا گیا۔ اس دوران آپ ﷺ نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب آپ ﷺ ایک مضبوط فوج کے ساتھ مکہ فتح کرتے ہیں اور آپ ﷺ نے ان ظلم کرنے والوں پر رحم کیا اور انھیں معاف کر دیا۔ اس وقت رحم دلی اور معاف کرنا آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم حصہ تھا۔

صبر یا انتقام: آپ ﷺ کی زندگی میں کئی ایسے مواقع بھی آئے جب آپ ﷺ کو انفرادی طور پر لوگوں کی طرف سے بہت زیادہ ظلم و زیادتی کا سامنا کرنا پڑا۔ تاریخ اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے، ایک مثال طائف کا واقعہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کو زہر دینے کا معاملہ بھی تاریخ میں درج ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کے جب کسی گروہ یا فرد نے امت مسلمہ سے کوئی زیادتی کی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر معاف کرنے کی بجائے ان کے سامنے کھڑے ہونے کو ترجیح دی۔ اس کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جنگ خندق میں کے موقع پر یہود کے قبیلے کی طرف سے غداری کی گئی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ممکن تھا کہ قریش مسلمانوں پر قابو پا لیتے۔ اس لیے اس موقع پر آپ ﷺ نے صبر نہیں کیا اور نہ ہی معاف کیا بلکہ انھیں ان کے جرم کی سزا دی۔ اس لیے آپ ﷺ کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ساتھ ساتھ ہی دیکھنے چاہییں۔

جنگ میں بھی ایک وقار: آپ ﷺ نے جنگ کے دوران بھی خارجہ پالیسی کے ایک سنہری اصول کو سامنے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ جنگ تو لڑی ہی غیروں سے جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک بار ایک عورت کی لاش دیکھی جو ایک فوجی کارروائی میں ماری گئی تھی۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ کو بے حد دکھ ہوا اور آپ ﷺ نے حکم دیا کہ دشمن کی عورتوں اور ان کے بچوں کو قتل نہ کیا جائے۔ یہی حکم ابو بکر صدیق نے اپنے ایک فوجی کمانڈر کو دیا تھا کہ وہ عورتوں یا بچوں کو یا کسی بوڑھے، کمزور کو قتل نہ کریں۔ آپ ﷺ کی جنگ بارے میں ہدایات کا خلاصہ کچھ یوں ہیں؛

- ❖ صرف اللہ کے نام کی سربلندی کے لیے لڑو اور ان لوگوں سے لڑو جو اللہ کا انکار کرتے ہیں۔
- ❖ جنگ کے دوران یا بعد میں کسی کا مال نہ چوری کرو، لاشوں کی بے حرمتی نہ کرو، بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور ان کو بھی جو آپ کے سامنے ہتھیار نہ اٹھائیں اور پناہ طلب کریں، ان کو قتل نہ کرو۔
- ❖ جنگ سے پہلے دشمن کے سامنے تین باتیں رکھو۔ انھیں اسلام کی طرف بلاؤ، اگر وہ اسلام میں داخل ہونے پر راضی ہوں تو ان سے جنگ نہ کرو، اگر وہ اسلام میں داخل ہونے سے انکار کریں تو ان سے جزیہ لیں۔ اس پر اگر وہ راضی نہ ہوں تو پھر آخری حل جنگ ہے۔

بین الاقوامی یا بین القبائل معاہدے: دیگر قبائل یار یاستوں سے معاہدے خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو ہوتے ہیں۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بڑی تعداد میں معاہدے کیے۔ ان معاہدوں کے مطالعے سے چند ایسی باتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں جو اس سے پہلے عرب میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے معاہدوں

کا احترام کرنا سکھایا۔

علاقائی سلامتی اور معاہدے: آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی ایک ہم جزو علاقائی سلامتی رہا ہے۔ اس کا ثبوت آپ ﷺ کا مدینہ سے باہر قبائل کے ساتھ سیاسی تعلقات کو استوار کرنا ہے۔ مدینہ آمد کے فوراً بعد آپ ﷺ نے ایک ہفتے کی مسافت تک واقع قبائل کے پاس خود بھی گئے اور وفود کے ذریعے بھی دوستی کے معاہدے کیے۔

وسیع تناظر میں معاہدے: پچھلے صفحات میں میثاق مدینہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ میثاق مدینہ کا اہم پہلو اس وقت زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ اس معاہدے کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ یہ معاہدہ کسی بھی شخص کی ذات سے لے کر ریاست تک کے تمام معاملات اور اکٹھے ہونے سے لے کر اظہار رائے کی آزادی تک کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق مدینہ کے باشندوں کی جان ومال کی حفاظت کرنا سب کا ایک اجتماعی فرض قرار دیا گیا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے کسی بھی طرح کی قبائلی یا مذہبی وابستگی کو بنیاد نہیں بنایا گیا بلکہ ہر وہ شخص جو مدینہ میں رہتا تھا وہ اس کا حصہ تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس معاہدے کی رو سے ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق زندہ رہنے کا حق تھا۔ اسے اپنے ذاتی معاملات، اپنے مذہب یا قبیلے کی روایات کے مطابق گزارنے کی آزادی تھی۔

کسی بڑے مقصد کی خاطر کچھ چیزوں کو نظر انداز کرنا: آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم پہلو کسی بڑے مقصد کے لیے کسی چھوٹی چیز کو نظر انداز کر دینا بھی ہے، اس کی ایک مثال صلح حدیبیہ بھی ہے، جس کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ یہاں اسے آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کے اہم جزو کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق آپ ﷺ نے انتہائی نامناسب شرائط قبول کیں جیسے کہ اس سال مسلمان کعبہ کی زیارت نہیں کر سکیں گے، مکہ سے کسی ایک شخص کو بھی مدینہ جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ بظاہر اس معاہدے کی تمام شقیں مسلمانوں کے خلاف

نظر آرہی تھیں لیکن اس معاہدے کے تحت مسلمانوں اور قریش کے درمیان دس سالہ جنگ بندی پر بھی اتفاق ہوا۔

دشمنی بھی اور تجارت بھی: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود اس کے کہ یہودی اور دیگر قبائل کے لوگ اسلام کے زبردست مخالف تھے، ان کے ساتھ سماجی واقتصادی تعلقات قائم رکھے۔ یہاں تک کہ آپ ان سے قرض بھی لیتے تھے۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ بے حد دلچسپ ہے۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زرہ ایک غیر مسلم کے پاس رہن رکھ کر قرض لیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا، اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زرہ ایک یہودی کے قبضے میں تھی۔

سوالات اور ان کے جوابات

اس مقالے کے شروع میں کچھ سوالات درج کیے گئے تھے، جن کے جوابات اس مقالے کی شکل میں دیے گئے ہیں۔ وہ سوالات کچھ یوں تھے؛

1- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ کون سی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری تھی، جسے بروئے کار لاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کامیاب اسلامی انقلاب برپا کیا؟

2- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری میں وہ کون سے معاشی، معاشرتی، سیاسی، قبائلی، عوامی، اور تاریخی عوامل شامل تھے، جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشِ نظر رکھا؟

3- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری ترتیب دیتے وقت اور دیگر قبائل سے مذاکرات کرتے ہوئے انسانی نفسیات کا کس طرح بہترین استعمال کیا، اور کامیاب سفارت کاری کی کون سی خوب صورت مثالیں ہماری رہنمائی کے لیے چھوڑیں؟

4- کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ترتیب دی گئی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری موجودہ دور میں بھی قابل عمل ہے؟ اگر ہاں (یقیناً ہے)، تو اس پر عمل درآمد کی کیا

ممکنہ صورتیں ہوسکتی ہیں؟

میں نے ان مقالے میں ان سوالات کے جوابات درج کیے ہیں۔ اسے مزید آسان کرنے کے لیے میں آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی وسفارت کاری کو ایک ٹیبل کی صورت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ یہ ٹیبل آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی وسفارت کاری کو سمجھنے اور سوالات کے جوابات حاصل کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوگا۔

***

ماہ وسال	نبوت کے پہلے تین سال مکہ میں
سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال	اہل مکہ بت پرستی میں مشغول تھے، وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا پیروکار کہتے تھے، آپ مکہ میں صادق وامین کے نام سے جانے جاتے تھے، کئی اصلاحی انجمنیں کام کر رہی تھیں، قریش مکہ کے مقابل کی کوئی طاقت جزیرۃ العرب میں نہیں تھی، عرب تجارت کرتے تھے، جزیرۃ العرب میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی، قبائلی زندگی ہی عام تھی۔
خارجہ پالیسی و سفارت کاری	1. آپ نے ابتدا میں دشمنی مول نہیں لی بلکہ مکمل رازداری سے اپنے قریبی لوگوں کو دعوت دی۔ 2. معاشرے کے بااثر طبقے کو اپنی طرف راغب کیا۔ 3. معاشرے کے مظلوم طبقے کو بھی اپنے قریب کیا۔ 4. اپنے ساتھیوں کی تربیت بہتر انداز سے کی تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو دوسروں تک ایک اچھے انداز سے پہنچا سکیں۔
نتائج	1. مشرکین مکہ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ سخت مخالفت کی۔ 2. ایک قلیل تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ 3. مکہ کے کئی بااثر لوگوں کے ساتھ ساتھ کئی پسے ہوئے طبقات کے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ان کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

ماہ وسال	نبوت کے چوتھے سال سے لے کر تیرہویں سال، دعوت کو عام کرنے کے حکم کے بعد:
سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال	قریش کا قبیلہ مکہ مکرمہ میں بااثر تھا۔ وہ جزیرۃ العرب میں زندگی کے مذہبی اور معاشی پہلوؤں کو کنٹرول کرتا تھا۔ وہ کسی بھی ایسی تبدیلی کے خلاف مزاحم تھے جس سے ان کے جمود کو خطرہ لاحق ہو، بشمول اسلام کے توحیدی پیغام۔ انھوں نے بھی اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، جس کی خاطر وہ اکثر اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف سماجی اور اقتصادی پابندیوں کا سہارا لیتے تھے۔ انھوں نے اسلام دشمنی میں ظلم و ستم کی انتہا کی۔
خارجہ پالیسی و سفارت کاری	بے حد صبر اور حکمت علمی کا مظاہرہ اور مشرکین مکہ کی طرف سے کی جانے والی توہین، تضحیک اور جسمانی تشدد کو برداشت کرنا۔ اسلام کا پیغام پہنچانے میں ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ کرنا۔ دشمنی اور نفرت کا جواب معافی اور مہربانی سے دینا۔ دلوں پر حکومت کرنے کی خاطر لوگوں کی رہنمائی کرنا ان پر مہربانی کرنا اور ان کے لیے بھلائی کی دعا کرتا۔ اسلام کے بنیادی مقاصد جیسے توحید، ایمان اور اخلاقی اصول جیسے سماجی انصاف پرہیزگاری، ظلم و ستم سے باز آنا، اور اخلاقی برتری جیسے

	پیغام کو عام کرنے کی کوشش کرنا۔ تبلیغ جاری رکھی اور میل ملاقات، مکالمے اور بات چیت میں مشغول رہنا۔ جب مشرکین مکہ نے ظلم و ستم کی حد کر دی اور کوئی راستہ نہ رہا تو پہلے حبشہ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کرنا۔ مشرکین مکہ کی طرف سے پیدا کی گئی مشکلات اور مخالفتوں پر صبر، در گزر، اور معافی جیسے اصولوں کے ساتھ ثابت قدم رہنا، امن، مفاہمت، سچائی اور راستبازی پر ثابت قدم رہ کر اپنی منزل حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھنا کسی کے خلاف کوئی بھی کارروائی نہ کرنا۔
نتائج	1. ایک مناسب تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ 2. جو بھی ایک مرتبہ آپ ؐ کا ساتھی بنا وہ واپس نہیں گیا، ماسوائے منافقین کے۔ 3. جزیرۃ العرب میں عام لوگوں تک آپ ﷺ کی بات پہنچی۔ 4. کئی قبائل سے اکادکا افراد بھی مسلمان ہوئے۔ 5. مشرکین مکہ نے آپ کو (نعوذ باللہ) قتل کا منصوبہ بنایا۔

ماہ و سال	مدینے میں پہلے دو سال (سن دو ہجری تک)
سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال	اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر ور سوخ اور مدینہ میں مسلمان ہونے والے لوگوں کی تعداد نے مشرکین مکہ کو پریشان کر دیا تھا۔ انھیں آپ ﷺ کی قیادت میں اب ایک ریاست کا سامنا تھا۔ نیا نظام انھیں معاشی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ وہ اب ایک نیا مذہبی اور سماجی نظام قائم ہوتا دیکھ رہے تھے، جو ان کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ مشرکین مکہ نے پہلے ہجرت میں خلل ڈالنے کی کوششیں کیں۔ جب آپ ﷺ نے ایک کامیاب ہجرت کرلی تو یہ بات انھیں قبول نہ تھی۔ وہ اس بات کی کھوج میں تھے کہ کیسے مدینہ میں مسلمانوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ ان کی تجارتی گزر گاہ (مکہ سے شام) خطرے میں تھی۔ مکہ کے کئی اہم افراد آپ ﷺ ہی نام کے ساتھ ہجرت کر چکے تھے۔ یہودی جو کبھی قریش کے دوست تھے اب آپ ﷺ کے (ایک معاہدے کی رو سے) حلیف بن چکے تھے۔ مدینہ میں انصار اور مہاجرین یک جان دو قالب ہو چکے تھے۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ اسلام قبول کر رہے تھے۔ اب مشرکین مکہ مسلمانوں پر پہلے کی طرح ظلم و ستم بھی نہیں کر سکتے تھے۔

خارجہ پالیسی و سفارت کاری	1. آپ ﷺ نے یثرب کے لوگوں سے معاہدہ کیا، جس میں یہود بھی شامل تھے۔ 2. اہل یثرب سے ہر طرح سے حفاظت کا وعدہ لینا۔ 3. مدینے کے ارد گرد قبائل سے دوستی کے معاہدے کرنا۔ 4. تبلیغ کے لیے ایک سازگار ماحول تیار کرنا۔ 5. آپ ﷺ کا مشرکین مکہ کے تجارتی قافلوں کا پیچھا کرنا اور ایک مسلمان ریاست کو قائم کرنا۔ 6. ہجرت مدینہ صرف ایک جغرافیائی تبدیلی کی علامت سے بڑھ کر دین کی حفاظت اور محفوظ زندگی کا اہتمام کرنا۔ 7. مہاجرین کے لیے ایک مستحکم مالی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔
نتائج	1. ایک طرح سے مشرکین مکہ کے ظلم وستم کا خاتمہ ہوا۔ 2. مسلمان امن سے رہنے لگے، معاشی سرگرمیوں میں تیزی آئی۔ 3. مدینے کے ارد گرد قبائل سے دوستی ہوئی جس سے تبلیغ کے کام میں آسانی پیدا ہوئی۔ 4. تعلیم و تربیت کا نظام قائم ہوا۔ 5. مسجد نبوی کی تعمیر کی وجہ سے ایک مرکز میسر آیا۔ 6. مشرکین مکہ کے تجارتی قافلے مسلمانوں کے حملوں کے خوف میں مبتلا ہوئے۔ 7. اوس و خزرج کے درمیان ایک طویل جنگ کا خاتمہ ہوا۔

ماہ وسال	دو ہجری سے پانچ ہجری تک جس دوران مشرکین مکہ نے تین حملے کیے
سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال	آپ ﷺ کی مدینہ کی طرف ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ مشرکین مکہ اس پر بے حد برہم ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف اپنی دشمنی کو تیز کر دیا۔ جو لوگ مکہ میں رہ گئے تھے وہ بھی ایک مشکل میں تھے۔ مدینہ میں قائم مسلم ریاست دن بدن مضبوط ہو رہی تھی۔ ہجرت، جزیرہ نما عرب میں اسلام کے پھیلاؤ کا باعث بنی۔ مشرکین مکہ کو اپنے تجارتی قافلوں کی سلامتی خطرے میں محسوس ہوئی۔ نخلہ کا واقعہ جب مشرکین مکہ کے کچھ تاجروں پر مسلمانوں نے حملہ کیا تھا، کے بعد قریش کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ایسا واقعہ دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔ بدر میں ایک طرف تجارتی قافلہ اور دوسری طرف مشرکین مکہ کا لشکر۔ بدر میں جنگ ہوئی جس میں مشرکین مکہ کا بے حد نقصان ہوا، جنگ احد اس کا بدلہ لینے کے لیے ہوئی اور جنگ خندق مسلمانوں کے خاتمے کے لیے برپا کی گئی۔
خارجہ پالیسی و سفارت کاری	1. آپؐ نے دفاعی پالیسی اختیار کی، مختلف قبائل سے مذاکرات اور معاہدوں کے ذریعے اپنی

	سیاسی پوزیشن کو بے حد مضبوط کیا۔ البتہ جب جنگ آن پڑی تو جنگ سے منہ موڑنے کے بجائے جنگ کرنے کو ترجیح دی۔ 2. جنگ بدر سے پہلے آپ ﷺ نے قریش مکہ کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے کا کام شروع کیا جس سے مشرکین مکہ پر نفسیاتی دباؤ بھی بڑھنا شروع ہو گیا۔ 3. جنگی قیدیوں سے ایک بہترین سلوک سفارت کاری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ 4. ایک بہترین جنگی حکمت عملی کو ترتیب دیا۔ 5. افرادی، فوجی اور معاشی قوت میں اضافے پر توجہ 6. صحابہ اکرام کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ
نتائج	1. جنگی محاذ پر مشرکین کو شکست 2. آپ ﷺ کی قیادت میں ریاست مزید مضبوط ہوئی۔ 3. جزیرۃ العرب میں ایک نئی قوت بن کر ابھرے 4. ہزاروں کی تعداد میں جان نثار ساتھیوں میں اضافہ 5. شوق جہاد کے جذبے کی وجہ سے جنگی میدان میں کامیابیاں 6. مشرکین مکہ کی سیاسی ساکھ، معاشی حیثیت اور

	فوجی قوت کا خاتمہ۔
ماہ وسال	**پانچ ہجری سے چھ ہجری (صلح حدیبیہ) تک**
سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال	تینوں بڑی جنگوں میں مشرکین مکہ اپنی شکست کی وجہ سے سخت صدمے اور مایوسی میں مبتلا تھے۔ جنگ خندق میں نقصان غیر متوقع تھا، خاص طور پر قریش کی عددی برتری اور دوسرے قبائل کے ساتھ ان کے اتحاد کے پیش نظر۔ وہ ہار ماننے کو تیار نہ تھے۔ یہودی بھی ان کے ساتھ تھے۔ مسلمانوں کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ بہت سے قبائل آپ ﷺ کے ساتھ مل گئے تھے۔ جزیرۃ العرب میں قائم مدینہ کی ریاست کی برکات ہر طرف پھیل رہی تھیں۔ جزیرۃ العرب میں مشرکین مکہ کو کمزوری کی علامت کے طور پر دیکھا جا رہا تھا مگر وہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی میں اضافہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ وہ اب مسلمانوں کو ایک بڑھتے ہوئے خطرے کے طور پر دیکھتے تھے۔ غزوہ خندق کے بعد مشرکین مکہ کے آپس میں اختلافات بڑھنے لگے۔ وہاں قیادت کا فقدان تھا۔ سب اپنی اپنی مرضی کر رہے تھے۔ مشرکین مکہ کی طاقت کا حتمی زوال نظر آ رہا تھا۔ جزیرہ نما عرب میں

	مسلمانوں کے عروج کا دور شروع ہو گیا تھا۔
خارجہ پالیسی وسفارت کاری	1. آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب مشرکین مکہ، مدینہ منورہ پر حملہ آور نہیں ہوں گے، اب ہم ان پر حملہ کریں گے۔ 2. آپؐ نے عمرے کی نیت سے مکہ کا سفر کیا۔ اس دوران جنگی ہتھیار بھی نہیں لیے۔ ایک بڑی تعداد میں صحابہ کو ساتھ لیا۔ 3. اب دفاعی پالیسی کی بجائے آگے بڑھ کر مشرکین مکہ کا سامنا کرنے کی پالیسی اپنائی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حملہ کرنے کی پالیسی سے فی الحال گریز کیا۔ 4. آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ثابت کیا کہ باوجود اس بات کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قافلے کے پاس جنگی ہتھیار نہیں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر بھی مکہ پہنچ کر ہی دم لیا۔ یہ ایک واضح پیغام تھا کہ اب ہم کمزور نہیں ہیں۔ 5. عمرے کے لیے جانا جزیرۃ العرب میں ایک عام سی بات تھی۔ کوئی اس سے روک نہیں سکتا تھا۔ مکہ حرم تھا۔ اس میں جنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان احسن اقدامات کی وجہ سے مشرکین مکہ کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

	6. آس پاس کے قبائل کے ساتھ اتحاد کو مضبوط بنانے پر توجہ دی۔ 7. بنو قریظہ جس نے غزوہ خندق کے موقعے پر دھوکہ دیا تھا کو، مقدمہ چلا کر اس غداری کا ازالہ کیا جس کے نتیجے میں قبیلے کے لیے سنگین نتائج برآمد ہوئے۔ اس طرح آپ ﷺ نے یہودیوں کی طرف سے ممکنہ خطرے کو ختم کیا۔
نتائج	1. مشرکین مکہ نے آپ کو عمرہ کرنے سے روک دیا جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہوتی ہے جسے فتح مبین کا نام دیا گیا۔ 2. دس سال کے لیے جنگ بندی، آپ ﷺ کی دعوت کے لیے بے حد ضروری تھی۔ ایک طرح کا جنگی ماحول ختم ہو گیا تھا۔

ماہ و سال	چھ ہجری سے آٹھ ہجری تک: (صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک)
سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال	صلح حدیبیہ سے مکہ اور مدینہ دونوں میں ایک قابل ذکر سیاسی اور سماجی تبدیلی رونما ہوئی۔ مشرکین مکہ دب کر رہنے لگے جبکہ مسلمان آزادی سے جزیرۃ العرب میں اور اس کے باہر تک آنے جانے لگے۔ مسلمانوں کو قریش کی طرف سے فوجی تصادم کے فوری خطرے کے ٹل جانے سے مدینہ میں ان کی طاقت میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ تبلیغ کی آزادی کی وجہ سے مختلف قبائل نے اسلام قبول کیا۔ مشرکین مکہ کے کچھ رہنماؤں نے اسے ذلت آمیز سمجھا جبکہ کچھ نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دل سے تسلیم کرنا شروع کر دیا اور امن کے ممکنہ فوائد پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ جزیرۃ العرب میں امن قائم ہونے کی وجہ سے مکہ اور مدینہ کے لوگ کاروباری سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ ایک مدت سے جنگوں کی وجہ سے ہونے والے مالی نقصانات کا تدارک ہونا شروع ہو گیا۔ اب مشرکین مکہ کے دل میں امن کی خواہش ابھرنے لگی۔ لیکن کچھ لوگ ابھی بھی تھے جو انتقام

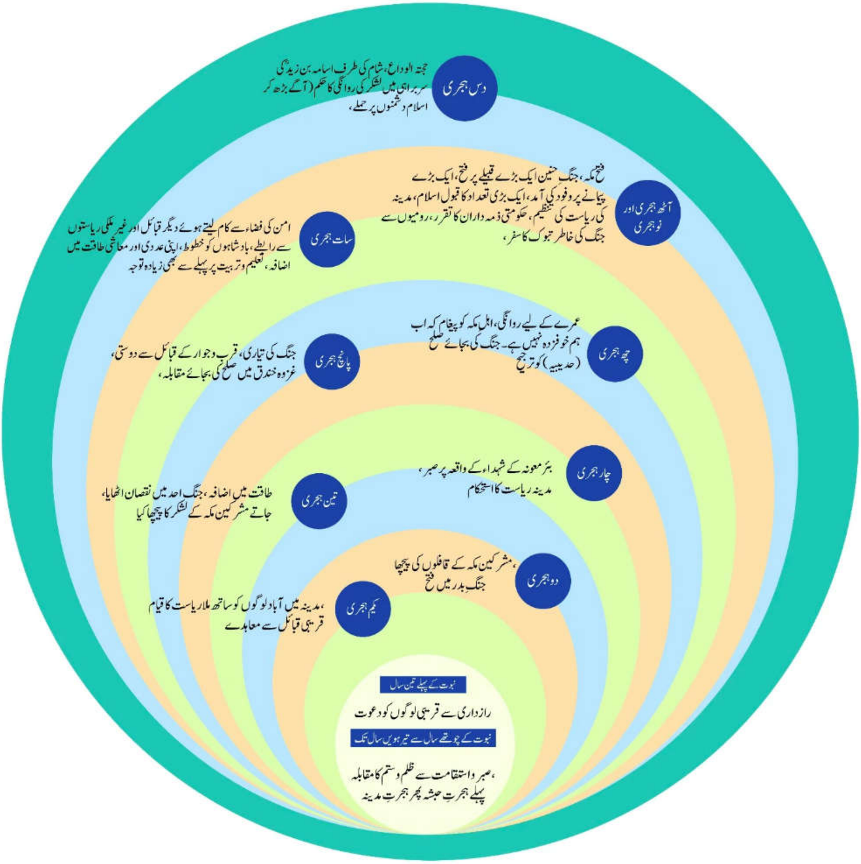
	لینا چاہتے تھے۔ یہودی اپنی طاقت کھو بیٹھے تھے۔
خارجہ پالیسی و سفارت کاری	1. آپ ﷺ نے امن کو غنیمت جانا اور بیرونی دنیا سے رابطے شروع کیے اور ایک بڑی تعداد میں غیر ملکی سربراہوں کو خطوط لکھے۔ 2. آپ ﷺ نے ایک بڑی تعداد میں تبلیغ کے لیے وفود بھیجنا شروع کر دیے۔ 3. صلح حدیبیہ کی شرائط پر مکمل طور سے عمل کیا گیا۔ 4. عددی، فوجی اور معاشی طاقت میں اضافے پر توجہ دی گئی۔ 5. مشرکین مکہ کی سر گرمیوں پر نظر رکھی گئی۔ 6. جزیرۃ العرب میں رہنے والے دیگر قبائل سے راہ و رسم بڑھائے گئے۔ 7. یہودیوں سے خطرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی خاطر خیبر پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی گئی۔
نتائج	1. مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ ہوا، ایک بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ 2. جزیرۃ العرب سے باہر اور قریبی ریاستوں تک آپ ؐ کا پیغام پہنچا۔ اس طرح جزیرۃ العرب

	سے باہر بھی اسلام کی دعوت پہنچی۔ 3. ریاست مدینہ مستحکم ہوئی اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کا عمل تیز ہوا۔ 4. مشرکین مکہ کی مالی، معاشرتی اور سیاسی ساکھ ختم ہو کر رہ گئی۔ 5. مشرکین مکہ کی صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی پر مشرکین مکہ پر حملہ کیا اور مکہ معظمہ کو فتح کر لیا۔ 6. خیبر کی فتح سے مالی آسودگی بھی ملی اور یہود کا خطرہ بھی ختم ہو گیا جس سے مشرکین مکہ کی طاقت میں بھی بے حد کمی واقع ہوئی۔

ماہ وسال	آٹھ ہجری سے دس ہجری تک (فتح مکہ سے حجتہ الوداع تک)
سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال	فتح مکہ کے بعد مشرکین مکہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ ﷺ کی قیادت میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ جزیرۃ العرب کے بیشتر علاقے آپ ﷺ کے کنٹرول میں تھے۔ جزیرۃ العرب میں بسنے والے قبائل میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ شام اور یمن کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدے ہو چکے تھے۔ ہر طرف ایک امن کی

	فضا تھی۔ فتح مکہ کے بعد طائف بھی فتح ہو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ ایک نظریے کی بنیاد پر جزیرۃ العرب میں ایک مضبوط حکومت قائم ہو چکی تھی۔ نظم و نسق برقرار رکھنے اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے رہنما اور گورنر مقرر کیے گئے۔ اب مدینہ اور مکہ طاقت کے مرکز تھے۔ ایک مربوط سیاسی ڈھانچہ تشکیل پا چکا تھا۔ تجارتی راستوں کی بحالی سے خطے میں معاشی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مکہ، ایک بڑے تجارتی مرکز کے طور پر پھر سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔ حج کی خاطر ایک بڑی تعداد میں لوگ مکہ معظمہ آرہے تھے۔ فتح کے بعد ہونے والے واقعات نے پورے جزیرہ نما عرب میں اور اس سے آگے اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی منزلیں طے کیں۔ ایک بار پھر آپؐ تبوک کے مقام پر رومیوں کے خلاف جنگ کے لیے گئے۔
خارجہ پالیسی وسفارت کاری	1. آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنو ثقیف کے خلاف جنگ کی، رومیوں کے خلاف تبوک تک گئے۔ 2. وفود کا استقبال اور غیر مسلموں سے معاہدے کیے گئے۔ 3. تزویراتی اتحاد بنے، تنازعات کے حل اور اسلام کی ترویج پر توجہ دی گئی۔

	4. فتح کے دوران حاصل ہونے والے فوائد کو مستحکم کیا گیا۔ 5. ایک مستحکم اور خوشحال معاشرے کی تشکیل کے لیے جدوجہد کو تیز کیا گیا۔ 6. اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ کی خاطر اقدامات کیے گئے۔ 7. آپ ﷺ کا انصاف، رحم، اور انسانی وقار کے احترام کے اصولوں پر زور دینا، جو آج بھی اسلامی تعلیمات کا اہم حصہ ہیں۔
نتائج	جزیرۃ العرب میں ایک مضبوط اور متکلم اسلامی ریاست قائم ہوئی جو آج تک ایک مثال ہے۔


دس ہجری
حجۃ الوداع، شام کی طرف اسامہ بن زیدؓ کی
سربراہی میں لشکر کی روانگی کا حکم (آگے بڑھ کر
اسلام دشمنوں پر حملے،
آٹھ ہجری اور نو ہجری
فتح مکہ، جنگِ حنین ایک بڑے قبیلے پر فتح، ایک بڑے
پیمانے پر وفود کی آمد، ایک بڑی تعداد کا قبول اسلام، مدینہ
کی ریاست کی تنظیم، حکومتی ذمہ داران کا تقرر، رومیوں سے
جنگ کی خاطر تبوک کا سفر،
سات ہجری
امن کی فضاء سے کام لیتے ہوئے دیگر قبائل اور غیر ملکی ریاستوں
سے رابطے، بادشاہوں کو خطوط، اپنی عددی اور معاشی طاقت میں
اضافہ، تعلیم و تربیت پر پہلے سے بھی زیادہ توجہ
چھ ہجری
عمرے کے لیے روانگی، اہل مکہ کو پیغام کہ اب
ہم خوفزدہ نہیں ہے۔ جنگ کی بجائے صلح
(حدیبیہ) کو ترجیح
پانچ ہجری
جنگ کی تیاری، قرب و جوار کے قبائل سے دوستی،
غزوہ خندق میں صلح کی بجائے مقابلہ،
چار ہجری
بئر معونہ کے شہداء کے واقعہ پر صبر،
مدینہ ریاست کا استحکام
تین ہجری
طاقت میں اضافہ، جنگ احد میں نقصان اٹھایا،
جاتے مشرکین مکہ کے لشکر کا پیچھا کیا
دو ہجری
، مشرکین مکہ کے قافلوں کی پیچھا
جنگِ بدر میں فتح
یکم ہجری
، مدینہ میں آباد لوگوں کو ساتھ ملا ریاست کا قیام
قریبی قبائل سے معاہدے
نبوت کے پہلے تین سال
رازداری سے قریبی لوگوں کو دعوت
نبوت کے چوتھے سال سے تیرہویں سال تک
، صبر واستقامت سے ظلم وستم کا مقابلہ
پہلے ہجرتِ حبشہ پھر ہجرتِ مدینہ

تمت بالخیر

یہ کتاب مکمل ہوئی، یہ لمحہ ہے خاص
دل کی خوشیوں کا ہے احساس
پایان کتاب، گامی بہ سوی آسمان،
با پرچم امید و عشق، می سازم آیندہ را.
(کتاب کا اختتام، در حقیقت ترقی کی طرف ایک اور قدم ہے
میں امید اور محبت کے جذبے کے ساتھ مستقبل کی تعمیر کرتا ہوں)

ربِ کائنات کا بے حد شکر و امتنان ہے کہ اس نے مجھے اس مقالے کی تحریر کی توفیق عطا فرمائی۔ آج کا دن میرے لیے انتہائی خوشی اور شکر گزاری کا لمحہ ہے، اور میں جتنا بھی اظہارِ تشکر کروں، وہ ناکافی ہو گا۔

اس مقالے کی تصنیف کا بنیادی محرک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درج ذیل حدیثِ مبارکہ ہے، جو میرے قلب و ذہن میں گہرائی سے راسخ ہو چکی ہے۔ اگرچہ میں ان خوش نصیب افراد میں شامل نہیں ہوں جنھیں براہِ راست آپ ﷺ کی صحبت میں یہ حدیث سننے کا شرف حاصل ہوا، تاہم، الحمدللہ، میں ان سعادت مند افراد میں ضرور شامل ہوں جنھوں نے اکابرینِ امت کی مرتب کردہ کتبِ حدیث کا مطالعہ کیا ہے۔ یہی مستند کتب ہمیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے روشن واقعات اور بابرکت ارشادات تک رسائی فراہم کرتی ہیں۔ انھی علمی ذخائر کے ذریعے ہم آج آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے آگاہ ہو رہے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں۔

اس مقالے کی تحریر اسی علمی اور فکری تسلسل کا ایک حصہ ہے، جس کا مقصد نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور اس سے مستفاد ہونے والے اساسی اصولوں کو علمی و تحقیقی انداز میں پیش کرنا ہے۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

(مرفوع) حدثنا محمود بن غيلان، حدثنا ابو داود، انبانا شعبة، عن سماك بن حرب، قال: سمعت عبد الرحمن بن عبد الله بن مسعود يحدث، عن ابيه، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: " نضر الله امرا سمع منا شيئا فبلغه كما سمع فرب مبلغ اوعى من سامع " , قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيح، وقد رواه عبد الملك بن عمير، عن عبد الرحمن بن عبد الله. سنن ترمذی[65] (حدیث نمبر ۲۶۵۷)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ اس شخص کو تروتازہ (اور خوش) رکھے جس نے مجھ سے کوئی بات سنی پھر اس نے اسے جیسا کچھ مجھ سے سنا تھا ہو بہو دوسروں تک پہنچا دیا کیونکہ بہت سے لوگ جنھیں بات (حدیث) پہنچائی جائے پہنچانے والے سے کہیں زیادہ بات کو توجہ سے سننے اور محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔

اس مقالے کا ہر لفظ، ہر بات، اور ہر حوالہ نبی کریم ﷺ سے محبت کا نتیجہ ہے اور آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع کا مظہر ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان صفحات میں

---

65 https://islamicurdubooks.com/hadith/mukarrat-.php?hadith_number=2657&bookid=6

بیان کردہ فکر، سوچ، اور مطالعہ آپ کے احساسات و تاثرات کو جلا بخشے گا اور ہم سب کے لیے مفید ثابت ہو گا۔

اس سفر میں میرے ساتھ کئی لوگوں نے تعاون کیا، اور میں ان سب کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ اس مقالے کے آخری صفحات تک پہنچے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ کسی ایک سفر کا اختتام کسی دوسرے سفر کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ میں اپنا یہ سفر دریافت، ترقی، اور بہتری کی طرف جاری رکھوں گا، ان شاء اللہ۔

اس مقالے کو لکھتے ہوئے ہمیشہ یہ خوف رہا کہ کہیں کوئی ایسا لفظ یا بات آپ ﷺ سے منسوب نہ ہو جائے جو حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ اگر آپ کو ایسا محسوس ہو کہ کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے تو براہ کرم مجھے ضرور مطلع کریں۔ یہ کتاب اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے کہ ہم آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے ایک اہم پہلو کو بہتر انداز میں جان سکیں، کیونکہ اس میں ہم سب کے لیے بے حد رہنمائی موجود ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے ساتھ، میں ان تمام لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ اس علمی سفر کا حصہ رہے، خاص طور پر ان دوستوں کا جو تجسس اور علم کے حصول کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں اور جنھوں نے مجھے یہ کتاب لکھنے کی ترغیب دی۔ میرے بہت سے عزیز دوستوں اور اہلِ خانہ نے میرے اس سفر میں غیر متزلزل حمایت جاری رکھی، جس پر میں ان سب کے لیے دعا گو ہوں اور ان کا شکر گزار ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ نے اس مقالے سے جو کچھ سیکھا ہے، اسے اپنی زندگی میں عملی طور پر اپنانے کی کوشش کریں گے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں بھی میرا ساتھ دیں گے، کیونکہ یہی اس مقالے کا اصل مقصد ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس مقالے نے آپ کے تخیل کو ایک نئی جہت دی ہو گی، آپ کی امنگوں کو جِلا بخشی ہو گی، اور مزید جستجو کی خواہش کو مہمیز دی ہو گی۔ میری دعا ہے کہ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس مقالے سے حاصل کردہ علم کے ذریعے آپ کو یقین، مقصد، اور استقامت کے ساتھ اپنے راستے پر آگے بڑھنے کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ کتاب محض خیالات اور تاثرات کا مجموعہ نہیں، بلکہ انتہائی مستند اور معتبر ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کا ایک جامع مرقع ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو ہر باب سے کچھ نیا سیکھنے کو ضرور ملا ہوگا۔ اس مقالے کو پڑھنے کے دوران آپ کے قیمتی وقت اور توجہ کے لیے میں بے حد ممنون ہوں۔

نبی کریم ﷺ کی خارجہ پالیسی اور سفارت کاری کے اس سفر میں آپ بھی میرے ساتھ شریک رہے، اور یہی علم کا اصل جوہر ہے کہ اسے بانٹا جائے۔ جو کچھ جانا ہے، اسے آگے پہنچائیں تاکہ وہ لوگ بھی مستفید ہو سکیں جو ابھی لاعلم ہیں، جیسے ہمارے بڑوں نے کیا اور ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم علم حاصل کر سکیں۔

جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:

دگر بدشتِ عرب خیمہ زن کہ بزمِ عجم
مے گذشتہ و جام شکستنی دارد

ایک دفعہ پھر عرب کے صحرا میں خیمہ لگا کہ عجم کی بزم وہ شراب ہے
جو فرسودہ ہو چکی اور اس کے جام توڑنے کے قابل ہیں۔

ای خدای دانا، چراغی در شب تار،
بہ راہ‌های کج، راستای روشنی ببخش،
ہر گام کہ بر می‌دارم، با حکمت باشد،
تا در دل‌های دیگران، عشق را بکاشم

اے سب جاننے والے خدا، اندھیری رات میں رہنما
کج راہوں کو درست سمت عطا کر،
میرا ہر قدم دانشمندانہ ہو۔

تاآنکہ دوسروں کے دلوں میں محبت سینچو[66]۔
اس مقالے کے اختتام پر بابا فرید کے دو شعر؛

پچھلی رات نہ جاگیو

جیوندڑو مویوں

جے تیں رب وِساریا

تَیں رب نہ وسریوں

حوالہ: کلام بابا فرید؛ڈاکٹر نذیر احمد؛ پیکیجز لمیٹڈ

(اے فرید! تو رات کے پچھلے پہر نہ جاگا تو گویا جیتے جی مر گیا۔ لیکن تو نے اگر خدا کو بھلا دیا تو بھی خدا نے تجھے نہیں بھلایا۔

میرے والدِ محترم اکثر بابا فرید کے یہ شعر پڑھا کرتے تھے، میں بھی اس مقالے کا اختتام اسی شعر پر کرتا ہوں؛

اٹھ فریدا ستیا جھاڑو دے مسیت
توں ستا رب جاگدا، تیری ڈاڈھے نال پریت
اج کہ کل کہ چونھ دیہیں ، ملک اساڈی ہیر
کیں جتا کیں ہاریو، سودا ایہی ویر
اچا کر سدا فریدا، رب دلاں دیاں جاندا
جے تدھ وچ کلب، سو مجھاہوں دور کر

مفہوم

فرید اٹھو جاگو اور اپنے من کو صاف کرو، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر کرو، تو غافل ہے

66 شاعر کا نام معلوم نہیں۔

جبکہ تیرا مالک جاگ رہا ہے اور تمہاری دوستی دنیا کے مالک سے ہے جو سب سے طاقتور اور جبار بھی ہے اور قہار بھی ہے۔

جلدی ہمارا احساب ہونے والا ہے نامہ اعمال ملنے والا ہے، کیا برا ہے کیا اچھا ہے، سب پتا چل جائے گا، ایک ہی بار موقع ملا ہے دوبارہ اس کا موقع نہیں ملے گا، نیک اعمال کرلو تمہیں دوبارہ موقع نہیں ملے گا تو دنیا میں صرف ایک ہی بار آیا ہے۔

تو اپنے رب کو اونچا نہ پکار، تیرا رب تو دلوں کے راز بھی جانتا ہے، تیرے دل میں جو بھی ہے جانتا ہے، اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں، جو تیرے دل میں میل ہے، اس کا اسے پتا ہے، اس لیے اپنا دل صاف رکھ [67]) بابافریدؒ

***

[67] بابافرید اور والد محترم چودھری محمد یوسف مانگٹ کی بات پر عمل کرتے ہوئے میں نے اس مقالے کا بیشتر حصہ رات کے پچھلے پہروں میں لکھا۔

تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال نے کئی خاندانوں کو ان کے آبائی علاقوں سے ہجرت پر مجبور کر دیا۔ انھی بدقسمت لوگوں میں ایک میرا خاندان بھی شامل تھا جو موجودہ بھارت کی ریاست پٹیالہ کے شہر سرھند سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ سکونت پذیر ہوا۔ میری پیدائش ۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوئی۔ میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد سے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ٹیکسٹائل کے شعبہ کا انتخاب کیا اور ۱۹۸۱ء میں نیشنل کالج سے ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی ڈگری مکمل کی۔ اپنی مہارت کو مزید تقویت دینے کے لیے میں نے مختلف ملازمتوں سے تجربہ حاصل کیا اور ۱۹۹۲ء کے بعد سے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ مسلسل سیکھنے کے اصول پر کار فرما رہتے ہوئے میں نے اپنی انتہائی مصروف اوقات میں سے وقت نکال کر ۲۰۰۱ء میں یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی سے ایم بی اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ علم کا اشتیاق بڑھا تو ۲۰۰۸ء میں یونیورسٹی آف مانچسٹر سے ایم فل اور ۲۰۱۲ء میں چیک ریپبلک کی معروف یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی کر لی۔ کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں کئی فلاحی اداروں (غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان اور تعاون فاؤنڈیشن) سے بھی منسلک رہا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب کا مواد کئی تاریخی حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ انھی حالات و واقعات کو بیان کیا جائے جن پر اجماع کثیر ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی تاریخ یا واقعے میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہر حال میں اس کی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔ اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر آمدنی اسلامک پبلی کیشنز کے ذریعے بھلائی کے کاموں پر خرچ کی جائے گی۔ ان شاءاللہ (مصنف)

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ 54790 042-35252501-02
SMS ur Address: 0322-4673731 0321-4942120
for online shopping visit www.islamicpublications.pk islamicpak@gmail.com / @yahoo.com
U02408